دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۱۵ ویں جلد

جنوری ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۵ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن   عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۵

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جنوری ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۵ء

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	مولانا مجاہد حسین صاحب فاروقی گوپامئوی سابق لکچرر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۲۴
۲	جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہ جہاں پور	۳۴۹-۴۶۹
۳	مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۵
۴	جناب مولوی بہاء الدین صاحب ایم اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۳۹
۵	سید صباح الدین عبدالرحمن	۸۵، ۲۰۲، ۱۶۲-۱۶۵، ۲۳۳-۲۴۲، ۲۴۵، ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۹۴
۶	ضیاء الدین اصلاحی	۲۳، ۳۱، ۷، ۱۰۹، ۱۵۷، ۱۸۹، ۲۱۶، ۲۲۰، ۲۴۷، ۳۹۷، ۴۷۷
۷	جناب عبدالرشید صاحب شعبۂ عربی پٹنہ کالج پٹنہ	۳۶۹
۸	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	۳۵۰، ۴۳۳
۹	جناب مبشر علی صدیقی ایم اے بدایوں	۲۱۳
۱۰	ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۶۲
۱۱	محمد اقبال ندوی ناظر کتب خانہ دارالمصنفین	۳۰۵

شمار	مضمون نگار	
۱۲	حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب	۳۰۳
۱۳	محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی	۲۸۷
۱۴	ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری	۴۸
۱۵	جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیواسدن کالج برہان پور	۲۰۲، ۲۹۳
۱۶	جناب نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی	۲۶۹
	شعراء	
۱	جناب احمد مکرم عارف بنارسی	۱۵۵
۲	جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری،	۳۱۵

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۳	جناب حاذق ضیائی سراجی	۱۵۳
۴	جناب رحمت الٰہی صاحب برق صدیقی اعظمی،	۱۵۶
۵	جناب ساحل بنبی،	۱۵۴
۶	جناب پروفیسر سید حسن صاحب سرمد پٹنہ	۳۱۴
۷	جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری	۱۵۶
۸	جناب قمر سنبھلی	۱۵۳
۹	جناب پروفیسر نکہت صاحب شاہجہان پوری	۱۵۲
۱۰	جناب کلیم حنفی	۱۵۵

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۱۵

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جنوری ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۵ء

	شذرات	۲-۸۲، ۲۴۲-۳۲۲، ۴۰۲	۶	جامع مسجد برہانپور کے کتبات	۲۰۲، ۲۹۳
	آہ! شاہ صاحب		۷	حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۴
	مضامین		۸	دیارِ حبیب کا دوسرا علمی دور	۵
۱	اردو ادب کے تنقیدی اصول میں تنظیم و انضباط	۲۴۹، ۴۰۴	۹	ڈاکٹر سید محمود کا مقدمۂ دیوان غالب نظامی اڈیشن	۲۱۳
۲	اسلام ایک خیالی خاکہ ہے یا عملی تشکیل	۳۵۰	۱۰	شرح السنۃ امام بغوی	۲۲-۱۰۹، ۱۸۹
۳	العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب (ایک قدیم مخطوطہ)	۳۶۹	۱۱	شعوبی تحریک اور اس کا انجام	۴۶۲
۴	تعزیتی نامہ اور خطوط	۵۶	۱۲	عرفی شیرازی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ	۴۰
۵	تعزیتی تار و نیز اور خطوط	۱۳۷	۱۳	قبرص (سائپرس)	۳۰۵

شمار	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
۱۴	قرآن حکیم اور ذوق کی تربیت	۲۴۹	**ادبیات**	
۱۵	مکتوبات مدینہ منورہ	۳۰۳	آہ! مولانا شاہ معین الدین ندوی	۵۴
۱۶	مولانا حیدر حسن خان ٹونکی	۳۴۳		
۱۷	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	۸۵، ۱۶۵، ۲۲۵، ۲۴۵، ۳۰۵	تاریخ وفات	۱۵۴
			غزل	۳۱۵
	وفیات		قطعات تاریخ وفات	۱۵۷
۱	جناب حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم	۲۲۲	قطعہ تاریخ	۱۵۷
			ماتم شاہ صاحب	۱۵۵
۲	جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی	۲۳۰	مرثیہ شاہ صاحب	۱۵۴
			نالۂ غم	۱۵۶
	تلخیص تبصرہ		نذرانۂ عقیدت	۱۵۵
	گذشتہ عرب اسرائیل جنگ اور نہر سویز	۳۰۷	یاد اقبال	۳۱۴
	باب التقریظ والانتقاد			
	تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم انگریزی (مترجمہ جناب محی الدین احمد ندوی)	۳۹۴	مطبوعات جدیدہ	۷۳، ۱۵۷ / ۲۱۶-۲۲۶ / ۳۹۶، ۴۷۷

....صفحہ....

[illegible]

جنوری سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

قیمت بارہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

[illegible]

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اول

بزمِ تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرا، و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علما و فضلا، و شعرا، کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ

مصنفہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

جلد ۱۱۵ عدد ۱

ماہ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۵ء

مضامین

شذرات آہ شاہ صاحب!	سید صباح الدین عبدالرحمن	۲ - ۴

مقالات

دیار پورب کا دوسرا علمی دور	مولانا قاضی اطہر مبارک پوری (اڈیٹر البلاغ)	۵ - ۲۱
شرح السنۃ امام بغوی	ضیاء الدین اصلاحی	۲۲ - ۳۸
عرفی شیرازی کا ایک مطبوعہ قصیدہ	ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری (لکھنؤ)	۴۰ - ۵۵
تعزیتی تار اور خطوط		۵۶ - ۶۲
مطبوعات جدیدہ	(ض)	۶۳ - ۶۴

معارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آہ شاہ صاحب!

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین اور اڈیٹر معارف جو شاہ صاحب کے نام سے یہاں یاد کئے جاتے اب اپنے پاک دل، پاک ذات اور پاک صفات کے ساتھ آغوشِ رحمت الٰہی میں ہیں ——— ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کے روز اپنے تمام روزمرہ کے معمولات میں مشغول رہے، دس بجے دن کو بال بنوایا، غسل کیا، کھانا کھایا، جمعہ کی نماز پڑھی، ڈھائی بجے تک عاجز راقم سے ملاقات رہی، اخبار پڑھتے پڑھتے سو گئے، گہری نیند سوئے، چار بجے اٹھے، اپنے ایک دیرینہ ہم جلیس مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے، عصر کی نماز کے لئے وضو کا پانی منگوایا، کرسی سے اٹھ کر وضو کے لئے اٹھنا چاہتے تھے کہ زمین پر گر گئے، خیال ہوا کہ بیہوش ہو گئے ہیں، ان کے دوست ڈاکٹر عبد الحفیظ انصاری بلائے گئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، وہ نہ بیمار پڑے نہ سکرات کی تکلیف ہوئی، نہ کسی کو کچھ خدمت کرنے کا موقع دیا، ایسا معلوم ہوا کہ یہیں سے یکایک اٹھا لئے گئے اور دار المصنفین کے در و دیوار کو الوداع نہیں، بلکہ روتا چھوڑ گئے، ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت ان کے وطن ردولی دار المصنفین کے کارکنوں اور ان کے قدر دانوں کے جلو میں لیجائی گئی، جہاں وہ چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک کئے گئے اللّٰھم اغفرلہ

والرحمۃ وادخلہ الجنۃ ـــــــ

ان کی رحلت دارالمصنفین کے لئے حقیقی معنوں میں جانکاہ حادثہ ہے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو چھوڑا تو مولانا مسعود علی ندوی کا انتظامی سلیقہ، مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی شہرت اور اس ادارہ سے خود جناب شاہ صاحب کی شیفتگی برابر کارہی، عاجز راقم کو بھی اس کی خدمت میں گیارہ سال گذر چکے تھے، استاذی المحترم جناب سید صاحب خوش تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی زندگی کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا، ان کے بعد اس علمی تاج محل پر جو دھوپ چاند کی چاندنی تو نہیں چھٹکی، مگر یہ برقرار رہا، ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی داغ مفارقت دے گئے، تو ایک بڑا خلا پیدا ہوا جو پر تو نہ ہو سکا، لیکن دارالمصنفین کی علمی سرگرمیاں بدستور باقی رہیں، ۱۹۵۲ء میں مولانا مسعود علی ندوی کی صحت خراب ہوئی تو ۱۹۶۰ء تک ان کی علالت کا سلسلہ جاری رہا، اپنے انتظامی امور کا بار اس راقم کے دوش ناتواں پر ڈالا، وہ بھی خوش رہے کہ انھوں نے بھی اپنی زندگی کے بعد کا نقشہ دارالمصنفین دیکھ لیا، مگر شاہ صاحب کی وفات سے دارالمصنفین ایک زبردست آزمائش میں مبتلا ہے، دارالمصنفین کی دو نسلوں کی جلا کے ترشے ہوئے ہیرے بن گئے تھے، اور اس کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے تھے، اب یہ نگینہ نکل گیا ہے، تو انگوٹھی بے رونق ہو رہی ہے، ان کی جگہ کو پر کرنے والا اب کوئی نہیں، دارالمصنفین اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے، موت العالم موت العالم،

وہ پچاس سال پہلے ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہو کر دارالمصنفین آئے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو قلم پکڑنا سکھایا، پھر تو مضمون نگار بنے، شعر و ادب کے ادا شناس

بھی، صحابہ کرامؓ کے سوانح نگار بھی، مورخِ اسلام بھی، دینِ رحمت کے شارح بھی، معارف کے اڈیٹر بھی، اور جو کرسی علامہ شبلیؒ نے حضرت سید صاحب کو عطا کی تھی اس پر ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے بٹھائے گئے تو شبلی و سلیمان کی علمی روح و روایت کو برقرار رکھنے میں اپنی ساری علمی و ادبی صلاحیتیں صرف کیں،

حضرت سید صاحب ان کے ادب و انشا کے معترف رہے، انھوں نے دارالمصنفین کے سلسلۂ صحابہ کی تین جلدیں لکھیں جو اچھی زبان کی وجہ سے بہت پڑھی گئیں، وہ اردو شعر و ادب کے کسی پہلو پر کچھ لکھ دیتے تو یہ اس صنف کا قابلِ قدر اضافہ سمجھا جاتا، ان کے مضامین "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندستان کے طبعی و جغرافی اثرات" اور "اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی حیثیت" سے بڑی ادبی و تحقیقی رہنمائی ہوئی، جگر، اصغر، حسرت، اور اقبال پر جو ناقدانہ مضامین لکھے، وہ ادبی حلقے میں بہت پسند کئے گئے، ان کے ادبی مقالات کے مجموعہ نقوشِ ادب کو اردو کے تنقیدی ادب میں اہم جگہ حاصل رہے گی، تاریخ اسلام پہلے بھی بہت لکھی گئی، مگر ان کی چار جلدیں اپنے موثر اور دل نشین انداز کی وجہ سے اس برصغیر میں بہت مقبول ہوئیں یہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات میں سیرۃ النبیؐ کے بعد انہی کی مانگ بہت زیادہ ہے، اسلام اور عربی تمدن ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے، مگر محض ان کے اسلوب کی وجہ سے اصل سے کم نہیں، دینِ رحمت میں اسلام کی رواداری اور فراخدلی کو کچھ ایسے دلکش پیرایہ میں پیش کیا کہ اس کے ہندی ترجمے کی اجازت کئی جگہ سے مانگی گئی، آخر میں انھوں نے حیاتِ سلیمان کی تکمیل برسوں کی محنت کے بعد کی، اس کی اشاعت پر ہر طرف

سے داد و تحسین ملی اور حیات شبلی ہی کے پایہ کی تصنیف قرار دی گئی، معارف میں ان کے کچھ مضامین ابھی چند مہینے پہلے مسائل حاضرہ پر شائع ہوئے، جو اس قدر پسند کئے گئے کہ ان کے ترجمے عربی زبان میں بھی کئے گئے،

شبلی کا ایجاز، سلیمان کا وقار، پھر ان کی انفرادی سلاست، روانی، شگفتگی اور پختگی ان کے اسلوب کا امتیازی رنگ ہو گیا تھا، وہ اپنی تحریروں کی بے ساختگی میں عالمانہ رنگ اور عالمانہ رنگ میں وزن اور وزن میں نکھار پیدا کرتے رہے، اپنی تصنیف و تالیف میں دبستان شبلی کے انداز بیان اور مسلک کا پورا لحاظ رکھتے، اسی کی نگرانی رفقائے دارالمصنفین کی تحریروں پر بھی رکھتے، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم کو بھی ان کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی پر بڑا بھروسہ تھا، مولانا کی مشہور اور مقبول کتاب اقبال کامل کو جامع اور دلنشین بنانے میں ان کا بڑا حصہ رہا، میری تحریروں میں بڑی بے تکلفی سے ترمیم کر دیتے، جس کو غور سے پڑھ کر میں خوش ہو جاتا، ان کو اپنی ہر تحریر کو دکھانے میں لذت ملتی، اگر پسند کر لیتے تو اسی کو اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتا، پھر فکر نہ ہوتی، کہ کوئی اور کیا رائے رکھے گا،

معارف کے معیار کو برقرار رکھنے میں اپنی دوسری تصنیفی سرگرمیاں قربان کیں، وہ اس کے ہر مضمون کی نوک پلک کو شروع سے آخر تک درست کرتے، بعض اوقات پورے مضمون کو از سر نو لکھ دیتے، حک و اصلاح اور حشو و زوائد کو دور کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی، معارف میں ان کے شذرات شوق سے پڑھے جاتے، حضرت سید صاحب نے ان کو پڑھ کر داد دی، کہ اب س اور م میں کوئی فرق نہیں رہا، ملک کے اخبارات و رسائل میں

برابر نقل ہوتے رہتے، کبھی ان کے لکھنے میں ان کا لب ولہجہ تیز و تند ہو جاتا، مگر ان کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے تلخی پیدا نہیں ہونے پاتی، بلکہ ان کی سخت رائے مخلصانہ اور تعمیری سمجھی جاتی۔ اہم شذرات کے چھپنے سے پہلے مجھ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا، اس کے تیز لب و لہجہ سے اختلاف کرتا تو وہ اپنی شرافت اخلاق سے اس میں ترمیم کر دیتے، مگر خفا ہو کر کہتے کہ میری مصلحت اندیشی سے ان کا قلم رکتا ہے، اور کبھی ترمیم کرنے پر یہ کہہ کر راضی نہ ہوتے کہ بعض اوقات تیز اور بے لاگ تحریر بھی مفید پڑ جاتی ہے، اور ضرور مفید پڑتی رہی۔

آٹھویں صدی ہجری میں صابریہ چشتیہ سلسلہ میں شیخ احمد عبد الحقؒ بہت ہی برگزیدہ بزرگ گذرے ہیں، ردولی ضلع بارہ بنکی میں ان کا مزار اقدس اب بھی مرجع عوام و خواص ہے، شاہ صاحب ان ہی کے خاندان سے تھے شکل وجیہ، چہرہ باوقار، اور داڑھی منور پائی تھی، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علی گڈھ میں ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ میں مولانا سید سلیمان کو تو نہیں دیکھ رہا ہوں، وہ جس مجلس میں شریک ہوتے محبت و عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے، بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، مگر اپنی پاکیزگی میں خشکی نہیں آنے دی، طبیعت کی شگفتگی برابر باقی رکھی، جب ۲۵ سال کے رہے ہونگے، تو دوسری بیوی سے بھی دائمی جدائی ہوگئی، ۷۰ سال کی عمر پائی، مگر بقیہ زندگی تجرد میں گذاری، دار المصنفین ہی کو عروس بنا کر اس سے ہمکنار رہے، معاملات کی صفائی کا بڑا خیال رکھتے، کسی کا حق اپنے ذمہ باقی نہیں رہنے دیتے، نجی زندگی میں تکلیف اٹھا کر ضرورت مندوں کی مالی امداد کرتے رہتے، دار المصنفین کے ایک برآمدہ اور دو کمرے کی چھوٹی سی عمارت میں پوری زندگی بسر کر دی، کہتے کہ اس میں جو راحت ملتی ہے وہ اپنے گھر میں بھی محسوس نہیں

ہوتی، نماز باجماعت کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے، تہجد گذار بھی تھے، مناجات مقبول اور کلام پاک کی تلاوت روزانہ کرتے، موت سے سینہ سپر ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہے، حج کا شرف دوبار حاصل کیا، آخری بار گذشتہ سال جلالۃ الملک شاہ فیصل کی طرف سے زیارت خانۂ کعبہ کے لئے مدعو کئے گئے، مرکزی حکومت ہند نے ان کے علم و فضل کا اعتراف عربی میں سند اور خلعت عطا کر کے کیا، اس سلسلہ میں ان کو تین ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا، مگر تین سال سے زیادہ نہ پاسکے، ساری عمر دار المصنفین سے جو قلیل تنخواہ ملتی اسی پر قانع رہ کر بسر کی، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ ملیہ دہلی سے ان کو خاطر خواہ تنخواہ پر مدعو کیا گیا، لیکن دار المصنفین کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیا، سفر کرنے سے بہت گھبراتے، ملک کے مختلف حصوں سے صدارت اور بالخصوص مقالہ خوانی کی دعوت آتی رہی، مگر ان کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، آخر عمر میں مولانا زکریا سہارنپوری سے بیعت ہو گئے تھے، تو اوراد و وظائف میں بھی مشغول رہنے لگے تھے، گذشتہ نومبر میں ان کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوئے تھے، وہاں سے واپسی پر اپنے وطن رودولی میں انفلوائنزا میں مبتلا ہو گئے تھے، صحت یاب ہو کر دار المصنفین واپس آئے تو چھٹے روز اپنے قدر دانوں کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، موت ان کے پاس ضرور آئی مگر دبے پاؤں آئی، منہ چھپائے ہوئے آئی اور ان کے بربط ہستی کے سرود سے محض ہم آغوش ہونے آئی۔

راقم دار المصنفین ان کے یہاں آنے کے گیارہ سال بعد آیا، مگر ہم دونوں چالیس سال تک لازم ملزوم، ایک جان دو قالب بلکہ عرض و جوہر بن کر رہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ کون لازم ہے، کون ملزوم، کون جان ہے اور کون قالب، امیر خسرو کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے، جس میں انھوں نے من و تو اور جان تن کی تفریق مٹا کر من دیگرم تو دیگری کا

سوال ہی ختم کر دیا ہے، ہم دونوں دارالمصنفین کی زندگی میں اسی طرح رہے، انھوں نے اپنے کو میرے لئے اور میں نے اپنے کو ان کے لئے مٹایا، ان کے غصے پر مجھ کو پیار آتا اور میرے پیار پر ان کو غصہ آتا، ان کو کبھی زیادہ جھلاہٹ آجاتی تو تھوڑی دیر کے بعد ہی معذرت کرتے جس میں اظہار ندامت کے بجائے غیر معمولی محبت ہوتی، اسی کو میں اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتا رہا، وہ دارالمصنفین کے ناظم ضرور تھے، مگر نظامت کے سارے فرائض میرے ذمہ کر رکھا تھا، وہ خوش رہتے کہ میرے کام میں کوئی دخل نہیں دیتے، مگر میری خوشی اس کوشش میں رہتی کہ کوئی کام ان کے مزاج کے خلاف نہ ہو، ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور میری عملی سرگرمی وہ کوک دیدیتے تو میں گھڑی کے پرزوں کی طرح متحرک رہتا، وہ دارالمصنفین سے کچھ دنوں کے لئے باہر چلے جاتے تو مجھکو محسوس ہوتا کہ وہ میری ساری عملی قوت اپنے ساتھ سمیٹ کر لیتے گئے ہیں، وہ گھر جاتے تو میرے لئے بے قرار رہتے، ان کی چہیتی لڑکی ان سے کہتی کہ وہ اپنے ساتھ اپنی روح کو بھی کیوں نہیں لاتے، مجلس انتظامیہ کے بعض ارکان کہتے کہ ہم دونوں مل کر ایک آدمی بنتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر بے جان ہو جاتے ہیں، چالیس برس تک ہم دونوں کی یہی مثالی زندگی رہی، وہ اس دنیا سے خوش بھی گئے ہونگے کہ مجھ سے ان کو شکایت نہیں ہوئی، اور مجھ کو فخر ہے کہ میری ذات سے انکو آخر وقت تک کوئی تکلیف نہیں پہونچی، مگر اب ان کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں اپنی زبان حال سے کہتا رہونگا، ع

نہ دماغ ہے، نہ فراغ ہے، نہ شکیب ہے، نہ قرار ہے

وہ میرے لئے سب کچھ تھے، افسر اعلیٰ، محترم بزرگ، عزیز بھائی، مشیر، رفیق کار

ہمدم و دمساز دوست اور کیا ملیں، اب وہ نہیں رہے، تو میں اپنے کو کچھ بھی نہیں پاتا۔

فریاد کہ غم دارم و غمخوار ندارم

اقبال کا خیال تھا کہ سوگواری کی ظلمات میں مرنے والوں کی یادوں کی چمک اسی طرح چمکتی رہتی ہے جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کب تک میری آنکھیں دیکھتی رہیں گی کہ وہ آرہے ہیں، جارہے ہیں، خدا جانے کب تک میرے کان سنتے رہیں گے کہ وہ پکار رہے ہیں، الجھ رہے ہیں، الجھ کر میری باتوں کو مان رہے ہیں، انکے دم سے یہ دارالمصنفین کی ہر صبح حسین اور ہر شام رنگین تھی، مگر اب ان کے بعد اس کی خاموش فضا بڑی غمگین اور اداس ہے، اس کی سونی رات کی تاریکی انتہائی اندوہگین ہو گئی ہے، اس کے احاطہ میں شام آتی ہے تو میرا دل مفلس کا چراغ بن کر بجھا بجھا سا رہتا ہے، استاذ محترم حضرت شاہ صاحب نے لکھنا پڑھنا تو سکھایا تھا، ماتم کرنا نہ سکھا سکے تھے، کیسے لکھوں کہ آہ! بزم شبلی کی قندیل کی آخری شمع بجھ گئی، سلیمان کی امانت کا بار اٹھانے والا آسمان پر اٹھا لیا گیا، دارالمصنفین کی شاندار روایت کو سینے سے لگائے رکھنے والا سپرد خاک کر دیا گیا، اور اپنے ایک ہمراز، ہم مشرب اور ہم پیالہ کی تنہائی اور بے چارگی پر دارالمصنفین کے پھول پتے، شجر اور حجر کو رونے کے لئے چھوڑ گئے، حالی نے اپنے استاد غالب کی وفات کے بعد بزم سلطانی تخت خاقانی، راح ریحانی، عقل ربانی، اور حسن کنعانی کو فانی پاکر بحر ہستی کو محض سراب اور طلسم خیال پایا تھا، اب سے پہلے حالی کے ان جذبات کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا، مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیت حقیقت بھی بن جاتی ہیں، کاش میں تھوڑی دیر کیلئے بھی متمم بن نویرہ بن جاتا تو جس طرح وہ اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ لکھ کر خود رویا اور گلی گلی گھوم کر دوسروں کو رلایا، اسی طرح میں بھی پُر درد نوحہ لکھکر روتا اور لوگوں کو رلاتا

خوں شد دل خسرو ز نگہداشتن راز — چوں ہیچ کسے محرم اسرار ندارم

دار المصنفین کے مستقبل کی شب تاریک اور بیم موج و گرداب سے گھبرا اٹھا تو اضطرابی کیفیت میں دو تین روز لکھنؤ جاکر مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ساتھ رہا، صحبت اولیاء اللہ میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ انکی مجلس میں پائی، ان کی حوصلہ افزائی سے بڑا سہارا ملا، ان کے ساتھ مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا حافظ عمران خاں ندوی نے دار المصنفین کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں باہمی مشورے کئے، وہاں سے ردولی آیا، مرحوم کی لڑکی اور ان کے اعزہ کو دیکھ کر پھر غم امنڈ پڑا، ان کی قبر دیکھی نہ جا سکی، حضرت شیخ عبد الحق کی لحد مبارک پر حاضری دی، فاتحہ پڑھتے وقت سکون قلب کی دعا مانگی، اس وقت وہاں کے سجادہ نشین جناب شاہ آفاق احمد صاحب سے ملاقات ہوئی جنھوں نے مجھکو دیکھتے ہی کہا:

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے صبر آتے آتے آئیگا

یہ سن کر پھر غم تازہ ہو گیا، مگر انھوں نے یہ شعر بھی سنایا،

بہ گیتی گر کسے پایندہ بودے ابو القاسم محمدؐ زندہ بودے

اس مشہور شعر سے سوزش دل پر تسکین کے کچھ چھینٹے پڑے،

انھوں نے علامہ شبلی اور سید صاحبؒ سے زیادہ عمر پائی، مگر اس وقت دار المصنفین کو انکی سربراہی اور رہنمائی کی شدید ضرورت اتنی ہی تھی جتنی کہ ایک محاذ پر ایک جوان سپہ سالار کی ہوتی ہے، اسلئے انکی اچانک رحلت جوانمرگی سے کم المناک نہیں، دار المصنفین اپنے سوز سینہ کے داغ سے بے چین اور درد و غم سے فگار ہو کر فلک سے کہہ رہا ہے کہ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتے کوئی دن اور، مگر مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی کا دامن تھام کر اسی کی بارگاہ میں اب صرف یہی دعا کرنا ہے کہ وہ اپنی خدا ترسی، دینداری، نیک نفسی، فرض شناسی اور اوصاف کی پاکیزگی کی بدولت کوثر کی موجوں اور تسنیم کی لہروں سے سیراب ہو رہے ہوں، آمین ثم آمین، الوداع اے شبلی کے علمی لشکر کے آخری رجز خواں! الوداع اے سلیمان کے کارناموں کے حدی خواں! الوداع اے جان جانان دار المصنفین السلام! شبلی کی روح کیطرف سے سلام! سلیمان کی مسند علم کی طرف سے سلام! کارکنان دار المصنفین کی طرف سے سلام! اور ایک مہجور مغموم، محزون، خستہ دل اور شکستہ خاطر رفیق کار کی طرف سے بھی سلام! ہزاروں سلام، لاکھوں سلام

مقالات

دیار پورب کا دوسرا علمی دور

از۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی،

(۲)

عہد ابراہیمی میں باہر سے آنے والے فضلاء میں قاضی نظام الدین (شہاب الدین احمد بن محمد) گیلانی متوفی ۸۵۰ھ نمایان شخصیت کے مالک تھے، انھون نے گجرات میں تحصیل علم کی تھی، سلطان ابراہیم شاہ کی علم پروری، اور علماء نوازی کا شہرہ سنکر جونپور آئے، اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ان کے علم وفضل کی بنا پر ان کو سلطان کے مقربین مین شامل کرلیا، اور وہ پہلے جونپور کے قاضی بنائے گئے، پھر مچھلی شہر کے، جہان ان کی اولاد بہت پھولی پھلی، اور ان میں علماء ومشائخ پیدا ہوئے، قاضی نظام الدین گیلانی نے سلطان ابراہیم کے حکم سے فتاویٰ ابراہیم شاہیہ" تالیف کی، [1]

مفتی محمد بن ابوالبقا کرمانی جونپوری متوفی ۸۴۰ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور جونپور آکر شیخ ابوالفتح بن عبدالحیٔ کندی سے تعلیم حاصل کی، دیار جونپور میں ان کے فتاویٰ بہت مقبول و مشہور ہوئے، سلطان ابراہیم ان کے علم وفضل کا بڑا معتقد تھا، اور مسائل شرعیہ میں ان سے

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۱۴۱ -

رجوع کرتا تھا، ایک مرتبہ سلطان نے ایک باغی اور سرکش راجہ کی تادیب کے لیے فوج روانہ کی، اس جنگ میں ایسے لوگ بھی مارے گئے جو باغی اور سرکش نہیں تھے، سلطان کو یہ چیز جہاد کے خلاف معلوم ہوتی تھی، اس نے مفتی صاحب سے استفتاء کیا، انھوں نے جواب دیا کہ ان سے قتال جائز ہے، اگرچہ وہ فی الحال باغی و متمرد نہیں تھے، مگر وہ اعداء اسلام ہیں، اور موقع کی تلاش میں رہا کرتے ہیں [۱]

مولانا عادل الملک بن عبد الملک جونپوری اس دور کے مشہور علماء و مشائخ میں تھے، پنڈوہ (بنگال) جاکر شیخ علاء الدین پنڈوی سے طریقت حاصل کی، اور جونپور واپس آکر کچھ دنوں مقیم رہے، سلطان ابراہیم ان کا بھی معتقد تھا، اور ان کی ذات کو بابرکت سمجھتا تھا، ۸۲۲ھ میں سلطان نے ان کو رائے بریلی میں جاگیر عطا کرکے وہیں آباد کرا دیا۔

شیخ خضر بن حسن بلخی حدیث کے بڑے عالم تھے، وہ اپنے وطن بلخ سے ہندوستان آئے، اس وقت سلطان ابراہیم شاہ کی علم نوازی کا عام چرچا تھا، اس لیے دوسرے علماء و فضلاء کی طرح شیخ خضر بھی جونپور چلے آئے، سلطان نے ان کو لکھنؤ میں تدریس کی خدمت پر مامور کرکے ملیح آباد کے اطراف میں کئی گاؤں کی جاگیر عطا کی۔

قاضی رضی الدین ردولوی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے اور شاگرد تھے، سلطان ابراہیم نے ان کو ردولی کا قاضی بنایا، جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی، مشہور عالم و بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ سے سلطان ابراہیم کو بیحد عقیدت تھی، جب وہ جونپور تشریف لاتے تو سلطان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ایک مرتبہ جب وہ جونپور کی جامع مسجد میں آئے تو سلطان ابراہیم قاضی شہاب الدین کی بیعت

---

[۱] نزہتہ الخواطر ج ۳ ص ۱۳۳

میں حاضر خدمت ہوا، اس وقت سلطان فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، واپسی پر سید صاحب نے سلطان کو اپنی مسند عنایت فرمائی اور فتح کی بشارت دی، اس کے تیسرے دن قلعۂ چنار کی فتح کی خبر آگئی، اس لیے سلطان نے دوبارہ حاضر خدمت ہو کر نذر پیش کی مگر سید صاحب نے قبول نہیں فرمایا، کئی شاہزادے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر قیام جونپور کیلیے مصر ہوئے، سید صاحب نے ان کی دلجوئی میں فرمایا کہ ہم جونپور میں اگرچہ نہیں رہیں گے مگر سلطان کی حدود سے باہر نہیں جائیں گے، اور جونپور میں دو ماہ سے زیادہ مقیم رہے[1]

اسی دور میں سید عثمان شیرازی درویش دہلی ہوتے ہوئے وارد جونپور ہوئے، اور سلطان اور ارکانِ دولت ان کے ساتھ بھی عزت و احترام سے پیش آئے، ملک خاص مخلص اور دوسرے امرا نے ان کے لیے محلہ دریبہ میں ایک سنگین مسجد بنوائی جس میں شیخ محمد بن عیسیٰ تاج بھی نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے، یہ مسجد اب بھی موجود ہے، اور اسی کے قریب شیخ عثمان کا مزار ہے[2]

افضل العلماء ملا بہرام متوفی ۸۲۹ھ مرتاض جہان، حافظ قرآن نجیب الطرفین اور حاجی الحرمین الشریفین تھے، دہلی میں اکتساب علم و فضل کر کے شاہزادہ ظفر کے ساتھ ظفرآباد آئے، اور وہاں کی جامع مسجد کے امام و خطیب بنائے گئے، جس علاقے میں سکونت اختیار کی اس کو منطق ولہ کہتے تھے، (تجلی نور ج ۲ ص ۲۰)

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود شاہ شرقی (۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ) نے بیس سال سے زیادہ مدت تک حکومت کی، وہ بھی عادل و منصف ہونے کے ساتھ ساتھ محب العلم والعلماء تھا، اس نے بھی اپنے دور سلطنت میں بہت سے علمی و دینی آثار قائم کیے، اور باپ کی طرح علم پروری اور علماء نوازی میں شہرت پائی، شیخ محمد بن عیسیٰ ابراہیمی دور کے علمائے کبار اور

---

[1] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶ [2] تجلی نور ج ۱ ص ۴۸،

مشائخِ عظام میں تھے، ان کے لیے سلطان محمود شاہ نے انکی خانقاہ کے قریب جامع مسجد (جامع الشرق بڑی مسجد) تعمیر کی جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ کے دور میں ہوئی۔

مخدوم سید علی بن داؤد علمائے جونپور میں علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور رموز صوری و معنوی سے واقف تھے، سلطان محمود شاہ اور اس کی ملکہ بی بی راجی دونوں ان سے کمال عقیدت و محبت رکھتے تھے، بی بی راجی نے ان کے لیے شہر سے باہر ایک عالیشان سنگین مسجد بنوائی جو مسجد لال دروازہ کے نام سے مشہور ہے، اور جامع الشرق کا نمونہ ہے، اسی سے متصل مخدوم سید علی کے لیے خانقاہ بنوائی اور ان کے نام پر ایک گاؤں علی پور آباد کیا۔[۱] یہ مسجد نہایت خستہ حال میں تھی مگر چند سال سے اس میں مدرسہ حسینیہ کے قائم ہونے سے مسجد آباد ہو گئی ہے،

سلطان محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ صرف چند ماہ حکومت کر سکا،

اس کے بعد سلطان محمود شاہ کا دوسرا بیٹا سلطان حسین شاہ تخت پر بیٹھا، (۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) آیا اس پر شرقی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، اس نے بھی اپنے انیس[۱۹] سالہ دور حکومت میں قدر دانی علم و علماء میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی،

اس دور میں قاضی سماء الدین جونپوری اعلم العلماء تھے، ان کو قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تلمذ حاصل تھا، سلطان حسین شاہ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا اس لیے اپنے دور میں ان کو وزیر بنا کر قتلغ خان کا لقب دیا تھا، جس وقت سلطان حسین سلطان بہلول لودھی بادشاہ دہلی کے مقابلہ میں گیا، قاضی سماء الدین اس کے ساتھ تھے، شکست کے بعد بہلول لودھی نے ان کو گرفتار کر کے دہلی میں قید کیا، جہاں وہ ۸۸۹ھ تک زندہ رہے،[۲]

مخدوم دانیال خضری متوفی ۸۹۵ھ راجہ حامد شاہ مانکپوری کے مرید و خلیفہ تھے،

---

[۱] تجلی نور ج ۱ ص ۴۹ [۲] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۸،

صاحب مرآۃ الاسرار کے بیان کے مطابق وہ سلطان حسین شاہ کے دور میں جونپور تشریف لائے، اور انتقال کے بعد اپنے حجرہ کے صحن میں جو سلطان محمود شاہ کے حوض خاص کے پشتہ کے پیچھے تھا، دفن کیے گئے، کہتے ہیں کہ ایک ماہ تک ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی تھی[۱]

سلطان ابراہیم، سلطان محمود اور سلطان حسین تینوں حضرت شیخ محمد بن عیسیٰ تاج متوفی ۸۵۱ھ کے معتقد تھے، ایک دن وہ اپنے حجرہ کی گل کاری کر رہے تھے، کہ سلطان حسین حاضر خدمت ہوا، شیخ نے ہاتھ دھو کر مصافحہ و معانقہ کرنا چاہا، مگر سلطان حسین نے اسی حال میں مصافحہ و معانقہ کی خواہش کی، آپ نے اس کی خواہش پوری کر دی، سلطان کے کپڑے میں مٹی لگ گئی، اس کی یہ عقیدت تھی کہ اس نے وصیت کی کہ اس کو اسی کپڑے کا کفن دیا جائے، سلطان اسکی بڑی خدمت کرنا چاہتا تھا، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ سلطان نے ان کے صاحبزادے شیخ حبیب اللہ سے درخواست کی کہ آپ اپنے والد محترم اور ان کے متعلقین، اور خانقاہ کے واردین و صادرین کے اخراجات کے لیے کچھ جاگیر قبول کر لیں، شیخ محمد بن عیسیٰ نے سنا تو سلطان کی خاطر سے خاموش رہے، مگر جب سرکاری کارپرداز غلہ اور خطیر رقم لے کر حاضر خدمت ہوئے، تو ان کے دل میں الجھن پیدا ہوگئی، اور فرمایا کہ حبیب اللہ اس غلہ کو کھانے کے بعد خاک کھائے گا، کہتے ہیں کہ اسی سال شیخ حبیب اللہ کا انتقال ہوا۔

سلطان بہلول لودھی نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد جونپور کی تسخیر کا قصد کیا، سلطان حسین کو معلوم ہوا تو اس نے شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو مطلع فرمایا، آپ نے فرمایا کہ "قاصد محروم و مقہور است" اس کے بعد بہلول لودھی کی جونپور کی طرف پیش قدمی سے پہلے ہی خود سلطان حسین اس سے جنگ کے لیے نکلا مگر قنوج میں شکست کھا کر

---

[۱] تجلی نور ج ۱ ص ۵

جونپور واپس آیا، اور شیخ محمد بن عیسیٰ کی خدمت مین حاضر ہو کر رنج والم کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا بات وہی ہوئی۔ اگر بہلول جنگ کا ارادہ کرتا تو وہ محروم ہوتا، تم نے یہ کام کیا تو وہ بات تم پر پوری ہوئی، آخر میں جب سلطان حسین لودھیون کے مقابلہ میں شکست کھا کر بہار مین پناہ گزین ہوا تو شیخ صدر الدین کی خدمت مین حاضر ہو کر دعا اور مدد کی درخواست کی، انھون نے جواب دیا کہ "انداختۂ خواجۂ محمد عیسیٰ را مانمی توانیم برداشت" یعنی شیخ محمد بن عیسیٰ کے ٹھکرائے ہوئے کو ہم نہین اٹھا سکتے ہیں،[1]

شیخ بہاء الدین جونپوری کے علم وفضل اور سلطان حسین کے جود وسخا سے دین ودنیا دونوں بہم نظر آتے تھے، سلطان نے ان کے لیے عظیم الشان خانقاہ بنوائی جس میں شاہانہ طرز کے ایوان تھے، چند مواضع جاگیر میں بھی دیئے جس سے شیخ بہاء الدین کی خانقاہ مرجع فقراء اور مجمع طلبہ بن گئی اور اطمینان وسکون سے تعلیم وتعلم اور ارشاد وتلقین کا کام ہوتا رہا،[2]

مولانا الٰہ داد جونپوری نے سلطان حسین کی خواہش پر فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ اور اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول بزدوی کے حواشی تحریر فرمائے، اور دونوں کے خطبہ میں سلطان حسین کا نام تحریر کیا، سلطان نے اس کے صلہ مین مولانا الٰہ داد کو شاہی خزانہ سے ایک لاکھ روپیہ نقد نذر کیا جسے مولانا نے چند دنوں میں حاجت مندون مین تقسیم کرا دیا۔ اس سے طالب علمون کی حالت اتنی سدھر گئی کہ ان مین اور شاہزادون مین کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔[3]

مولانا صفی جونپوری سلطان حسین شاہ کے دور کے مشہور علماء وفضلاء مین سے تھے، انھون نے بہلول لودھی اور سکندر لودھی کا زمانہ بھی پایا ہے، ان کی تصانیف مین شرح کافیہ

---

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۲۲ تا ۲۴ [2] تذکرۃ العلماء ص ۲۵ [3] ایضاً ص ۲۵،

بہت مشہور ہے جسے انھوں نے سلطان حسین کے ایک شاہزادے کے لیے لکھا تھا، اور سلطان نے اس کے صلہ میں آپ کو خلعت شاہی سے نوازا تھا جب وقت سلطان حسین شاہ بہلول لودھی سے جنگ کے ارادہ سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ مولانا صفی اس کے ساتھ تھے، اتفاق سے اثنائے جنگ میں بہلول لودھی کی افغانی فوج نے ان کو گرفتار کرلیا جب وہ سلطان بہلول کے سامنے پیش کیے گئے تو اس نے ان کے ساتھ بڑی تعظیم وتکریم اور لطف و مدارات کا معاملہ کیا، اور اپنے ساتھ رکھا. شہزادہ سکندر بن بہلول لودھی نے ان کی خدمت میں رہکر تحصیل علم کی، جب سلطان سکندر لودھی، سلطان حسین کے مقابلہ میں فتح یاب ہوا تو جونپور کے شاہی قصور ومحلات کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سلاطین شرقیہ کی تعمیر کردہ مسجدوں کو بھی ویران کرنا چاہا، مگر مولانا صفی نے جو اس کے ہمرکاب تھے، اس سے باز رکھا، اس پرآشوب دور میں جونپور کے جو علماء وفضلاء اور مشائخ ومدرسین قتل وغارت کی مصیبت میں مبتلا تھے، آخر میں مولانا صفی کی وساطت سے سلطان سکندر لودھی کے دربار میں باریاب ہوئے، سلطان نے ان سب کا مال واسباب واپس کرادیا، اور ہر ایک کو حسب حال نوازشِ خسروانہ سے نوازا، اور جونپور کا نظم ونسق درست کرکے اپنے بیٹے جلال خان کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اور دہلی کی راہ لی مولانا صفی بھی ان ہی کے ساتھ واپس ہوئے مگر راستہ میں آگرہ پہونچ کر ان کا انتقال ہوگیا۔[1]

اس دور کے چند مشاہیر ارباب علم وفضل اوپر صرف اُن چند علماء وفضلاء اور مشائخ کا تذکرہ کیا گیا، جو سلاطین شرقیہ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، ان کے علاوہ شرقی قلمرو میں ہزاروں اہل کمال موجود تھے، جو اپنے اپنے حلقوں میں دین ودیانت اور علم وفن کی خدمت میں مصروف تھے، ذیل کے حضرات اپنی اپنی ذات سے پوری انجمن تھے،

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۷۹ [2]

ملک العلما وقاضی شہاب الدین دولت آبادی، خواجہ صدر جہان شیخ اجمل بن امجد بہرائچی قاضی تاج الدین ناصحی اودھی ظفرآبادی، قاضی سماء الدین جونپوری، قاضی سناء الدین مچھلی شہری، قاضی نظام الدین بن صدر الدین زینبی غزنوی مچھلی شہری، قاضی شہاب الدین اودھی، قاضی محمد بن محمود نصیرآبادی، قاضی محمود بن علاء الدین نصیرآبادی، شیخ فتح اللہ انصاری اودھی مولانا علاء الدین جونپوری، مولانا عادل الملک جونپوری، شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری، شیخ صفی الدین نعمانی ردولوی، شیخ محمد بن قاسم اودھی، شیخ خضر بن حسن بلخی، مولانا عبدالملک جونپوری، سید اشرف سمنانی کچھوچھوی، شیخ سعد اللہ خیرآبادی، شیخ محمد بن خضر دہلوی جونپوری، قاضی نصیر الدین گنبدی، جونپوری، شیخ محمد بن ظہیر الدین کڑوی، شیخ محمد بن قطب (شیخ مینا) لکھنوی، شیخ متوکل کنتوری، شیخ محمود بن حمید کنتوری، شیخ مسعود بن ظہیر فتح پوری، مولانا نور الدین ظفرآبادی حکیم شہاب الدین جونپوری، شیخ عبدالرزاق کچھوچھوی، مولانا فخر الدین ردولوی، شیخ فیض اللہ ابن شیخ حسام الدین مانک پوری، شیخ فیروز بن موسیٰ دہلوی جونپوری، شیخ قاسم بن برہان الدین چشتی اودھی، شیخ قطب الدین ظفرآبادی، مولانا قیام الدین قریشی ظفرآبادی، مفتی محمد بن ابوالبقا کرمانی لکھنوی، شیخ کمال الدین کڑوی، شیخ حسام الدین فتح پوری، شیخ حسام الدین ابن خواجہ خضر مانک پوری، شیخ رکن الدین ہردی جونپوری، شیخ رکن الدین قریشی ظفرآبادی شیخ سارنگ چشتی لکھنوی، شیخ سعد الدین بجنوری لکھنوی، شیخ سعد اللہ لکھنوی شیخ سعد اللہ کنتوری، شیخ شمس الدین اودھی، شیخ ابوالفتح بن شیخ عبدالحیٔ بن شیخ عبدالمقتدر تشریحی دہلوی جونپوری، شیخ احمد بن عمر (احمد عبدالحق) ردولوی، شیخ احمد حسینی مانک پوری، شیخ اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین نعمانی ردولوی، شیخ امین الدین لکھنوی، شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری، شیخ بڈھن علوی بہرائچی، شیخ جلال الدین بن اسمٰعیل مانک پوری، شیخ جمشید اسرائیلی راجگیری اودھی

شیخ حسام الدین بن نصراللہ اصفہانی جونپوری، شیخ مشید بن شیخ محمد بن خضر جونپوری، شیخ محمد قدوائی دریابادی، شیخ مبارک بن حمید بنارسی، شیخ جہان شاہ احمد مانک پوری، مولانا مولانا خواجہ مانک پوری، مولا عبدالملک جونپوری، مولانا الہٰ داد جونپوری وغیرہ۔

اس دور کی تصانیف دیارپورب میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ سلاطین شرقیہ کے دور میں جاری ہوا، جو آج تک قائم ودائم ہے، اور یہ علاقہ ابتک علمائے مصنفین سے معمور ہے، ہمارے علم وتحقیق میں اس دیار کے مصنفین میں سب سے پہلے عالم مولانا شرف الدین لاہوری متوفی ۸۰۴ھ کے بڑے صاحبزادے مولانا امیر صدر الدین ہیں، جو دوسرے شرقی سلطان مبارک شاہ کے وزیر تھے انکی تصانیف میں سے شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی، اور حاشیہ تفسیر بیضاوی مصنف تذکرۃ العلماء کی نظر سے گذری تھیں،[1]

ان کے بعد ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے حسب ذیل کتابیں لکھیں، الارشاد، شرح کافیہ، البحرالمواج، شرح اصول بزدوی، شرح قصیدہ بانت سعاد، شرح قصیدہ بردہ، رسالہ تقسیم علوم، مناقب السادات، ہدایۃ السعداء، بدیع البیان، جامع الصنائع، المصباح، عقیدۃ شہابیہ، رسالہ معارضہ، فتاویٰ ابراہیم شاہی، رسالہ طہارت زباد، رسالہ تفضیل عالم بر سید، فرشتہ نے قاضی صاحب کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے "تصانیف مستحسنۂ آن بزرگوار شہرت عام دارد" (ج ۲ ص ۳۰۶) اور سبحۃ المرجان میں ہے،

وَالَّفَ کتبا سارت بہا	قاضی صاحب نے وہ کتابیں لکھیں جنکو
رکبان العرب والعجم ص ۳۹	عرب وعجم کے علمی قافلے اپنے ساتھ لے گئے،

[1] تذکرۃ العلماء، ص ۱۰،

اہل علم ان کتابون کو بہترین خطین لکھکر ایران و توران اور روم وشام کے بادشاہوں کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجتے ان مین سے اکثر سلاطین ان کتابون کو سونے چاندی سے تول کر اسکو قاضی صاحب کی خدمت میں بطور انعام کے بھیجتے تھے، (تذکرۃ العلماء ص ۱۴)

سلطان ابراہیم کے دور میں کئی علماء نے اس کے نام سے مُعَنْوَن کرکے بلندپایہ کتابیں لکھین، فرشتہ کا بیان ہے،

"درعصروے فضلاے ممالک ہندوستان ودانشمندان ایران وتوران کہ ازآشوب جہاں پریشان خاطر بودند، بدارالامان جونپور آمدہ درعہدامن وامان غنودند، وازخوان احسان او ذلہا برداشتہ بنام نامی او (چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد) چندین کتب ورسائل پرداختند" (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵)

طبقات اکبری میں ہے" وآن دارالسلطنت از قدوم علماء دارالعلم گردید چندین کتب ورسائل بنام او تصنیف شد مثل حاشیہ ہندی و بحرالمواج و فتاوی ابراہیم شاہی وارشاد وغیر ذالک (طبقات اکبری ص ۵۲۹) قاضی نظام الدین حنفی گیلانی جونپوری نے متعدد کتابین تصنیف کین جن میں فتاویٰ ابراہیم شاہیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، فقہ حنفی کی یہ کتاب ایک سو ساٹھ کتابون سے استفادہ کرکے لکھی گئی ہے، اس کا انداز تحریر فتاوی قاضی خان کا ہے، کشف الظنون میں اس کو کتاب کبیر من افخر الکتب" لکھا ہے،

سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی شرقی دور کے اجلۂ مشائخ واکابر علماء میں ہیں، انکی تصانیف یہ ہیں، اشرفیہ فی النحو، حاشیہ ہدایہ، الفصول فی اصول الفقہ، شرح عوارف المعارف، شرح فصوص الحکم، قواعد العقائد، اشرف الانساب، بحرالاذکار، فوائد الاشرف اشرف الفوائد، بشارۃ الذاکرین، تنبیہ الاخوان، حجۃ الذاکرین، فتاوی اشرفیہ، تفسیر نوربخشی،

اوراد اشرفیہ، مرآۃ الحقائق، کنز الدقائق، رسالہ جواز سماع، بشارۃ المریدین، رسالہ جواز لعن بریزید، لطائف اشرفیہ ملفوظات جامع نظام الدین غریب یمنی، دیوان ۔۔۔

مولانا علاء الدین جونپوری، قاضی شہاب الدین کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے اسی شاگرد کے لیے شرح کافیہ لکھی تھی، انھوں نے فراغت کے بعد اپنے استاد کی اس کتاب کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ مولانا علاء الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں،

مولانا عبدالملک جونپوری بچپن ہی سے قاضی شہاب الدین کی خدمت میں رہے اور ان سے جملہ علوم کی تحصیل کی، انھوں نے بھی اپنے استاد کی شرح کافیہ کا حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھیں۔

شیخ صفی الدین ردولوی قاضی شہاب الدین کے نواسے اور ان کے تلمیذ خاص ہیں، ان کی متعدد تصانیف ہیں، علم صرف دستور المبتدی اپنے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل کے لیے لکھی تھی، غایۃ التحقیق کافیہ کی بسیط شرح ہے، اس میں انھوں نے اپنے نانا اور استاد قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ کی تسہیل کی ہے، کشف الظنون میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مولانا شمس الدین خواجگی کڑوی حدیث وفقہ اور تصوف میں امتیازی شان رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں کتاب المرید والمراد اور کتاب الاربعین ہے، جو مشارق الانوار سے چالیس احادیث کا انتخاب ہے۔

شیخ حسام الدین مانک پوری نے تصوف میں انیس العاشقین لکھی، اور شیخ شہاب الدین مانک پوری نے ان کے ملفوظات رفیق العارفین کے نام سے جمع کئے ہیں، جس میں انکے ۱۲ مکاتیب بھی ہیں

شیخ سعد الدین خیرآبادی فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت اور تصوف کے زبردست عالم تھے، ان کی تصانیف میں شرح اصول بزدوی، شرح الحسامی، شرح کافیہ شرح مصباح،

اور شرح رسالہ مکیہ ہے، یہ ان کے شیخ شاہ مینا لکھنوی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے،

شیخ محمد بن قاسم چشتی اودھی نے تصوف میں آداب السالکین نہایت مفید کتاب لکھی

شیخ کمال کڑوی کالو کے لقب سے مشہور تھے، ان کی کئی تصانیف ہیں ان میں ایک اوراد کالو ہے، شیخ محمد بن ظہیر الدین عباسی کڑوی مدفون لکھنو حاجی الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں، ان کی متعدد کتابیں ہیں جن میں ارشاد المریدین، معیار التصوف، اور اساس الطریقۃ مشہور ہیں،

شیخ محمود بن حمید کنتوری نے عربی زبان میں الرسالۃ الحالیۃ فی معرفۃ المدار یہ لکھی ہے۔

مولانا الہ داد جونپوری نے سلطان حسین شاہ کی خواہش پر ہدایہ اور اصول بزدوی کی شرح لکھی اور دونوں کے مقدمہ میں سلطان حسین کا ذکر کیا سلطان نے اس کے صلہ میں ان کو نوازا، سلطان حسین خود بھی عالم و فاضل اور موسیقی کا بھی ماہر تھا، اس نے بعض نغموں اور راگوں میں تصرف کر کے دھرپٹ اور چٹکلہ کے نام سے نئی چیزیں پیدا کیں، اور موسیقی میں تحفۃ الہند کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مولانا صفی جونپوری نے سلطان حسین کے شاہزادے کے لئے شرح کافیہ تصنیف کی اور سلطان نے ان کو شاہی خلعت سے نوازا،

غرض نویں صدی میں دیار پورب سلاطین شرقیہ جونپور کی علم پروری اور علما نوازی کی وجہ سے ہر علم و فن کے علماء و فضلاء اور مشائخ و بزرگان دین کا ملجا و ماوی تھا، اور قریہ قریہ میں مدارس اور خانقاہیں تھیں جن میں درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی حالت میں زمانہ نے کروٹ لی اور جونپور کے سلاطین شرقیہ کا اقبال دہلی کے لودھی سلاطین کے مقابلہ میں ادبار سے بدل گیا، اور اس دیار میں لودھی سلطنت

قائم ہوگئی ،

لودھی دور میں علم و علماء آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین نے ۸۸۱ھ میں دہلی کی لودھی سلطنت کے مقابلہ میں شکست کھائی اور جونپور کی سلطنت دہلی کی حکومت کے ماتحت آگئی جس میں تین لودھی سلاطین ہوئے ہیں۔

(۱) سلطان بہلول شاہ لودھی از ۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ (۲) سلطان سکندر شاہ ابن بہلول شاہ لودھی از ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ (۳) سلطان ابراہیم شاہ بن سکندر لودھی از ۹۲۳ھ تا ۹۳۲ھ دہلی کے لودھی سلاطین میں دوسرے حکمران سلطان سکندر شاہ لودھی کی وہی حیثیت ہے، جو جونپور کے سلاطین شرقیہ میں سلطان ابراہیم شاہ کی تھی۔ اس کا اٹھائیس سالہ دور بہت خیر و برکت کا دور تھا، وہ بڑا عادل و منصف متقی و پرہیزگار فرمانروا تھا، علماء و صلحاء سے عقیدت رکھتا تھا، ان کو شاہی دسترخوان پر بلاتا، ان کی علمی و دینی مجلسوں میں شریک ہوتا، مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر ان کے درس میں شریک ہوتا، اس نے بہت سی مسجدیں اور سرائیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، سڑکیں اور راستے بنوائے، پیداوار میں اضافہ کیا ہندی کی کتابوں کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے، ظہر کے بعد اور رات میں شاہی محل میں علماء سے علمی مذاکرہ کرتا اور قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتا، اس کے بھائی باربک شاہ نے جب جونپور میں شورش برپا کی تو اس کو فرو کرنے کے لئے خود جونپور آیا، دوسرے لودھی سلاطین بہار اور بنگال کی مہمات کے سلسلہ میں جونپور آتے جاتے تھے، اور یہاں قیام کرتے تھے، انھوں نے ۸۸۱ھ سے ۹۳۲ھ تک پچاس اکاون سال یہاں حکومت کی، اس دور کے اکثر علماء و فضلاء مخضرم الدولتین ہیں یعنی انھوں نے شرقی سلطنت اور لودھی سلطنت دونوں کا زمانہ پایا ہے، یا پھر لودھی کے بعد تیموری دور دیکھا ہے،

پورب میں لودھیوں کے دور کے کئی آثار پائے جاتے ہیں، جن سے اس دیار سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے، سلطان سکندر لودھی نے اجودھیا میں لچھمن گھاٹ کے پاس ایک بلند ٹیکری پر خام قلعہ تعمیر کر کے دارالامارہ بنایا، اور دریائے سرجو کے کنارے مسجد بنا کر اس میں جمعہ و جماعت قائم کی، اس نے کہیں دیکھا یا سنا تھا کہ حضرت شیث اور حضرت ایوبؑ کی قبریں دریا کے کنارے ٹیلہ کے پاس ہیں، اس لیے اس نے یہاں ان کی یادگار قائم کی۔[1] بعض لوگ اسکو حضرت شیثؑ کی قبر سمجھتے ہیں جس کی کوئی اصل نہیں ہے، پرگنہ نظھوپور میں سپاہ کے بارے میں قدیم کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ابراہیم پور ہے، یہاں سے سلطان ابراہیم لودھی کی فوج گذرتی تھی، اور ٹھہری بھی تھی، اس لیے اس کو سپاہ بھی کہتے ہیں، اسی کے قریب لدھوائی گاؤں ہے جو لودھی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس علاقے میں بعض لودھی امرا کی قبریں بھی ہیں، سکندر پور (بلیا) سلطان سکندر لودھی کے نام پر ہے جہاں آج بھی لودھیوں کی یادگار جوہی اور بیلی کے چمن کی شکل میں موجود ہے،

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سکندر لودھی نے اپنے دور میں شاہان شرقی کے سارے آثار مٹا دئے تھے، اور ان کی تعمیر کردہ مسجدوں کو بھی ویران کر دینا چاہتا تھا، مگر مولانا صفی جونپوری کی سفارش سے اس ارادہ سے باز رہا، اور اس انقلاب میں جو علماء مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے، ان کو رہائی ملی اور سلطان نے ان سب کی قدر افزائی کی، جس سے علم و فضل کا چمن انقلاب کے خزان سے محفوظ رہا۔

"جونپور کے مشائخ اور مدرس حضرات جو قتل و غارت اور لوٹ مار کی مصیبت میں رہکر خوف و امید کی حالت میں تھے، مولانا صفی کے توسط سے سلطان سکندر لودھی کی خدمت میں

---

[1] آئینہ اودھ ص ۱۴۱ -

پہونچ سکے اور مراحمِ خسروانہ سے نوازے گئے، اور تمام حضرات کے لوٹے ہوئے مال و اسباب واپس کئے گئے، اور ہر ایک حسبِ حیثیت شاہی عنایت سے بہرہ ور ہوا۔[1]

سلطان سکندر لودھی خود بھی محب العلم والعلماء بلکہ خادم العلم والعلماء تھا، اس نے علماء جونپور کے ساتھ جو نیک سلوک کیا، یہ اس کی نیک طینت کا تقاضا بھی تھا، مولانا صفی کے واسطے نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا، لودھی غلبہ و استیلاء کے بحرانی دور میں مولانا موصوف کی ذات نے اس دیار میں علم و علماء پر احسان عظیم کیا، اور بعد میں دیارِ پورب کے علماء سلاطین لودھی کی عنایات و توجہات کا بھی مرکز بنے ——— چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن لاہرپوری متوفی ۹۲۶ھ جنھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد دہلی کے اساتذہ سے تحصیل و تکمیل کی تھی، فراغت کے بعد بارہ[12] سال تک سلطان سکندر لودھی کے مقربین میں رہے اور اپنی مفوضہ خدمات انجام دیکر پھر جونپور چلے آئے۔[2]

مولانا الہ داد جونپوری آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین کے مقربین میں تھے، انکے صاحبزادے شیخ بھکاری (نام غالباً عبداللہ تھا) لودھی عہد کے علمائے فحول میں تھے ایک مرتبہ سلطان وقت نے دہلی میں مجلس مناظرہ منعقد کرائی جس میں ایک طرف شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز تلنبی تھے، اور دوسری طرف مولانا الہداد جونپوری اور ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری، فریقین میں سر دربار مناظرہ ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ باپ بیٹے علوم و مسائل کی تنقیح میں مہارت رکھتے ہیں، اور ان کے مدمقابل تقریر میں آگے ہیں۔[3]

شیخ محمد بن منکن مصباح العاشقین ملانوی متوفی ۹۰۰ھ ایک مرتبہ دہلی تشریف لے گئے۔ تو شاہزادہ ابراہیم کو اس کے والد سلطان سکندر لودھی نے ان کا شاندار استقبال

---

[1] تذکرۃ العلماء، ص ۲۲ و ص ۲۰، [2] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲، [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳،

کرنے کا حکم دیا، چنانچہ شاہزادے نے پرتپاک خیر مقدم کیا، دوسرے دن خود سلطان سکندر لودھی نے شیخ سے نیاز حاصل کرکے شاہی مہمان بنایا، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ دیکھ کر امرار و اعیان کی ایک جماعت نے بھی بیعت کی۔[1]

شیخ محمود بن شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۵ھ (شاہ بھمن غازی پوری) ایک مرتبہ سیر و سیاحت کرتے ہوئے زمانیہ غازیپور تشریف لے گیے، اس وقت لودھی سلطنت کی طرف سے نصیر خان لوہانی حاکم غازیپور تھا، وہ ان کے ظاہری و باطنی کمالات دیکھ کر ان کا معتقد اور ان کے حلقۂ بیعت و ارادت میں شامل ہوگیا، اور دہلی سے اجازت حاصل کرکے ان کو غازیپور کا میر عدل بنایا، اس عہدہ پر وہ مدت العمر رہے، اور وہیں فوت ہوئے۔[2]

مولانا حسن بن طاہر جونپوری متوفی ۹۰۹ھ زبردست عالم اور راجہ حامد شاہ مانک پوری کے خلیفہ تھے، سلطان سکندر لودھی نے اپنے دور میں انکو دہلی طلب کیا، مولانا اپنے اہل و عیال کے ساتھ[3] دہلی جاکر محمد تغلق کے قلعہ میں کوشک بجے منڈل میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

اسی دور میں مشہور چشتی بزرگ خواجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۱۰ھ کی ذات سے دیار مشرق خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے علما و مشائخ کا مرکز بنا، ان کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی ۹۲۱ھ نے سکندر لودھی کے دور میں انتقال فرمایا۔

لودھی دور میں بھی دیار پورب میں علمار و مشائخ کی بڑی تعداد تھی، جن میں یہ حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ نظام الدین میران شاہ چشتی مانک پوری ۹۰۸ھ، سید احمد حسینی مانک پوری ۸۹۹ھ، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری ۹۱۰ھ، مولانا بہاء الدین عمری جونپوری ۹۱۱ھ، مولانا الہداد حنفی جونپوری ۹۲۳ھ، راجہ سید نور مانک پوری ۹۲۱ھ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۱۹، [2] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳۳، [3] تذکرۂ علمائے ہند ص ۴۱۔

شیخ حسن بن طاہر جونپوری ۹۰۹ھ، شیخ احمد بن نظام الدین مانک پوری ۹۲۲ھ مولانا خواجگی کرڑوی، ۹۰۵ھ، شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری (شاہ نتھن غازی پوری) ۹۰۵ھ شیخ نصیرالدین قلندر سمرقندی جونپوری نیگوی ۹۱۵ھ، شیخ قطب الدین بینا دل قلندر ۹۲۵ھ، قاضی احمد بن محمود نصیرآبادی، ۹۳۵ھ، شیخ خاصہ بن خضر امیٹھوی ۹۲۲ھ شیخ داؤد بن قطب بنارسی، ۹۰۶ھ، شیخ عبدالصمد سائن پوری ۹۳۳ھ، مولانا عبداللہ بن مولانا الہ داد جونپوری، (مولانا بھکاری) شیخ فخرالدین بجنوری لکھنوی، ۹۱۰ھ شیخ فریدالدین بنارسی ۹۰۶ھ، وغیرہ وغیرہ،

حیات شبلی

مولانا شبلی کے شایان شان ان کی بہت مفصل سوانح عمری جانشین شبلی علامہ سید سلیمان ندوی کے حقیقت نگار قلم سے، جس مین مولانا شبلی کے خاندان اور ولادت سے وفات تک ان کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے عالمانہ مقدمہ مین جو درحقیقت اس کتاب کا شاہکار ہے، دیار پورب خصوصاً جونپور کی شرقی سلطنت اور پھر لودھی سلطنت کے دور مین اسلامی علوم وفنون کی جو نشر واشاعت ہوئی، اوسکی مختصر تاریخ اور ہر دور مین جو علما وفضلا و ارباب درس وتدریس مصنفین ومولفین گذرے ہیں انھون نے جو علمی کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا بھی ذکر آ گیا ہے،

طبع۔ دوم

قیمت ؍۔ ۲۲ روپیے۔

شرح السنہ امام بغوی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس بحث کے تمام حصوں سے اتفاق نہ ہو، تاہم مصنف کی تحقیقی شان اور انکی وسعت علم و نظر کا اس سے پورا اندازہ ہوتا ہے، بنابریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے ملتی جلتی ایک اور بحث کا خلاصہ بھی نقل کر دیا جائے جو جمع قرآن کے باب میں تحریر کی گئی ہے۔ لیکن اصل بحث سے پہلے اس باب کی متعدد روایتوں میں سے ایک روایت کو ملاحظہ کر لینا چاہیے۔

انا خارجۃ بن زید بن ثابت	خارجہ بن زید روایت کرتے ہیں کہ
ان زید بن ثابت قال لما	حضرت زید بن ثابت نے فرمایا کہ
نسخنا الصحف فی المصاحف	جب ہم لوگ مصاحف میں صحیفے نقل
فقدت آیۃ من سورۃ الاحزاب	کر رہے تھے تو سورۂ احزاب کی ایک
کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ	آیت جسے میں نے رسول اللہ کو پڑھتے
علیہ وسلم یقرؤھا لم اجدھا	سنا تھا کھو گئی۔ سو یہ آیت بجز خزیمہ
مع احد الا مع خزیمۃ	انصاری کے جن کی تنہا شہادت کو
الانصاری الذی جعل رسول	رسول اللہ صلعم نے دو آدمیوں کی شہادت
صلی اللہ علیہ وسلم شھادتہ	کے برابر قرار دیا تھا اور کسی
شھادۃ رجلین	کے یہاں نہیں ملی۔

اس حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ [لما جدھا مع احد الامع خزیمۃ الانصاری] تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ قرآن کو ثابت کرنے کے لیے تنہا ایک شخص کی بات کافی ہے، کیونکہ خود حضرت زیدؓ نے بھی یہ آیت سنی تھی، اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین سے اس کے سورۂ احزاب میں ہونے کو بھی جانتے تھے اسی طرح بعض اور صحابہؓ کو بھی اس کا علم تھا، البتہ انھیں یہ آیت بھول گئی تھی اسی لئے جوں ہی اسے سنا وہ انھیں فوراً یاد آگئی،

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چار آدمی قرآن کو جمع کرتے تھے، یہ سب انصاری تھے، اور ان کے نام یہ ہیں ابی بن کعب، معاذ بن جبلؓ زیدؓ بن ثابت اور ابو زیدؓ۔ بعض روایتوں میں حضرت ابو درداؓ کا نام بھی آتا ہے۔ ان حضرات کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شریک رہتے تھے مگر زیادہ شہرت ان ہی لوگوں کو ہوئی۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا چار آدمیوں سے قرآن پڑھو (۱) عبد اللہ ابن مسعودؓ، (۲) حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام سالم (۳) ابی ابنؓ کعب (۴) اور معاذ بن جبل سے۔

جن مشہور قراء کی قرأت کی سندوں کا سلسلہ صحابۂ کرام تک متصل ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں عبد اللہ بن کثیر اور نافع کی سندیں ابی بنؓ کعب سے ہیں عبد اللہ بن عامر کی حضرت عثمانؓ سے، عاصم کی حضرت علیؓ، عبد اللہ بنؓ مسعود اور زیدؓ سے اور حمزہ کی حضرت عثمان و علی (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہیں اور ان صحابۂ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن کو پڑھا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن مجید سوائے سورہ برأت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں جمع اور مرتب

اور لوگوں کے سینہ میں محفوظ ہو چکا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے سورہ انفال کے بعد سورہ برأت کو کس طرح ملا دیا۔ جب کہ اول الذکر مثانی میں اور موخر الذکر مئین میں ہے، اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی تحریر نہیں فرمایا تو انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مختلف وقتوں میں نازل ہوا اور جب آپ پر اس کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کسی کاتب قرآن کو بلا کر ہدایت فرماتے تھے کہ ان آیتوں کو اس سورۃ میں شامل کر دجن میں یہ یہ باتیں مذکور ہیں، سورۂ انفال مدنی دور کے ابتداء میں نازل ہوئی تھی۔ اور سورۂ برأت سب سے آخر میں اتری ہے اور ان دونوں کے واقعات اور قصے ملتے جلتے ہیں، لیکن رسول اللہؐ کا انتقال ہوگیا۔ مگر آپ نے اس کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ اسی میں ہے اسی لیے میں نے اس کو ملا دیا ہے مگر ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ موجودہ ترتیب وتالیف رسول اللہؐ کے زمانہ ہی میں ہو چکی تھی، البتہ آپؐ نے اس کو ایک مصحف میں اس لیے جمع نہیں کرایا کہ ممکن ہے۔ اس میں سے کوئی چیز منسوخ ہو جائے اور اس کی تلاوت کا حکم ختم کر دیا جائے جس طرح کہ بعض احکام منسوخ ہوتے رہتے تھے۔ سو اگر آپؐ نے قرآن کو یکجا کرا دیا ہوتا اور پھر اس کی تلاوت منسوخ ہو جاتی تو اس کے نتیجہ میں اختلاف بھی رونما ہوتا، اور دین کا معاملہ بھی گڈمڈ ہو جاتا۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے زمانہ نسخ تک اسکو لوگوں کے دلوں میں محفوظ کر دیا اور پھر خلفائے راشدینؓ کو اس کے جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائی، یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بغیر کسی رد وبدل اور

کمی بیشی کے دفتین کے اندر وہی قرآن جمع کیا ہے، جو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول پر اتارا تھا۔ اور حدیث کی صراحت کے مطابق وہ جمع قرآن کے لیے اس بناء پر آمادہ ہوئے تھے کہ ابتداءً قرآن مجید مختلف ٹکڑوں، کھجور کے پتوں پر اور لوگوں کے سینوں میں منتشر تھا۔ حفاظ کی شہادت کے بعد جب ان کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو انھوں نے رسول اللہ ؐ کے جانشین سے اس معاملہ میں رجوع کیا اور ان کو اسکے جمع کرنے کے لیے آمادہ کیا، خلیفہ نے سب سے رائے مشورہ لے کر اس کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان حضرات نے اس کو ٹھیک اسی طرح سے لکھا جس طرح سے انھوں نے رسول اللہ ؐ سے سنا تھا بغیر اس کے کہ اس میں کسی قسم کی تقدیم یا تاخیر یا اس کی کوئی ایسی ترتیب مقرر کی ہو جسے انھوں نے رسول اللہ ؐ سے اخذ نہ کیا ہو اور خود رسول اللہ ؐ کا معمول تھا کہ جب آپؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ اسے اسی ترتیب کے مطابق جو ہمارے موجودہ مصاحف کی ہے صحابہ کو متعین تعلیم دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت جبرئیلؑ آپؐ کو اس سے آگاہ فرماتے تھے، اور ہر آیت کے نزول کے وقت مطلع کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد اس سورہ میں لکھی جائے گی جس میں فلاں بات بیان کی گئی ہے۔ اسی مفہوم کی روایت حضرت عثمانؓ سے کی گئی ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ صحابۂ کرام کی کوششوں کا تعلق قرآن کی ترتیب سے بالکل نہ تھا۔ بلکہ وہ محض اس کو ایک جگہ اکٹھا کر دینے سے متعلق تھیں کیونکہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہے، اور وہ لوح محفوظ میں بھی اسی ترتیب کے موافق ہے جو ہمارے موجودہ مصاحف میں پائی جاتی ہے، اللہ نے ایک ہی دفعہ میں پورا قرآن مجید

رمضان کے مہینہ میں شب قدر کے اندر دنیوی آسمان کی طرف اتارا تھا جیسا کہ فرمایا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ	رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں
فِيْهِ الْقُرْآنُ۔ (بقرہ)	قرآن اُتارا گیا۔

اور دوسری جگہ ہے کہ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ	ہم نے قرآن کو شب قدر میں
(قدر ۷-۱)	نازل کیا۔

پھر وہ متفرق طور پر نجماً نجماً حسب ضرورت رسول اللہؐ پر آپؐ کی زندگی بھر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد ربانی ہے :۔

وقرآنا فرقناہ لتقرأہ	اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے اتارا تاکہ تم مہلت
على الناس على مكث (اسراء ۱۰۶)	کے ساتھ اسے پڑھ کر سناؤ۔

گویا نزول کی ترتیب تلاوت کی ترتیب سے مختلف ہے۔ اور صحابہ کرام کا یہ اتفاق امت میں قرآن کے بقا کا سبب، بندوں پر اللہ کی رحمت اور اس کے قرآن کی حفاظت کے وعدہ کی دراصل تکمیل تھا۔ جیسا کہ فرمایا :۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ	بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بے شک
لَحَافِظُوْنَ۔ (حجر ۹)	ہم ہی اسکے نگہبان ہیں۔

پھر صحابہ کرام رسول اللہؐ کے بعد ان حروف پر قرآن کی تلاوت کرتے رہے جنھیں آپؐ نے اللہ کے حکم سے انھیں پڑھایا تھا۔ مگر جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قراء کے درمیان اختلاف واقع ہوا اور اس نے نہایت نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کرلی اور مختلف شہروں سے اس کے متعلق حضرت عثمانؓ کے پاس خطوط آنے لگے اور

حذیفہ بن یمان نے تو غزوۂ ارمینیہ سے واپسی کے بعد ان سے براہ راست اس پر گفتگو کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کو جمع کرکے ایک حرف پر مصاحف مین قرآن کو جمع کردینے کے لیے مشورہ کیا تاکہ اختلاف ختم ہوجائے۔ تمام لوگوں نے ان کی رائے کو پسند کیا، اور اس کو بہت مناسب بتایا تب حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے یہاں سے مصحف منگایا، اور زیدؓ بن ثابت اور قبیلہ قریش کے تین آدمیوں (عبداللہؓ بن زبیر، سعیدؓ بن عاصؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام) کو اسکے نقل کرنے کا حکم دیا، یہی نقلین انھون نے مختلف مقامات اور شہروں کو روانہ کین،

مصعب بن سعد سے روایت ہے کہ جب قرآن کے بارہ میں لوگوں کے اختلافات بڑھے اور انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ ابن مسعودؓ کی قرات ہے، یہ سالمؓ کی قرآت ہے، اور یہ ابیؓ کی قرات ہے تو حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کو جمع کرکے فرمایا کہ مین زیدؓ بن ثابت کے حرف کو مصاحف لکھوا کر شہروں میں بھجوانا چاہتا ہوں لوگوں نے کہا آپ کی رائے نہایت خوب ہے، اس پر انھوں نے پوچھا کہ عربیت میں سب سے فائق کون ہے لوگون نے بتایا کہ سعیدؓ بن عاص، پوچھا کتابت مین سب سے بڑھکر کون ہے؟ بتایا گیا کہ زیدؓ بن ثابت جو کاتب وحی ہیں، یہ سن کر انھون نے کہا تو سعید املا کرائیں اور زید لکھین۔ چنانچہ مصاحف لکھے اور شہروں میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد مین نے صحابہ سے یہ کہتے سنا کہ

احسن واللہ عثمان   بخدا عثمانؓ نے بہت عمدہ کیا۔

سوید بن غفلہ روایت کرتے ہیں کہ مین نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کہ لوگو اللہ سے ڈرو، عثمانؓ کے معاملہ مین غلو سے پرہیز کرو اور انھیں حراق المصاحف (مصاحف جلانے والا) کہنا چھوڑ دو۔ خدا کی قسم انھون نے ہم سب۔ سربرآوردہ صحابیوں کی موجودگی میں مصاحف

جلائے تھے، اور دریافت کیا تھا کہ اس قرآت کے بارے میں جس میں لوگ مختلف الرائے ہیں، آپ لوگ کیا رائے دیتے ہیں، حالت یہ ہو گئی ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے ملتا ہے تو کہتا ہے کہ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے، تمھاری قرأت تو کفر کے مشابہ ہے، ہم لوگوں نے کہا امیر المومنین آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا میں تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ جب آج تم لوگ اس قدر جھگڑ رہے ہو تو تمھارے بعد والے تو اور زیادہ اختلاف کریں گے۔ ہم لوگوں نے کہا آپ کی رائے کتنی عمدہ ہے، چنانچہ انھوں نے زید بن ثابتؓ اور سعید بن عاصؓ کو بلوایا اور کہا کہ ایک آدمی لکھے اور دوسرا املا کرائے، اور جب کسی چیز میں دونوں کا اختلاف ہو تو اسے میرے پاس لاؤ۔ لیکن ان لوگوں میں صرف سورہ بقرہ کے ایک لفظ کے بارہ میں اختلاف ہوا، سعید "تابوت" اور زید اسے "تابوہ" کہتے تھے، جب مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس آیا تو انھوں نے "تابوت" لکھنے کا حکم دیا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ میں ذمہ دار ہوتا تو یقیناً وہی کرتا جو انھوں نے کیا تھا۔

ابو مجلز کا بیان ہے کہ عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو اگر انھوں نے سب کو ایک قرأت پر جمع نہ کیا ہوتا تو لوگ قرآن کو بھی اشعار کی طرح پڑھتے۔

ابو عبدالرحمن سلمی سے روایت ہے کہ ابوبکر، عمر، عثمان، زید بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی قرآت ایک ہی تھی، اور وہی مشہور و معروف قرآت ہے، اور اسی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے سال دو دفعہ حضرت جبریلؑ کے سامنے ورد کیا تھا، حضرت علیؓ بھی زندگی بھر مصحف عثمانی کے مطابق قرأت کرتے رہے، کہا جاتا ہے کہ زید بن ثابتؓ بھی رسول اللہؐ کے آخری ورد میں موجود تھے، اور اسی میں منسوخ وغیر

منسوخ کی مکمل تصریح کی گئی تھی، سلمی سے بھی منقول ہے کہ زید بن ثابت نے رسول اللہ کی وفات کے سال دو بار آپ کے سامنے قرآن پڑھا تھا، اور اس قرآت کو زیدؓ بن ثابت کی قرآت کہے جانے کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اسے رسول اللہؐ کے لیے لکھا، اور آپ کے سامنے پڑھا تھا، اور آپ کے آخری دورہ میں وہ موجود بھی تھے، اور اسی کو وہ عمر بھر لوگوں کو پڑھاتے رہے، اسی لیے ابوبکرؓ و عمرؓ نے جمع قرآن میں اس پر اعتماد کیا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے بھی مصاحف کی کتابت اسی بناء پر ان کے سپرد کی تھی، (جلد چہارم ص ۵۱۹ تا ۵۲۶)

مشکلات حدیث کی شرح و توجیہ پہلے گذر چکا ہے کہ شرح السنہ حدیثوں کی شرح توجیہ میں بے نظیر کتاب ہے، امام بغوی نے خود اس کو اپنی کتاب کی اہم خصوصیت بتایا ہے، اس لیے ذیل میں اس کے بعض نمونے پیش کیے جاتے ہیں،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا کیا تھا، اس لیے قرآن مجید کی طرح بعض حدیثیں بھی جوامع الکلم میں ہیں، اس طرح کی مختصر اور جامع حدیثوں کا مفہوم امام بغوی نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، مثلاً ایک مشہور حدیث ہے:-

المسلم من سلم المسلمون	مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے
من لسانہ ویدہ والمهاجر	مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ جو ان باتوں کو
من ھجر مانھی اللہ عنہ	چھوڑ دے جن سے اللہ نے اسے روکا ہے،

امام بغوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ قابل ستائش مسلمان اور مہاجر وہی شخص ہے جس کے اندر یہ اوصاف موجود ہوں لیکن اگر کسی کے اندر یہ اوصاف بدرجۂ اتم نہ ہوں تو اس کے اسلام کی اس سے نفی مقصود نہیں ہے جیسے کہا جاتا ہے الناس العرب المال الابل

اور مراد افضل شخص اور افضل مال سے ہوتی ہے، اسی طرح افضل مسلمان وہ ہے جو اللہ کی طرح مسلمانوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہو اور ان کی آبرو ریزی سے باز رہتا ہو اور افضل مہاجر وہ ہے جو وطن کی طرح تمام محرمات اور منہیات کو بھی چھوڑ دے

(جلد ۱ صفحہ ۲۷ و ۲۸)

اسی طرح کی ایک اور مشہور مختصر روایت ہے ۔

۹ الحیاء شعبۃ من الایمان حیا ایمان کی ایک شاخ ہے

اس کی وضاحت میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" امام خطابیؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ حیا حیا دار کو معاصی سے روکتی ہے اس لئے وہ ایمان میں سے ہے کیونکہ ایمان مامورمن اللہ احکام کی تعمیل اور منہیات سے باز رہنے کا نام ہے۔ میرے خیال میں جس طرح انسان گناہوں سے ایمان کی وجہ سے باز رہتا ہے، اسی طرح حیا کی وجہ سے بھی وہ گناہوں سے کنارہ کش رہتا ہے، چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے۔

۹ اذا لم تستح فاصنع ما شئت جب تم میں حیا نہ ہو تو جو چاہے کرو

اس سے آپ کا منشاء یہ ہے کہ حیا سے جس کا تعلق نہ ہوگا وہ جس طرح کے فواحش اور قبائح کو چاہے گا اختیار کرے گا۔ پس حیا ایمان کی طرح گناہوں سے روکنے کا سبب ہے اس لیے وہ ایمان کے شعبوں میں شمار کی گئی ہے" (ج ۱ ص ۳۵ و ۳۶)

ایک حدیث میں منافق کی یہ تین علامتیں بتائی گئی ہیں، (۱) جب بات کرے تو جھوٹ کہے، (۲) وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، (۳) امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے، امام بغویؒ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں :۔

" یہ بات مسلمانوں کے اندر ڈرنے کے لیے کہی گئی ہے کیونکہ یہ تینوں نفاق کا باعث بنتی ہیں لیکن

اگر کوئی شخص اتفاقاً ان حرکتوں کا مرتکب ہو گیا تو اسے منافق نہیں کہیں گے، نفاق کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ عہد نبوی کے منافقین کی طرح کوئی آدمی ایمان کا اظہار کرے لیکن اس کے دل میں کفر چھپا ہوا ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ بظاہر دین کے حدود اور تقاضوں کا لحاظ رکھے لیکن باطن میں ان کی رعایت نہ کرے، ظاہر ہے کہ دوسری صورت میں نفاق کم درجے کا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

سباب المومن فسوق و	مومن کو برا بھلا کہنا فسق اور اس سے
قتالہ کفر	قتال کرنا کفر ہے۔

لیکن یہ کفر کی معمولی صورت ہے۔ باقی حضرت حسنؒ سے جو یہ مروی ہے کہ "یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں سے یہ تینوں افعال سرزد ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے بات کہی تو دروغگوئی کی، وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور امین بنائے گئے تو اس میں خیانت کی" تو اس کے سلسلہ یہ کہا جائے گا کہ ان لوگوں سے یہ حرکتیں اتفاقاً سرزد ہوئی تھیں انھوں نے ان پر اصرار نہیں کیا تھا، بلکہ خود توبہ کیا اور اپنے والد بزرگوار سے بھی اپنے لیے استغفار کی درخواست کی تھی، اس بنا پر نفاق کی علامتیں ان کے اندر راسخ نہیں ہوئی تھیں"۔ (جلد اول ص ۷، ۸، ۹)

بعض مشکل حدیثوں کا مفہوم ملاحظہ ہو، رد الوسوسہ کے باب میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

نحن احق بالشك من ابراهیم	ہم حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شک
اذ قال رب ارنی کیف تحی	کے زیادہ سزاوار ہیں جب انھوں
الموتی قال اولم تومن	نے کہا خداوندا تو مجھے دکھا کہ کس طرح
قال بلی ولکن لیطمئن قلبی	مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اللہ نے

ورحم اللہ لوطا لقد کان یاوی الی رکن شدید ولو لبثت فی السجن طول مالبث یوسف لاجبت الداعی،

کہا کیا تم کو اس کا یقین نہیں ہے بولے کیوں نہیں (مگر میں اس لیے التجا کر رہا ہوں) تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے حضرت لوطؑ پر خدا رحم کرے، وہ ایک بڑے سہارے کے پاس آتے تھے، اور اگر حضرت یوسفؑ کی طرح میں طویل مدت تک قید میں رہا ہوتا تو بلانے والے کی دعوت پر ضرور لبیک کہتا۔

امام بغوی نے اس حدیث کی مشکلات کو اس طرح حل کیا ہے:۔

"اسماعیل بن یحییٰ مزنی سے حکایت کی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کے بارہ میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی شک ہوا تھا، اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بارہ میں کوئی شبہ ہوا تھا، ابوسلیمان خطابی کا بیان ہے کہ "نحن احق بالشک من ابراھیم" کہکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اپنے متعلق اور نہ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ اعتراف فرمایا ہے کہ وہ شک و شبہہ میں پڑ گئے تھے بلکہ آپ کا مقصد اپنے اور ان کے متعلق شک و شبہہ کی نفی کرنا اور یہ بتانا ہے کہ جب مجھکو اس میں کوئی تردد نہیں ہے کہ اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آخر کس طرح اس میں شک ہو سکتا تھا، یہ ارشاد مبارک آپ کے غایت انکسار اور غیر معمولی تواضع کا ثبوت ہے، اور اس میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جانب سے جو سوال کیا گیا تھا، وہ ان کے شک کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ یہ علم کی زیادتی کی طلب تھی کیونکہ

مشاہدہ سے جو معرفت اور طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ استدلال سے نہیں حاصل ہوتی۔

حضرت یوسفؑ کے متعلق آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ ان کے صبر و استقامت کی تعریف ہے، کیونکہ عرصۂ دراز تک قید خانہ مین پڑے رہنے کے باوجود جب بادشاہ کا قاصدان کے پاس رہائی کا پروانہ لیکر آیا تو انھوں نے عام مجرموں کی طرح جیل سے نکلنے مین کوئی عجلت نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ :۔

ارجع الی ربك فاسأله	تم اپنے آقا کے پاس لوٹ کر ان سے
ما بال النسوة اللاتی	دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ
قطعن ایدیھن (یوسف)	ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

اس سے حضرت یوسفؑ کا مقصد لوگوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ وہ بے خطا تھے، اور انھیں محض ظلم کی بنا پر قید و بند مین ڈالا گیا تھا، یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات از راہ انکسار فرمائی ہے، آپ کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ اگر حضرت یوسفؑ کی جگہ آپ ہوتے تو واقعۃً رہا ہو جانے کے لیے عجلت اور جلد بازی کرتے تواضع بڑے آدمی کو چھوٹا اور بلند کو پست نہیں کرتی ہے، بلکہ اس سے اس کا فضل و کمال ظاہر ہوتا ہے، اور یہ متواضع کی شان و عظمت کو بڑھا دیتی ہے،

حضرت لوطؑ کے بارہ میں آپ کے ارشاد سے ان کے اُس قول کی جانب اشارہ ہے، جو قرآن مین یون نقل ہوا ہے،

لو ان لی بکم قوۃ او آوی	اے کاش مجھکو تمھارے مقابلہ کی قوت ہوتی
الی رکن شدید (ھود - ۸۰)	یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ لیتا۔

یعنی اگر میرے کنبہ کے لوگ ہوتے تو وہ تم لوگوں کے ظلم و تعدی کو روکتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے رحمت کی دعا اس لیے کی تھی کہ وہ مہمانوں کے ساتھ اپنی قوم کی بدسلوکی دیکھکر جزع فزع کرتے ہوئے سہواً یہ کہہ اٹھے کہ "میں کسی زبردست سہارے کی آڑ لیتا، حالانکہ سب سے بڑا سہارا تو خود خدا کی ذات ہے۔" (ج ۱ ص ۱۱۵ تا ۱۱۶)

ایک حدیث میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر نفس کا مستقر چاہے وہ دوزخ ہو یا جنت لکھا جا چکا ہے، اور اس کا سعید و شقی ہونا بھی تحریر میں آچکا ہے، ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول کیوں نہ ہم لوگ اپنے نوشتہ ہی پر بھروسہ کریں اور عمل ترک کر دیں، ارشاد ہوا نہیں تم لوگ عمل کرو، ہر شخص کو آسانی عطا کیجاتی ہے یعنی بدبخت لوگوں کے لیے بدبختوں کا عمل آسان کیا جاتا ہے اور سعادت مند لوگوں کے لیے اہلِ سعادت کا عمل آسان کیا جاتا ہے'

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی :-

فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق
بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ
واما من بخل واستغنیٰ و
وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ
للعسریٰ۔ (لیل، ۵ تا ۱۰)

سو جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور
اچھی بات کو سچ مانا تو اس کے لیے ہم آسانی
کی جگہ کو آسان کریں گے اور جس نے بخل
کیا اور بے نیازی اختیار کی اور اچھی بات
کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے مشکل جگہ کو
آسان کریں گے۔

امام بغوی رحمہ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے :-

"صحابہ کا یہ کہنا کہ [افلا نتکل علی کتابنا وندع العمل] کیا ہم اپنے نوشتہ پر بھروسہ کرکے عمل سے دستکش ہو جائیں، ایک ایسا مطالبہ تھا جو بندگی اور عبودیت کو معطل بنا دینے کے

ہم معنی تھا، اس کی تفصیل یوں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق نوشتہ کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ دراصل بندوں کے بارہ میں خدا کے علم غیب کی خبر تھی جو ان کے خلاف ایک قسم کی حجت بھی تھی، مگر انھوں نے اس کو ترک عمل کا بہانہ بنانا چاہا۔ اس لیے آپ نے بتایا کہ یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک کا تعلق باطن اور دوسرے کا ظاہر سے ہے۔ اور تقدیر کے معاملہ کے باوجود ممکن ہے بندوں کو عمل اور بندگی کا مکلف اس لیے بنایا گیا ہو تاکہ وہ اس باطن سے خائف رہیں جو غیب میں ہے، اور ظاہر سے امید رکھیں، یہی خوف ورجا اور امید وبیم عبودیت کے دو رُخ ہیں، ان ہی سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ آپ نے بتایا کہ ہر شخص کے لیے اس چیز کو آسان کیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے اور انسان کا دنیوی عمل اس کے اخروی انجام کی دلیل ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے دو مثالوں پر غور کرنا چاہیے، انسان کے رزق کا معاملہ گو مقسوم ومقدر ہے مگر اس کو کسب اور کمائی کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اس کی عمر کے لیے اجل مقرر ہے، مگر اس کے باوجود طبی علاج سے کام لیا جاتا ہے، ان دونوں مثالوں میں علت پوشیدہ اور غائب چیز ہے، اور ظاہر ایک موہوم اور خیالی سبب ہے، لیکن عوام وخواص سب کا اتفاق ہے کہ ان کے ظاہری موہوم سبب کو باطنی پوشیدہ علت کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ (ج اول ص ۱۳۳)

استنباطات | بعض حدیثوں سے امام بغوی نے مفید نتائج اخذ کئے ہیں، ذیل میں ان کے استنباطات کی چند لطیف اور دلچسپ مثالیں نقل کی جاتی ہیں، ایک حدیث میں نماز کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی نواسی امامہ بنت زینبؓ کو کندھے پر لیے رہنے کا ذکر ہے، راوی کا بیان ہے کہ جب آپ سجدہ میں جاتے تو ان کو اتار دیتے اور کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے تھے،

اس سے امام بغویؒ نے حسب ذیل استنباطات کئے ہیں ا۔

" (۱) اہل وعیال اور چھوٹے بچوں سے حسن معاشرت اور بہتر سلوک کرنا چاہیئے۔ (۲) معمولی اور تھوڑے کام سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ (۳) نماز پڑھتے وقت آستین کے اندر یا کندھے پر کسی چیز کو لئے رہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کے لیے عمل کثیر کی ضرورت نہ پڑے۔ (۴) اگر بچوں کے کپڑے اور جسم پاک ہوں تو نماز میں ان کو لیے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہو مگر حسنؒ کو نزدیک بچوں کے کپڑے کی وجہ سے نماز مکروہ ہے کیونکہ اس میں گندگی اور آلائش عموماً رہا کرتی ہے۔ (۵) اگر نماز میں کسی جاندار چیز کو اٹھائے تو اسکی اندرونی نجاست نماز کی صحت کے لئے مانع نہیں ہوتی بشرطیکہ اس کا بیرونی حصہ پاک ہو کیونکہ آدمی کو ظاہری طہارت کا مکلف بنایا گیا ہے اور اس سے اپنے ظاہر کو پاک صاف رکھنے ہی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی شیشی نماز میں لئے ہو جو اگرچہ بند ہو لیکن اس کے اندر نجاست ہو تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ (۶) محارم کو چھونے سے طہارت زائل نہیں ہوتی[۱] (ج ۳ ص ۲۶۴ و ۲۶۵)

ایک حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی وجہ سے نماز میں

---

[۱] اس حدیث کو بعض علما نے منسوخ قرار دیا ہے، اور بعض نے اسکو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں بتایا ہے بعض کے نزدیک نماز میں ایسا صرف ضرورۃً کیا جا سکتا ہے۔ مگر شوافع اور امام نووی وغیرہ کا خیال ہے کہ اس حدیث کے اندر قواعد شرعیہ کے منافی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کا خیال ہو کہ جس طرح آدمی کا جسم پاک ہو اور اسکی اندرونی آلائشوں سے نماز میں فرق نہیں آتا اسی طرح بچوں کے کپڑے اور جسم بھی اگر پاک ہوں اور ان کے اندر نجاست ظاہر اور معلوم نہ ہو تو نماز ہو جائے گی، اسیطرح اگر عمل قلیل متفرق طور پر کیا جائے تو نماز باطل نہیں ہوگی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام بیان جواز ہی کے لیے کیا تھا، اس حدیث سے بچوں کو مسجد میں لیجانے کا ثبوت بھی ملتا

دیر ہوگئی تو حضرت ابو بکرؓ نے نماز پڑھانا شروع کیا اسی اثنا میں آپؐ تشریف لائے تو لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کو متوجہ کرنے کے لیے تالیاں بجائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا کہ تم نماز پڑھاتے رہیں، حضرت ابو بکرؓ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا مگر نماز پڑھانے میں ان کو تامل ہوا اس لیے وہ پیچھے ہٹ آئے اور رسول اللہؐ نے نماز پڑھائی، نماز ختم ہونے کے بعد آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ میرے اشارہ کے باوجود تم کیوں پیچھے چلے آئے انھوں نے کہا ابن ابی قحافہ کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ آپؐ کی موجودگی میں امامت کرتا، پھر آپؐ نے لوگوں سے تالیاں بجانے کی وجہ پوچھی اور فرمایا کہ جب نماز میں اس طرح کی کوئی بات پیش آجائے تو سبحان اللہ کہو تصفیق (تالی بجانا) تو عورتوں کے لیے ہے

امام بغویؒ نے اس حدیث کے ضمن میں متعدد فوائد تحریر کئے ہیں :۔

(۱) نماز کو اول وقت ہی میں ادا کر لینا چاہیئے کسی کا انتظار کرنا اور نماز میں تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ صحابۂ کرامؓ نے وقت ہو جانے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرکے تاخیر نہیں کی اور آپؐ نے ان کے اس کام پر کوئی ناگواری بھی نہیں ظاہر کی، (۲) التفات سے نماز باطل نہیں ہوتی جبتک کہ آدمی کا پورا جسم قبلہ کی جانب سے نہ ہٹ جائے، (۳) عمل یسیر سے نماز باطل نہیں ہوتی کیونکہ صحابہ کے تالیاں بجانے پر آپ نے نماز کو دہرانے کا حکم نہیں دیا، (۴) نماز پڑھنے والے کے اپنی جگہ سے تھوڑا آگے پیچھے ہٹ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، (۵) کوئی واقعہ نماز میں ہو تو تصفیق (تالیاں بجانا) عورتوں کے لیے ہے، (۶) اور مردوں کیلئے ایسی حالت میں تسبیح ہے، (۷) امام کو متوجہ کرنے کے لیے مقتدی کو تسبیح پڑھنا چاہئے، کیونکہ صحابہ نے حضرت ابو بکرؓ کو متوجہ کرنے کے لیے تالی بجائی تو انکو تسبیح کا حکم دیا گیا (۸) فضل وانعام کے موقع پر نماز کے اندر خدا کا شکر بجالانے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھانا مباح ہے،

اسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے اس طرز عمل پر آپ نے کوئی نکیر نہیں کی (۹) ایک ہی نماز میں کبھی کبھی مقتدی اور کبھی امام ہونا جائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھنا شروع کرے تو اسکے لئے درمیان میں امام کے ساتھ شامل ہوجانا اور اسکی اقتدا کرنا درست ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے نماز کے اندر آنحضور ﷺ کی اقتدا کر لی تھی۔ (۱۰) ایک ہی نماز میں دو اماموں کی اقتدا کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ صحابہ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں نماز شروع کی تھی۔ مگر پھر انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کر لی۔ (۱۱) حضرت ابوبکرؓ سے رسول اللہ کا یہ فرمانا کہ اپنی جگہ پر رہو یعنی امامت کرتے رہو کوئی واجبی اور لازمی امر (حکم) نہ تھا بلکہ یہ محض تعظیم و اکرام کے لیے تھا۔ کیونکہ اگر آپ کا حکم لازمی ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اسکی مخالفت نہ کرتے۔ (ج ۳ ص ۲۶۳ تا ۲۷۵)

قیاس استنباط و استخراج کی طرح امام بغوی نے قیاس سے بھی کام لیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ "تم میں سے جو لوگ ہمارے بعد زندہ رہیں گے۔ وہ بکثرت اختلافات دیکھیں گے، ایسی حالت میں تم لوگ میری اور خلفائے راشدینؓ کی سنتوں کی پیروی کرنا اور نئی نئی باتوں سے بچنا۔" امام بغوی نے پہلے اس کی تشریح کی ہے کہ:-

"اس میں رسول اللہ نے بدعتوں کے ظہور اور نفسانی خواہشات کے غلبہ و استیلا کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور یہ ہدایت کی ہے کہ ایسے پر آشوب زمانہ میں پوری مضبوطی اور کوشش سے میری اور میرے خلفا کی اقتدا کرنا اور ان چیزوں سے پرہیز کرنا جو ہماری سنت کے خلاف ہوں۔"

پھر اس فرمان نبوی کی روشنی میں ان کا قیاس ملاحظہ ہو:-

• اگر خلفاء راشدین میں سے کسی ایک قول کے خلاف دوسرے صحابہ کا قول ہو تو خلفاء راشدین ہی کے قول کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔"

ایک روایت میں نماز کے اندر سانپ اور بچھو کو مارنے کا ذکر ہے، اس سے پہلے تو وہ یہ استنباط کرتے ہیں کہ نماز میں تھوڑے عمل سے خلل نہیں ہوتا، اور ایک ہی موقع پر مسلسل دو بار کسی کام کو کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ بچھو ایک ضرب میں نہیں مرتا بلکہ عموماً دو تین ضربوں میں مرتا ہے، ایسی صورت میں نماز اسی وقت باطل ہوگی جب کوئی کام پے در پے کثرت سے کئی بار کیا جائے، علاوہ ازیں وہ سانپ اور بچھو پر قیاس کر کے ہر موذی اور ضرر رساں چیز جیسے بھڑ وغیرہ مارنے کو مباح قرار دیتے ہیں، صحابہ اور عام اہل علم نے سانپ اور بچھو کو نماز میں مارنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک یہ درست نہیں ہے، اور وہ اس کو نماز میں شغل سمجھتے ہیں جو ممنوع ہے، مگر بغویؒ کہتے ہیں کہ جب سنت نبوی موجود ہے تو اس کی پیروی کرنا ہی بہتر ہے۔ ایک حدیث میں اضاعت مال کو ان چیزوں میں بتایا گیا ہے جن سے اللہ ناراض ہوتا ہے، امام بغوی نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ان کی فقہی بصیرت اور قیاس میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"گناہ اور معصیت کے کاموں میں مال خرچ کرنے کو اضاعت مال کہا گیا ہے، اور یہی وہ اسراف ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے لیکن عمارتوں کی تعمیر میں فضول خرچی، بیجا آرائش و زیبائش اوڑھنے بچھونے اور ملبوسات میں میانہ روی سے تجاوز اور سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال وغیرہ بھی اضاعت مال میں داخل ہے، اگر کسی کے پاس غلام اور بار برداری اور سواری کے جانور ہوں اور وہ اس کی غفلت، بدتدبیری اور مناسب دیکھ بھال نہ کرنے سے ہلاک ہو جائیں تو یہ بھی اضاعت مال ہے۔ اسی طرح اگر دو شخصوں کے درمیان کوئی ایسی مشترک

چیز ہو جو تقسیم کر دینے کے بعد مفید اور قابل انتفاع نہ رہ جائے تو ایسی چیز کی تقسیم بھی اتلاف مال ہے جیسے تلوار، چھوٹا غسل خانہ اور چھوٹی چکی وغیرہ کیونکہ تقسیم کے بعد ان سب چیزوں کی منفعت باقی نہیں رہتی"۔ (جلد اول ص ۲۰۲)

حسن استدلال امام بغوی نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل بیان کیے ہیں ان میں قوت اور وزن بھی ہے، اور وہ حسنِ استدلال کا نمونہ بھی ہیں، ان کے طرز استدلال کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:۔

حدیث میں جمعہ کے دن غسل کرنے کو واجب بتایا گیا ہے (غسل یوم الجمعۃ واجب) وہ فرماتے ہیں کہ اس سے قطعی و لازمی وجوب مراد نہیں ہے جیسے ایک شخص اپنے ساتھی سے جب یہ کہتا ہے کہ تیرا حق مجھ پر واجب ہے (حقک علی واجب) تو اس کا مقصد ایسا قطعی اور حتمی وجوب نہیں ہوتا جس کو چھوڑنے کی مطلق گنجائش نہ ہو، اس کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت عثمانؓ تشریف لائے، حضرت عمرؓ نے باآواز بلند کہا کیا یہی آنے کا وقت ہے؟ انھوں نے جواب دیا امیر المومنین میں بازار سے لوٹا تو اذان سنی، اس کے بعد وضو کرکے چلا آرہا ہوں، ارشاد ہوا کیا تم نے صرف وضو پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم غسل کا بھی حکم دیتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر غسل واجب ہوتا تو حضرت عمرؓ کی تنبیہ کے بعد حضرت عثمانؓ واپس جاکر غسل کرکے آتے اور خود حضرت عمرؓ بھی ان کو غسل کے لیے نہ جاتے دیکھکر ضرور لوٹا دیتے۔

بعض جگہ انھوں نے احادیث کے غلط مفہوم کی تردید کرتے ہوئے بھی عمدہ دلائل تحریر کیے ہیں جیسے نماز کے بعد کی دعا میں یہ پڑھا جاتا ہے کہ (ولا ینفع ذا الجد منک الجد) اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جَد کا لفظ بفتح جیم ہے، اس کے معنی غنی، رزق اور حصہ ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ غنی کو اسکا غنا فائدہ نہ دیگا بلکہ نیک اعمال اس کے کام آئیں گے، یہی مفہوم قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون   جس دن (قیامت میں) نہ مال، کام آئے گا، اور نہ بیٹے۔
(شعراء ۸۸)

ابوعمرو کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کو جد (جیم کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور اس کے معنی اجتہاد فی العمل (سعی و کوشش) لیے ہیں لیکن یہ تاویل قرآن کے منشا کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالٰے نے تو مسلمانوں کو سعی و عمل کی دعوت دی ہے، چنانچہ فرمایا۔

واعملوا صالحا (مومنون ۵۱)   اور تم لوگ نیک کام کرو۔

اس آیت میں جد و کوشش اور عمل کا حکم دیا گیا ہے اور جب اللہ نے خود جد و عمل پر ابھارا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سعی و عمل انسان کے کام نہ آئیں گے۔" (ج ۳ ص ۲۲۶)

حکم و مصالح کا ذکر | امام بغوی نے اپنی شرح میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان کی ہیں، چنانچہ یہ جو حدیث ہے کہ تم لوگ تین مسجدوں (مسجد کعبہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ) کے سوا اور کسی جگہ کے لیے شد رحال نہ کرو، تو اسکی مصلحت یہ بتائی ہے کہ۔

"ان مساجد کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی مسجدیں ہیں اور اللہ تعالٰے نے ہم کو ان کے اقتدا کی تعلیم دی ہے، اس کا ارشاد ہے۔

فبھداھم اقتدہ (انعام ۹۰)   پس ان (انبیا) کی اقتدا کرو۔
(ج ۲ ص ۳۳۰)

رسول اللہ ؐ نے عقل و دانش والے لوگوں کو نماز میں اپنے قریب کھڑے ہونے کا حکم

دیا ہے، اس کی غرض یہ بتاتے ہیں۔

"عقلمندوں کو اپنے قریب رہنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ وہ آپ سے نماز کو سیکھیں اور سمجھیں اور اگر کوئی واقعہ پیش آجائے تو امامت میں آپ کی جانشینی کریں، ایک اور حدیث میں ہے کہ مہاجرین و انصار کا نماز میں آپ کے قریب ہونا آپ کو پسند تھا، تاکہ وہ آپ کی نماز کو محفوظ کر سکیں۔" (ج ۳ ص ۲۰۶)

ایک حدیث میں رسول اللہؐ کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ذکر ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسکی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کو بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ملی تھی اسلئے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کے پاؤں میں زخم تھا، اس لیے بیٹھنا آپ کے لیے دشوار تھا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ کے گھٹنوں میں تکلیف تھی اس لیے آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، اسکی تیسری وجہ امام شافعیؒ سے یہ منقول ہے کہ اہل عرب پشت کے درد کی بنا پر علاجاً بطور دوا کے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو بھی یہ تکلیف رہی ہو۔ ورنہ آپ کا عام معمول اور مالوف عادت بیٹھکر پیشاب کرنے کی تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ بیان کرے کہ رسول اللہؐ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اس کی بات نہ مانو اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ان کو آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو اس سے منع کیا لیکن ظاہر ہے یہ حکم تحریمی نہ تھا، بلکہ تادیبی تھا۔" (ج ۱ ص ۳۰۸)

کسوف شمس کے باب میں یہ روایت ہے کہ

ان الشمس والقمر آیتان من　　　　بیشک سورج اور چاند خدا کی نشانیوں

آیات اللہ میں سے دو نشانیاں ہیں۔

امام بغوی اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں سورج اور چاند گرہن کو کارخانہ عالم میں تغیر و انقلاب رونما ہونے کا سبب اور موجب خیال کرتے تھے جیسے کسی کی موت ہو جائے یا کوئی بڑا نقصان واقع ہو جائے تو سورج اور چاند میں گرہن لگتا ہے، رسول اللہؐ نے ان کے خیال کو باطل قرار دیا اور بتایا کہ درحقیقت چاند اور سورج گرہن خدا کی نشانیاں ہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ یہ دونوں خدا کی مخلوق اور اس کے تابع فرمان ہیں، ان کو نہ دوسروں پر کسی طرح کا اختیار ہے اور نہ یہ خود اپنی ہی مدافعت پر قدرت رکھتے ہیں، اسی لئے ان میں گرہن کے وقت آپؐ نے ذکر الٰہی اور نماز کی تلقین کی ہے، اس تعلیم کا مقصد ان جاہلوں کے باطل خیالات کی تردید ہے، جو ان مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے، اور ان کو دنیا کے واقعات و حوادث میں موثر سمجھتے تھے، ایسے وقت میں نماز اور ذکر کی تلقین سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود ہے کہ جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے سب اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، بعض علما نے ذکر و نماز کے حکم کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورج اور چاند قرب قیامت کی علامتیں ہیں جیسا کہ فرمایا۔

فاذا برق البصر وخسف القمر	تو جب آنکھیں پتھرا جائیں اور چاند
وجمع الشمس والقمر	گہنا جائے، اور سورج اور چاند یکجا
(قیامہ ۷-۹)	کر دئے جائیں،

یہ نشانیاں لوگوں کیلئے تنبیہ و تخویف کا سامان ہیں ان سے وہ توبہ اور استغفار کی جانب مائل ہوتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ ان کے ذریعہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے و ما نرسل بالآیات الا تخویفا (اسراء ۵۹) اور ہم نشانیاں صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجتے ہیں۔

اختلاف آراء و مسالک کا ذکر شرح السنۃ میں اہل علم کے مختلف آراء و مسالک ذکر کئے گئے ہیں، اور یہ فقہ و خلاف اور احکام و مسائل کا عمدہ ذخیرہ ہے، مگر اس میں صرف فقہی اختلافات ہی نہیں تحریر کئے گئے ہیں، بلکہ حدیثوں کی شرح و توجیہ اور دوسری نوعیت کے بھی اختلافات نقل کئے گئے ہیں پہلے شرح و توجیہ کے متعلق علمائے فن کے اختلافات کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے،

ایک متفق علیہ حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں (لا یزنی الزانی وھو حین یزنی مومن ولا یسرق السارق وھو حین یسرق مومن ولا یشرب الخمر وھو حین یشربھا مومن) اس کے مفہوم کی تعیین میں علمائے فن کے اختلافات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک گروہ کے نزدیک یہ بات اگرچہ بطور خبر بیان ہوئی ہے، لیکن اس سے نہی مقصود ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ مومن کو زنا کار، چوری کرنے والا اور شراب پینے والا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح کے گھناؤنے اعمال اس کے شایان شان نہیں ہیں، دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسا زجر و توبیخ کے لئے کہا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی واقعۃً دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، یا پھر اس کا مقصد انذار اور برے انجام سے ہوشیار کرنا ہو، ایسی صورت میں حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر آدمی ان معصیتوں کا عادی ہو جائے تو اس کے ایمان کے ضد یعنی کفر میں پڑ جانے کا خطرہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ "جو چراگاہ کے پاس اپنے جانور چرائے گا وہ قریب ہے کہ اس میں انکو داخل کر دے"

اس حدیث کا ایک مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ اس سے ایمان کا نقص اور کمی مراد ہے یعنی یعنی، زنا کار اور چور وغیرہ زنا اور چوری وغیرہ کے ارتکاب کے وقت مومن کامل نہیں رہتے بلکہ فجور کے اقدام سے پہلے اور تائب ہونے کے بعد مکمل ایمان والے ہوتے ہیں، جیسا

ایک دوسری روایت میں ہے،

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ بے امانت والے کے لیے ایمان نہیں'

اس روایت سے ایمان کامل کی نفی مراد ہے، ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے، تقریباً یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے، اور وہ اس کے اوپر چھتری کی طرح سایہ فگن رہتا ہے، چنانچہ جب وہ بدکاری سے باز آتا ہے تو ایمان اس کی طرف پلٹ آتا ہے۔ (ج اول ص ۹۰ و ۹۱)

بعض جگہ فنی اختلافات بیان کئے گئے ہیں، مثلاً نقل و روایت کے متعلق ائمہ فن کے مختلف اقوال ملاحظہ ہوں :-

"حدیث کے معنی و مفہوم (ہو بہو رسول اللہؐ سے منقول الفاظ کو نقل کرنے کا اہتمام نہ کیا جائے بلکہ راوی صرف آپؐ کے مفہوم و منشا کو بیان کر دے) کی نقل و روایت میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک جماعت اس میں رخصت کی قائل ہے۔ واثلہ بن اسقع فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ تم لوگوں سے حدیث کے معنی و مفہوم کو بیان کر دیں تو اسے کافی سمجھو، حسن شعبی اور نخعی کا بھی یہی خیال ہے۔ ابن سیرین سے روایت کی گئی ہے کہ "میں دس آدمیوں سے حدیث سنتا ہوں لیکن ان کے الفاظ مختلف ہوتے ہیں، مگر معنی یکساں ہوتا ہے"، مجاہد کا قول ہے کہ "اگر چاہو تو حدیث کے مفہوم میں کمی کر دو، مگر اس میں کوئی اضافہ نہ کرو" سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں" اگر میں تم سے کہوں کہ میں نے بعینہٖ اسی طرح حدیث بیان کی ہے جیسے میں نے اسکو سنا تھا تو تم لوگ میری بات نہ ماننا کیونکہ روایت تو بالمعنی ہوتی ہے"، وکیع کا بیان ہے کہ اگر معنی کے نقل و بیان کی

گنجائش نہ ہوتی تو لوگ سخت دشواری میں پڑ جاتے۔

دوسری جماعت کے نزدیک لقاء و معاصرت کے ساتھ لقی مثابت ضروری ہے، یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن جبیرؒ، رجاء بن حیوۃؒ، مالک بن انسؒ، ابن عیینہؒ، یزید بن زریعؒ، اور وہیبؒ کا قول ہے، امام احمدؒ اور یحییٰؒ بن معین کی بھی یہی رائے ہے۔" (جلد اول ص ۲۳۶ و ۲۳۸)

اسی بحث میں آگے چلکر انھوں نے شیخ کے سامنے قرأت و عرض اور مناولت و مکاتبت کے جواز و عدم جواز کے متعلق علمائے فن کے مختلف آرا تفصیل سے نقل کئے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہ بحث قلم انداز کی جاتی ہے، رہے فقہی اختلافات تو ان سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے، ذیل میں فقہی اختلاف کی صرف ایک مثال دی جاتی ہے تاکہ اس لحاظ سے بھی کتاب کی خصوصیت سامنے آجائے جو چیز آگ پر پکی ہوئی ہو اسکو کھانے سے وضو لازم ہے یا نہیں، اس کے متعلق صحابہ و تابعین اور فقہائے امصار کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

"آگ پر پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو ضروری نہیں ہے، یہی خلفائے راشدین اور اکثر اہل علم صحابہ و تابعین وغیرہ کا مسلک ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک اس کی وجہ سے وضو ضروری ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ شکر کھانے کے بعد وضو کرتے تھے، ان لوگوں کا استدلال حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت پر مبنی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز آگ سے پکی ہو اس کو کھانے کے بعد وضو کر لیا کرو خواہ یہ پنیر ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔۔

مگر حضرت جابرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری معمول یہ تھا کہ وہ آگ سے پکنے والی چیز کھانے کے بعد وضو نہیں کرتے تھے، اور ابن عمرؓ سے جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ وضو اسوقت لازم ہوتا ہے جب کوئی چیز آدمی کے جسم سے خارج ہو لیکن اگر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو تو وضو نہیں، کیونکہ آدمی کے جسم میں پاکیزہ

اور معدہ چیز جاتی ہے اور ناپاک اور خراب چیز اس سے خارج ہوتی ہے،

محدثین کی ایک جماعت نے خاص طور پر اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کو ضروری قرار دیا ہے، امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے اور ان دونوں بزرگوں نے حضرت براءؓ ابن عازب کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا جائے گا تو آپؐ نے فرمایا ہاں! اور جب بکری کے گوشت کھانے سے وضو کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے کہا نہیں! اسی طرح جب آپؐ سے اونٹوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے کہا وہاں نماز نہ پڑھو لیکن جب بکریوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ہاں وہاں پڑھ لو۔

مگر عام فقہا نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد بھی وضو کو لازمی نہیں قرار دیا ہے، یہ لوگ حدیث کو نظافت کیلئے صرف ہاتھ اور منہ دھونے پر محمول کرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے دودھ پینے کے بعد کلی کیا اور فرمایا کہ اس میں چکناہٹ اور چربی ہوتی ہے، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ کھانے کے پہلے وضو کرنے سے فقر و فاقہ دور ہوتا ہے اور کھانے کے بعد وضو کرنے سے گناہ زائل ہوتے ہیں لیکن غالباً وضو سے انکی مراد دونوں ہاتھ دھونا ہے، قتادہؒ کا بیان ہے کہ جس نے اپنے ہاتھ دھوئے اس نے گویا وضو کیا۔

اس سے اور دوسری مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ محدثین اور مشاہیر علماء و فقہا کے اقوال نقل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں،

بعض جگہ مختلف مذاہب و مسالک تحریر کرنے کے بعد مصنف اپنی مرجح رائے بھی بیان کرتے ہیں، وہ شافعی المذہب تھے اسلئے امام شافعیؒ کے اقوال زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں، اور عموماً اسی کو مرجح بھی قرار دیتے ہیں، لیکن کہیں کہیں اس مسلک کو ترجیح دیتے ہیں، جو حدیث و سنت کے زیادہ قریب اور موافق ہوتا ہے۔ (باقی)

عرفی شیرازی کا ایک مطبوعہ قصیدہ

از ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری، لکھنؤ،

قصائد عرفی شیرازی، مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ میں، ۱۱۹ تا ۱۲۱ صفحات پر عرفی شیرازی کا ایک قصیدہ "در منقبت جناب امیر علیہ السلام" کے عنوان سے ملتا ہے[1] جس کا مطلع ذیل میں درج ہے،

تبارک اللہ ازین آسمان شتاب درنگ
کہ نعل آئینہ رخش ندید رنگ درنگ

اس مطلع کے بعد گیارہ "اور اشعار ہیں جن میں اُسی "آسمان شتاب درنگ" کی تعریف کی گئی ہے جس کا ذکر مطلع میں ہے۔ ان بارہ اشعار کے بعد پھر ایک مطلع ہے جو یہ ہے،

منم کہ شیشہ ام از لوح مدعا بیرنگ
نہ تشنگی کش آبم نہ آرزو چش رنگ

اس مطلع کے بعد پچیس اور اشعار ہیں جن کے بعد قصیدہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ قصیدہ نولکشور پریس سے شائع شدہ قصائد عرفی اور غلام حسین جواہری کے مرتب کردہ تہران سے شائع ہونے والے کلیات عرفی کے نسخوں کے علاوہ چند دوسرے اہم خطی نسخوں میں بھی میری نظر سے گذرا، ان میں سب سے اہم کلیات عرفی کا وہ نسخہ ہے جو خانخاناں کے کتب خانہ میں کلام عرفی کے مسودات کے چوری ہو جانے کے بعد ناظم تبریزی نے ۱۰۲۳ھ میں مرتب کیا تھا، اس نسخہ میں نیز دوسرے اہم نسخوں میں بھی، جن میں خانخاناں عبدالرحیم کے حکم سے اور محمد قاسم سراجا کی کوشش سے مرتب شدہ کلیات عرفی کی نقلیں بھی شامل ہیں، اور قصائد عرفی کی مختلف

---

[1] غلام حسین جواہری کے ترتیب دادہ نسخہ کلیات عرفی مطبوعہ تہران میں یہ قصیدہ صفحات ۳۰ تا ۴۰ پر ملتا ہے،

شروع میں قصیدہ اسی طور سے پایا جاتا ہے، جیسے مذکورہ مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے، سوائے اسکے کہ ان نسخوں میں ترتیب و تعداد اشعار مطبوعہ نسخوں سے کچھ مختلف ہے،

عرفی کے زمانۂ حیات میں کلیات عرفی مرتب نہ ہو سکا تھا، اور عرفی کے انتقال کے بعد جن مسودات کی بنیاد پر کلیات عرفی مرتب ہوا ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ بہت ہی ابتر حالت میں تھے۔ مسودات کی اسی پراگندگی کی وجہ سے جو کلیات مرتب ہوا، اس میں متعدد قصائد کے اشعار خلط ملط ہوگئے، اور کئی قصیدوں میں ایسے اشعار شامل ہوگئے ہیں جو حقیقتاً ان قصائد کے نہیں ہیں، اور انھیں ان ہی زمینوں میں دوسرے قصائد میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ راقم الحروف کو مذکورۂ بالا قصیدہ بھی ...... ایسی ہی ایک نظم معلوم ہوتا ہے، جس میں دو مختلف قصیدوں کے اشعار خلط ملط ہوگئے ہیں، اور اس بے ترتیبی کی وجہ سے قصیدہ کا وہ حسن باقی نہیں رہ گیا جس کی عرفی جیسے شاعر سے امید کی جا سکتی ہے۔

یہ قصیدہ جیسا کہ مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے کسی آسمان شتاب گھوڑے کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے ابتدائی بارہ اشعار اسی "آسمان شتاب کرنگ" کی تعریف میں ہیں ان اشعار کے بعد مطلع ثانی اور اس کے بعد نو دوسرے اشعار شاعر کی اپنی فطرت و طبیعت سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد گریز کا ایک شعر ہے، جس کے بعد مدح کے پندرہ اشعار ہیں اور مندرجۂ ذیل شعر پر قصیدہ ختم ہو جاتا ہے،

بزود تر بکف آرم عنان معنی را ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ہیبت تو رباید ز روی اعدا رنگ

یہ آخری شعر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اسے قصیدہ کا آخری شعر نہ ہونا چاہئے، بلکہ اس کے بعد کچھ اور شعر بھی ہونگے جو اب کسی نسخہ میں نہیں ملتے۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار کہے ہی نہ گئے ہوں۔

قصیدہ مذکورہ کے اشعار کی وہ ترتیب جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، درست نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ گھوڑا (خواہ وہ براق ہی کیوں نہ ہو) کی تعریف سے اگر کسی قصیدے کی ابتدا کی جائے تو اس کے بعد اپنی طبیعت کے متعلق اشعار اور ان کے بعد گریز و مدح کچھ بے معنی سے معلوم ہوتے ہیں، ان حالات میں دو ہی باتیں ممکن معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ قصیدہ کے ابتدائی بارہ اشعار جن میں "آسمان شتاب کرنگ" کا ذکر کیا گیا ہو کسی ایسے قصیدہ کی تشبیب ہے، جو براق یا کسی اہم شخصیت کے گھوڑے کی تعریف میں کہا گیا، اور یہ قصیدہ محض تشبیب کے مندرجہ ذیل شعر تک پہونچ کر نامکمل ختم ہو جاتا ہے۔

منش معارج اذکار گفتم و خجلم | ز بہر آنکہ نہ راضی بود ز رنگ برنگ

اور ان ابتدائی بارہ اشعار کا تعلق بعد کے چھبیس اشعار سے قطعاً نہیں ہے جو مندرجۂ ذیل مطلع سے شروع ہوتے ہیں۔

منم کہ شیشہ ام از لوح مدعا بیرنگ | نہ تشنگی کش آبم نہ آرزو چش رنگ

اور یہ بعد کے چھبیس اشعار کسی دوسرے ہی قصیدہ کے اشعار ہیں جو پہلے قصیدہ کی طرح نامکمل رہ گیا، دوسرے یہ کہ یہ قصیدہ (اگر اسے ایک ہی قصیدہ سمجھا جائے۔) اصل میں دوسرے مطلع سے شروع ہوتا ہے، اور گھوڑے کی تعریف میں بارہ اشعار اس کے آخری اشعار ہیں۔

قصیدۂ مذکور کی مندرجۂ بالا ترتیب یا تقسیم کا میرا خیال اس وقت تک محض گمان ہی رہا۔ جبتک کہ کلیات عرفی کا ۱۰۰۰ھ کا نقل شدہ ایک نہایت ہی اہم نسخہ میری نظر سے نہ گذرا۔ اس نسخہ (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے) میں راقم الحروف کو یہ قصیدہ دو حصوں میں دو مختلف صفحات پر نظر آیا۔ ایک جگہ اس کے ابتدائی چودہ[1] اشعار جو مطلع ذیل

---

[1] نسخہ مطبوعہ میں اس حصہ کے آخر دو دعائیہ اشعار موجود نہیں ہیں۔

تبارک اللہ ازاں آسمان شتاب کرنگ — کہ نعل آئینہ رنگش ندید زنگ درنگ

سے شروع ہو کر ذیل کے دعائیہ شعر پر ختم ہوتے ہیں

شگفتہ باد بہ دیت گل بہار نشاط — حسود جاہ تو چون غنچہ باد با دل تنگ

اور دوسری جگہ اس مطبوعہ قصیدہ کے بقیہ ۲۶ اشعار پائے گئے جن کے آخر میں بطور مطلع ثانی اس قصیدہ کا پہلا مطلع بھی آخری شعر کی حیثیت سے نظر آیا۔ اس نسخہ میں اس مطبوعہ قصیدے کے دونوں حصوں کے الگ الگ تحریر ہونے سے جہاں ان کے دو مختلف قصیدوں کے حصہ ہونے کے خیال کو تقویت پہونچتی ہے وہیں دوسرے مطلع سے شروع ہونے والے حصہ کے اختتام کے بعد مطلع اول کی موجودگی اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ قصیدہ کا وہ حصہ جو مطلع دوم سے شروع ہوتا ہے قصیدہ کا ابتدائی حصہ ہے اور مطلع اول سے شروع ہونے والا حصہ اس کا آخری حصہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کے بنور مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ ان بارہ یا چودہ اشعار سے پہلے یقیناً ایسے کچھ اشعار ہوں گے جو مطلع ثانی کے بعد کے اشعار میں سے آخری شعر کو ان بارہ اشعار کے ابتدائی شعر یعنی مطلع

تبارک اللہ ازاں آسمان شتاب کرنگ — کہ نعل آئینہ رنگش ندید زنگ و رنگ

سے مربوط کرتے ہوں لیکن ایسے اشعار کسی بھی نسخہ میں نہیں ملتے۔

جہاں تک اس قصیدہ کے ممدوح کا تعلق ہے نسخہ تہران اور نسخہ نولکشور، دونوں کے عنوانات سے وہ حضرت علیؑ کی منقبت میں معلوم ہوتا ہے، لیکن کسی بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ میں قصیدہ کے متن سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا، خوش قسمتی سے اس مسئلہ کو محمد شفیع سنبھلی نے اپنی شرح قصائد عرفی "کارنامۂ فیض" میں حل کر دیا اور اس قصیدہ کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے حسب ذیل شعر۔

بی گچھ نبود زنگ دار آئینہ   کہ صیقلی کندش ماہ شہ یاد فرہنگ

کے بعد مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر کیا ہے، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ (یا اس کا وہ حصہ جو مطلع ثانی کے بعد ہے) رسول اکرمؐ کی نعت میں ہے نہ کہ حضرت علیؓ کی منقبت میں۔

محمد عربی آنکہ آورند خراج   شہان روم و خراسان و چین و ہند و فرنگ

یہ بات صاف ہو جانے کے بعد کہ اس قصیدہ کے دوسرے مطلع کے بعد کے اشعار نعت رسول میں ہیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر پہلے مطلع سے شروع ہونے والے چودہ اشعار اسی قصیدہ کے آخری اشعار ہیں، تو وہ براق کی تعریف میں ہونگے لیکن اس حصہ کے آخری دو اشعار جو صرف علی گڑھ کے مخطوطہ کلیات عرفی میں ملتے ہیں، اس خیال کی تردید کرتے ہیں، اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ ممدوح کوئی ایسی ہستی ہے جو شاعر کے زمانہ میں موجود تھی اور جس کا دنیاوی جاہ و جلال ایسا تھا جس پر لوگ حسد کر سکتے تھے، یہ دونوں اشعار درج ذیل ہیں۔

ہمیشہ تا بود از اقتضائے لیل و نہار   بچار باغ عناصر گل امل صد رنگ

شگفتہ باد بر دیت گل بہار نشاط   حسود جاہ تو چون غنچہ باد با دل تنگ

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں راقم الحروف کو یہ یقین ہے کہ مذکورہ قصیدہ ایک مکمل قصیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہی زمین میں کہے گئے دو مختلف نامکمل قصیدوں کے اشعار کا مجموعہ ہے، جس کے ابتدائی چودہ اشعار کسی امیر یا بادشاہ کے گھوڑے کی تعریف میں نظم کیے گئے ہیں (اور یہی اشعار اس نامکمل قصیدہ کی تشبیب ہیں) اور بقیہ چھبیس [26] اشعار جو مطلع ثانی سے شروع ہوتے ہیں نعت رسول میں کہے گئے ایک دوسرے نیم غیر مکمل قصیدہ کا جز ہے۔

مختلف نسخوں کے تقابل سے مطبوعہ نسخوں میں اس قصیدہ کے تحت شائع ہونے والے اشعار میں کچھ اغلاط اور لفظی اختلافات بھی سامنے آئے۔ ان کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ان دونوں

غیر مکمل قصیدوں کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قصیدہ اوّل

منم که شسته[1] ام از لوح مدعا نیرنگ[2] | نه تشنگی کش آبم نه آرزو چش رنگ
شکسته کشتی و بی ساحل است بحر کجاست | شناوری که تواند گریختن ز نهنگ
چه سود در شکنم با سپهر مینائی | نه زور در خم بازو نه در بغلم سنگ
بزیر سایهٔ طوبی غنوده ام یعنی | نه در عنان شتابم نه در رکاب درنگ
بچار بالش تسلیم تکیه کرده مدام | تبسمی نه بصلح و کنایتی نه بجنگ
صنم بجیب نه دخیزم از در اسلام | ردا بدوش نه بگذرم ز شهر فرنگ
بکعبه نغمهٔ ناقوسم آورد بسماع | نماز شب[3] نکنم گر قضا شود از ننگ
اگر سرود صمد جوشد از لبم در دیر | نفس همی شکنم در گلوی سینه تنگ
برنگ بادیه نیم آلوده زان سبب دورم | ز گلفروشی ایام و شکسته رنگی ننگ
نه در مذاق من از جوش عافیت لذت | نه بر جبین من از نیش محنتی آژنگ
ز ذوق لب نگزم گر بشهد غوطه زنم | نریزم آب دهان گر فرو بردم شرنگ
هجوم دعوی من در تساوی اضداد | کنایتیست که آئینه ام ندارد زنگ
بلی چگونه بود زنگ دار آئینه | که صیقل کندش رای شاه با فرهنگ
محمد عربی آنکه آورند خراج | شهان روم و خراسان و چین و هند و فرنگ
شهی که صیقل رای هدایت افروزش | چنان زدوده ز آئینها کدورت زنگ

---

[1] ن شیشه / شسته [2] ن بیرنگ / نیرنگ [3] ن نماز بت / نماز شب

که پرده شاهد ایمان بجز الحسن بصر　　سیاهی از شکن زلف بتان فرنگ
مطر فشان شود از ابر لطف او بر کوه　　شود چو آب درآید بزیر صفحهٔ سنگ
آیا شهی که به دل گرمی حمایت تو　　برد سه بیضهٔ شاهین نشسته ماده کلنگ
بگوه جاه تو جوید زمانه نسبت از آن　　ز نور و سایه کند جلوه در لباس پلنگ
اگر دهی به ضمیرت عنان نظم امور[۱]　　رود به صنعت روشنگری طبیعت زنگ
بعون عینک رای تو اعمی فطری　　کند مشاهده از نغمه صورت آهنگ
نگاشتند برای نمونه صورت دهر　　جهان جاه ترا می زدند چون نیرنگ[۲]
محیط عالم جاه تو دارد آن وسعت　　که بر شکوه الهیش هست دایره تنگ
زهی محال چو حفظت به بحر خیمه زند　　که بعد ازین شکند زورقی در آب نهنگ
اگر نه طبع تو محمل طراز بودی کی　　عروس علم نشستی بهودج فرهنگ
دل سیاه عدوی ترا اگر گویند　　که نسبتی به سپهرش بود به هیبت و رنگ
برون زدند عناصر عصیر وش ز فلک　　ز بسکه دایرهٔ آسمان بگردد تنگ
فروغ شعلهٔ قهرت چو در رحم افتد　　به چشمه زار بزاید سمندر از خرچنگ
نمود و تو بکف آرم عنان معنی را　　که هیبت تو ربایه ز روی اعدا رنگ

قصیدہ دوم

تبارک الله ازان آسمان شتاب کرنگ　　که نعل آئینه رنگش[۳] ندیده زنگ درنگ[۴]
درین هوس که رود همعنان مگر نفسی　　شبانه روز زند شاطر سپهر شلنگ

---

۱ آموز/امور　۲ ن نیرنگ/بیرنگ　۳ ن رویش/رنگش　۴ ن روی/رنگ/ز

اگر بہ ساحتِ میدانِ او درآید غم
دگر کشادہ شود از ہجومِ غم دلِ تنگ

سبک روی کہ چنان بر دود چو زخمہ بتار[۱]
کہ نغمہ لب نکشاید بہ عرصۂ آہنگ

جہندہ اے کہ بگاہِ جہندگی شاید
کہ جوہر تنش آید بروں ز جامۂ رنگ[۲]

اگر کند مثلِ طیِ ساحتِ[۳] اضداد
ز طبعِ شہد بگامی[۴] رود بطبعِ شرنگ

دگر کنند بوے نسبت درنگ بسہو
شتاب فہم شود بعد ازیں ز لفظِ درنگ

زمانہ گفت زہی آسمانِ قوسِ قزح
بزیرِ سینۂ او چون بدید رنگیں تنگ

ستارہ گفت کہ اینک سپہر و چشمۂ مہر
نشانۂ سمِ او دید چوں بروی نہنگ

حبابِ طولِ امل[۵] در فضاے میدانش
چو عرصۂ ابد است و شمارۂ فرسنگ

خرد عرایس افکار گفت و منکر شد
ز بہر آن کہ نہ راضی بود ز رنگ بہ تنگ

منش معارج افکار گفتم و خجلم
ازان کہ دارد ازین نام ہم بغایت ننگ

ہمیشہ تا بود از اقتضاے لیل و نہار
بہ چار باغِ عناصر گلِ امل صد رنگ

شگفتہ باد بہ ویت گلِ بہارِ نشاط
حسود جاہ تو چون غنچہ باد با دلِ تنگ

۱؎ ن: زخمۂ ساز / بہ زخمۂ تار / چو زخمہ بتار ۲؎ ن: تنگ / رنگ ۳؎ ن: طی مساحت / طیِ ساحت ۴؎ ن: بکامی / بگامی ۵؎ ن: عمل / امل

شاہ صاحب کی وفات پر تعزیتی تار اور خطوط

ہندوستان کے ہر حصہ مین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین اور اڈیٹر معارف کے انتقال پر ملال پر اظہار غم کیا جارہا ہے، برابر تار خطوط اور تعزیتی تجویزیں موصول ہورہی ہیں جن کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے کارکنان دارالمصنفین ایسے تمام لوگوں اور اداروں کے بیحد ممنون ہیں، جو اس حادثہ جانکاہ پر اس کے غم میں برابر کے شریک ہین، ص ۔ ع

ذیل میں ان میں سے کچھ تار خطوط اور تعزیتی تجاویز درج کی جاتی ہیں،

تار

حسب ذیل حضرات کے تعزیتی تار اب تک موصول ہوئے ہیں،

(۱) قائم مقام مہتمم دارالعلوم دیوبند، (۲) مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، (۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ و نامزد سفیر شام (۴) مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر برہان دہلی، (۵) جناب عبید الرحمن خان صاحب شروانی، علی گڈھ، (۶) مولانا حافظ عمران خان صاحب ندوی ناظم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال (۷) مولانا اسرار الحق صاحب ناظم جمعیۃ علماے ہند دہلی، (۸) مولانا محمد اویس ندوی نگرامی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء لکھنو، (۹) جناب سعید انصاری صاحب سابق پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ دہلی، (۱۰) جناب ابرار مصطفےٰ صاحب صدر شعبۂ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

علماء کے خطوط

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۴ء تکیہ کلاں، رائے بریلی،

برادر مکرم و محترم زید لطفہٗ		السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

حادثۂ جانکاہ پر آپ کو کچھ لکھنے کی ہمت ہے نہ طاقت نہ زبان و قلم ساتھ دیتے ہیں آپ پر اس وقت جو کیفیت طاری ہوگی، اس کے پیش نظر کچھ لکھنا بھی تکلیف دیتا ہے، پھر ایک غم زدہ دوسرے غم زدہ سے کیا تعزیت کرے، البتہ آپ سے جلد سے جلد ملنے کی خواہش بڑھ گئی ہے، کہ اپنی کہہ کر اور آپ کی سن کر، دل کا بوجھ ہلکا کیا جائے، معلوم نہیں، آپ نے کیا سوچا ہے، اور کیا پروگرام بنایا ہے، میں اور مولانا عمران خاں صاحب دونوں منتظر ہیں، واقعہ اس طرح گذر گیا، جیسے کوئی خواب دیکھا ہو، اس وقت کسی طرح یہ چند ٹوٹے پھوٹے فقرے لکھ رہا ہوں آپ کیلئے صبر و سکون کی دعا کر رہا ہوں، کہ حادثہ سخت ہے، اور آپ بڑی حساس طبیعت اور درد مند دل رکھتے ہیں۔

والسلام

منو ضلیع اعظم گڈھ		ابوالحسن علی ندوی،

۵ر ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب زید لطفکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

میں سفر میں تھا، واپسی پر یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ شاہ صاحب کا جمعہ کو انتقال ہوگیا، یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا، لیکن اخبار منگوا کر پڑھا تو دل پر ایک بجلی سی گری، اور زبان پر انا للہ و انا الیہ راجعون جاری ہوا، شاہ صاحب سے اخلاص و مودت کا رشتہ آپ کے دارالمصنفین آنے سے پیشتر سے قائم تھا، کھانے کی اجتماعی مجلس جب شبلی منزل میں ختم ہوگئی، تو سید صاحب

مرحوم کی عدم موجودگی میں جب میرا جانا ہوتا تھا، تو شاہ صاحب کے ساتھ کھایا کرتا تھا، مرحوم بہت نیک دل، پاکیزہ سیرت، اور علم دوست تھے، میرے دل میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی حق تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، دارالمصنفین میں ان کی جگہ مشکل سے پر ہوگی مین اگر مئو میں ہوتا اور خبر پاتا تو نماز جنازہ میں ضرور شریک ہوتا، ان کی وفات کے بعد صدمہ کے علاوہ مجھے اس کا بھی قلق ہے۔

الہمکم اللہ الصبر و اعظم لکم الاجر و غفر لمیتکم

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

مدرسہ بند ہے کھلنے کے بعد مرحوم کی روح کے لیے ایصال ثواب کی سعادت بھی حاصل کی جائیگی۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء - لکھنؤ

محترمی و مکرمی جناب مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب احسن اللہ الیکم

سلام و رحمت

پرسوں شنبہ کے دن ۱۲ بجے کے بعد "قومی آواز" کے اڈیٹر عشرت صاحب نے ٹیلیفون کیا، اور شاہ صاحب کے سانحہ کی اطلاع دی، چونکہ بیماری وغیرہ کی کوئی خبر نہیں سنی تھی، اس لیے مین نے ان سے کہا کیا خبر قابل اعتبار ہے؟ انھوں نے بتایا کہ، دہلی سے ابھی آنے والے ایک صاحب نے بتلایا ہے، خبر مصدق ہے، یقین کر لینا پڑا، تفصیل کوئی معلوم نہ تھی،

کل شام دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے ایک عزیز نے حادثہ کی وہ تفصیل بتلائی جو ان کو معلوم ہوئی تھی، واقعہ یہ ہے، کہ شاہ صاحب کے اسطرح جانے پر بڑا ہی رشک آیا، اس موت کے ہزار زندگیاں قربان، بظاہر تو اعلیٰ درجہ کی مقبولیت کی نشانی ہے، پچھلے سال ان دنوں

ہو۔ ہم مصنفین اور پھر مدینہ طیبہ میں ساتھ رہا، رات کا کھانا ہم سب شیخ الحدیث کے دسترخوان
پہ کھاتے تھے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلسۂ تعزیت کی بات یاد ہے، آپ کے ضعف قلب
اور شدت تاثر کا اندازہ ہے، آپ پر جو گذری ہو کم ہے، معلوم ہوا کہ آپ کا یہ حال ہوا کہ دہلی
آنے کے قابل بھی نہ رہے، اور نہ آسکے، اللہ تعالے شاہ صاحب کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص
معاملہ فرمائے، اور آپ سب حضرات کو اور ملت و امت کو ان کا قائم مقام دے۔
ولیس علی اللہ بعزیز۔

حضرت سید صاحبؒ کے بعد بالکل امید نہ تھی کہ دار المصنفین کا کام اسی طرح جاری رہے گا،
لیکن اللہ تعالے نے آپ دونوں حضرات سے کام لے لیا، وہی قادر مطلق اب بھی ہے، اس کی
رحمت سے پوری دستگیری کی امید ہے۔

آج کل تعزیت ناموں کی کثرت ہوگی، میرے اس عریضہ کے جواب بلکہ رسید کی بھی
ضرورت نہیں، خدا کرے آپ کو یہ مل جائے۔ اور بس

ندوۃ المصنفین۔ دہلی، والسلام۔ محمد منظور نعمانی

۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ء

مخلصم و محترم جناب سید صباح الدین صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

۱۴ دسمبر کی شب بھی کتنی ہولناک تھی کہ یہ یک وقت دو مخلص اور لائق ترین دوستوں کی
دائمی جدائی کی خبر لائی، بیرسٹر نور الدین احمد تو یہیں آنکھوں کے سامنے رخصت ہوئے، اور
شاہ معین الدین صاحب مرحوم کی خبر ریڈیو سے سنی، انا للہ و انا الیہ راجعون، ان

دونوں صدموں سے دل و دماغ ہل گئے۔

اس وقت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایک خصوصیت آنکھوں میں گھوم رہی ہے، متین، سنجیدہ، باوقار، شگفتہ، متواضع، سادہ مزاج، دل غبار اور ہر قسم کی تمکنت سے پاک ایسی مٹی سے بنے تھے جس میں غبار کا نام نہیں تھا، مستند عالم دین اور اعلیٰ درجے کے مصنف، بلند پایہ مورخ اسلام، ان کی کن کن خوبیوں اور کمالات کو یاد کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرحوم اپنے رنگ میں منفرد تھے، بارہا ارادہ ہوا کہ ان کی زندگی میں دو چار روز شبلی منزل میں بسر ہوں اور لطف صحبت اٹھایا جائے، کون کہہ سکتا تھا کہ اس قدر جلد اور اتنی عجلت میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہم لوگوں کو تو ان کی علالت کا بھی علم نہ ہوا، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مرحوم نے اور آپ نے جس محنت و کاوش اور جس قابلیت سے دار المصنفین کو زندہ رکھا اس کا اعتراف نہ کرنا صریح ناانصافی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور آپ اس صدمہ کو برداشت کر سکیں، مرحوم کے صاحبزادے کہاں ہیں، موقع ملے تو ان کا پتہ تحریر فرمائیں، روحوں کی مناسبت بھی عجیب چیز ہوتی ہے، ہماری روحوں میں یہ مناسبت موجود تھی، رہ رہ کر آپ کی تنہائی کا خیال آرہا ہے، اللہ تعالیٰ صبر و استقامت کی دولت سے نوازے، تار مل گیا ہوگا، کارکنان ندوۃ المصنفین کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں، میں نے از راہ تعلق خاص مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے اور ایصال ثواب بھی

فقط۔ والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ
نئی دہلی۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۴ء

محب محترم و مکرم السلام علیکم

میں ۱۴ کو ہوائی جہاز سے حیدر آباد گیا تھا، وہاں سے واپس پہنچتے ہی شاہ صاحب کی خبر وفات

اچانک سنی، تو قلب و دماغ پر بجلی گر پڑی، اس حادثہ عظیمہ پر آپ سے زیادہ تعزیت کا حقدار کون ہو سکتا ہے، اس لیے کل مفتی صاحب اور میں آپ کے نام دفتر برہان کی طرف سے ایک ٹیلیگرام بھیج چکے ہیں، اور میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔

بھائی! شاہ صاحب (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم لرز رہا ہے) کی وفات حسرت آیات اسلامیات اور علم و ادب کا اتنا بڑا حادثہ ہے، کہ اسکی تلافی مشکل ہے، دارالمصنفین کی محفل سونی ہو گئی، معارف کا چراغ گل ہو گیا، اور شبلی و سید کے چمن پر خزاں آگئی، آپ کے عمر بھر کے رفیق، ہمدم و دمساز تھے، اب آپ تنہا رہ گئے، میں اندازہ کر سکتا ہوں، کہ اس وقت آپ کی حالت کیا ہوگی، لیکن یقین کیجئے میرے لیے بھی مرحوم کی ناگہانی وفات ایک حقیقی بھائی کی موت ہے، جب سے یہ خبر سنی ہے، طبیعت بے قرار اور بے چین ہے، اور آنکھوں میں مرحوم ہی کی تصویر سی ہوئی ہے، ہائے کن کن خوبیوں اور اوصاف و کمالات کے انسان تھے، صباح الدین صاحب، مجھکو ان سے والہانہ محبت تھی، اور ان کو مجھ سے، آپ نے اگر معارف کا کوئی نمبر ان کی یادگار میں نکالا تو میں اس میں ضرور شریک ہوں گا، اسوقت شاید اپنے جذبات قلم بند کر سکوں، اسوقت سمجھ میں نہیں آتا، کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں، برہان میں ایک نوٹ لکھ کر بھیج چکا ہوں، یہ تصور کر کے کلیجہ شق ہوتا ہے، کہ اب دارالمصنفین اور معارف کی ساری ذمہ داریاں تنہا آپ کے سر پر آپڑیں، دعا ہے کہ اللہ تعالٰے شاہ صاحب مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور آپ کو صبر و استقامت کی توفیق عطا ہو، (آمین ثم آمین) اس پر اکتفا کرتا ہوں، باقی پھر،

والسلام

آپ کا شریک غم

سعید احمد اکبر آبادی

جماعت اسلامی ہند

دہلی برادر محترم السلام علیکم، ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

شاہ معین الدین صاحب مرحوم کے انتقال پُرملال سے جو صدمہ آپ کو پہنچا ہوگا، اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ کے عمر بھر کے رفیق تھے، موصوف نے جو خدمات انجام دیں ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید رکھنی چاہئے کہ وہ ان کو فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا،

اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، براہ کرم ہم لوگوں کی طرف سے مرحوم کے ورثاء کی خدمت میں سلام اور تعزیت پیش فرمادیں۔

والسلام محمد یوسف

برادر محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

محترمی مولانا شاہ معین الدین صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین!

براہ کرم ہم سب اہالی مرکز کی طرف سے موصوف کے متعلقین کی خدمت میں سلام اور تعزیت کا پیغام پہنچائیے، اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین!

اور ہم سب کو اس منزل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

والسّلام قائم مقام قیم جماعت

پھلواری شریف۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی جناب صباح الدین صاحب زید مکارمکم،

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ پٹنہ کے ایک مقامی اخبار میں شاہ معین الدین احمد صاحب کے بارے میں

ایسی خبر شائع ہوئی ہے، جس کو یقین کرنے کو دل کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا ہے، اور موصوف کو اصطلاحاً مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرا رہا ہے۔

آپ سے دریافت کر رہا ہوں، کہ کیا یہ خبر صحیح ہے، چونکہ اس سے پہلے موصوف کی علالت یا کسی طرح کی ناسازی طبیعت کی اطلاع نہیں تھی، اور کسی اور اخبار سے اس کی تصدیق بھی نہ ہو سکی، اس لیے مزید تشویش و تعلق ہے۔

عرض ہے کہ آپ تفصیلاً مطلع فرما کر مطمئن کریں۔

کیا حضرت سلیمانؒ کی قائم کردہ بزم کا صدر، جس پر ہم سب لوگوں کو فخر و ناز تھا، واقعۃً ہم لوگوں سے جدا ہو گیا؟ اگر ایسا ہے تو یا حسرۃً علی العباد، نہایت بے چینی و اضطراب میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں، جلد حالات سے مطلع فرمائیے۔

والسلام

عاجز عون احمد قادری

خانقاہ رحمانی مونگیر

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم بندہ سلام مسنون

مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کے حادثہ ارتحال کی خبر سے بڑا صدمہ پہنچا، انا للہ وانا الیہ راجعون، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، ادبی اور تاریخی کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے ہیں، اور ان کی تحریروں کا توازن ہمیشہ یادگار رہے گا، کم از کم دار المصنفین کو ان کا بدل ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔

حق تعالےٰ حضرت مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور ان کے مراتب بلند کرے اور ہم سب لوگوں کو اس غم پر صبر کی توفیق بخشے آمین

والسلام منت اللہ

۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بزرگان مخلصم محترم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

حادثۂ فاجعہ کی اطلاع اخبار کے ذریعہ ہوئی، طبیعت بے چین ہوگئی، بڑی دیر تک سکتہ کی کیفیت رہی، بس اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے شاہ صاحب کی ملی خدمات قبول فرمائے، اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے،

۱۵ دسمبر کا احتساب چھپ چکا تھا، انشاء اللہ یکم جنوری کے احتساب میں نوٹ آئے گا،

اب ساری ذمہ داری آپ کے کندھوں پر آگئی ہے، امید ہے کہ آپ معارف اور دارالمصنفین کی روایات کو قائم رکھیں گے۔ آپ کو، دارالمصنفین کے احباب کو، اور شاہ صاحب کے پس ماندگان کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

مناسب ہو تو وفات کے وقت کے حالات سے مطلع فرمائیں،

محمد تقی امینی علی گڑھ

جامعہ نگر دہلی

برادر مکرم السلام علیکم

اچانک رات کو اردو خبروں میں سنائی پڑا کہ شبلی اکاڈمی کے ناظم شاہ معین الدین احمد ندوی کا کل انتقال ہوگیا، لیکن یقین نہیں آیا، یہی خیال رہا کہ کانوں کو دھوکا ہوا، اسوقت حکیم اسحاق صاحب کے بھائی انعام صاحب سے معلوم کیا، کہ کیا بیماری کی اطلاع تھی، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، صبح کی خبروں میں کوئی ذکر نہیں تھا، دہلی کے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کو اطلاع ہے، مگر رات کی اس مختصر خبر کے سوا اب تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوسکا، اتوار کی وجہ سے جامعہ نگر کا ڈاکخانہ بند ہے

یہ کارڈ بھی دوشنبہ کو نکلے گا، اور آپ تک کہیں بدھ جمعرات تک پہنچے گا، الجمعیۃ میں صرف ریڈیو کی مختصر خبر ہے، دل ابتک یہی کہتا ہے کہ خبر غلط ہے، اور شاہ صاحب بخیر و عافیت دارالمصنفین میں ہیں لیکن پھر بھی فکر ہے، براہ کرم حالات سے مطلع فرمائیے،

نومبر میں لکھنؤ میں دو تین دن ساتھ رہا کسی قسم کی صحت کی خرابی نہیں تھی، بالکل اچھے تھے، آخر یہ یکایک کیا ہوگیا، اگر خدا نخواستہ یہ سانحہ ہوگیا ہے، تو بڑی ہی اندوہناک بات ہے اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، وہ تنہا تھے اٹھ چلے گئے، اولاد بھی اپنے پیروں پر ہے، لیکن دارالمصنفین کا کیا ہوگا آپ بالکل تنہا ہوگئے، ہرچند کہ سارا زیادہ کام آپ کرتے تھے لیکن شاہ صاحب کی تائید ہمہ وقت آپ کے ساتھ تھی، اور ان کی ذات آپ کے لیے بڑا سہارا تھی، ان کا دل سفر و حضر ہر جگہ آپ کے ساتھ رہتا تھا، اب ایسا خلوص اور ایسی محبت آپ کو کہاں ملے گی، اور دل وجان سے آپ کی ایسی خیر خواہی کون کرے گا، ان کی مرنجاں مرنج ذات کہاں نصیب ہوگی، آپ کے مغموم دل کو کون تسکین دے گا، آپ کے تھکے ہوئے بازوں کے لیے قوت کدھر سے آئے گی، اور طبیعت کی افسردگی کو کس کی نشاط افروز باتیں دور کریں گی، انھوں نے تو شہر خموشاں پسند کرلیا، اور آپ کو زندگی کے میدان میں تنہا چھوڑ گئے، حالات پیچیدہ، مسائل مشکل، اور وقت نازک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے اور دارالمصنفین کی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو خیر و خوبی کے ساتھ ساحلِ مراد تک پہنچائے، بیدہ الخیر وھو علیٰ کل شئی قدیر، شاہ صاحب تو جنتی تھے ہی اللہ ان کے مراتب بلند فرمائے، اور مقربین کی صف میں شامل کرے۔ فقط

آپ کا شریک غم

عبدالسلام قدوائی

دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور
۱۶؍ دسمبر ۷۴ء

جناب محترم　　سلام مسنون،　　اخبار الجمعیۃ میں قبلہ شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی اطلاع

بڑی تکلیف دہ ہوئی، وہ کاروان علم وادب کے آخری مسافروں میں تھے، اور شبلی سید سلیمان مرحوم کے جانشین تھے، میں اپنی زندگی میں غائبانہ طور پر صدر درجہ سید صاحب مرحوم، مولانا عبدالسلام ندوی سے متاثر تھا، اتنا ہی شاہ صاحب سے، حق تعالے مرحوم کو اعلی علیین میں جگہ دیں، دارالمصنفین کو ان کا بدل میسر آوے۔

معارف میں اون کے حالات زندگی، ان کی تصانیف کا ذکر تفصیلی طور پر آنا چاہئے، متعلقین تک براہ کرم میرا پیغام تعزیت پہنچانے کی تکلیف فرمائیں۔ سید ازہر شاہ

کتاب گھر دہلی محترمی سید صباح الدین صاحب السلام علیکم

آہ تعزیت کس سے کروں، کس کے سامنے درد دل بیان کرکے ہلکا ہوں، آج دوہرے صدمہ سے دوچار ہوں۔ شب ہی میں پیارے دوست بیرسٹر نور الدین صاحب کا انتقال خدا دونوں کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور ہم سب کو صبر عطا کرے۔ سجاد

۱۵ ار دسمبر ۱۹۷۳ء   غریب خانہ ۔ ۱۳ ار مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال،

محب مکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا تار ملا، انا للہ وانا الیہ راجعون، حادثہ سخت ہوا، ایک عظیم مصنف ادیب ہی رخصت نہ ہوا، بلکہ ہماری ندوی برادری کا ایک عظیم الشان ستون گرگیا، دکھ کر ایک دھچکا لگا، تعزیت کیا کروں اور کس سے۔

گلہ جدائی کا کس کس کی ہم کریں اے داغ   کہ ہونے والے ہیں ہم عنقریب سب سے جدا

یہ پتہ نہ چلا کہ تدفین اعظم گڑھ میں ہوئی یا دہلی میں،

آپ کا تار ملتے ہی ایک مفصل اکسپرس تار بھی دیا، امید ہے کہ مل چکا ہوگا،

(حافظ مولانا) عمران خاں ندوی،

علی گڑھ

مکرمی و معظمی جناب سید صاحب زادعنایتکم السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کا پوسٹ کارڈ، ۱ر دسمبر کا آج صادر ہوا، آپ کی پریشانی کا بہت افسوس ہوا، کام
ب آپ کو سنبھالنا ہے، یہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اور دوسروں کو سکھانا ہے، تاکہ وہ آپ کی
دگرین، اور آئندہ جانشین ہو سکیں، اسلاف نے اور خود آپ نے اس بوجھ کو اٹھایا، دارالمصنفین
چلایا، بلکہ ترقی دی، عمارتیں بنوائیں، عطیات حاصل کئے، آپ ہمت نہ ہاریں، شاہ صاحب
جگہ بے شک خالی ہوگئی، اور ساتھ چھوٹ گیا، آپ پر اس کا جس قدر اثر ہو کم ہے، لیکن مرضی مولیٰ
ہمہ اولیٰ۔ رضینا برضاء اللہ، رضینا بقضاء اللہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ
الے نے کس وقت جانشینی کے فرائض کس خوش اسلوبی سے انجام دیے، اللہ اکبر، آپ فاضل
ب، اور مورخ، ہمارے لئے حکم ہے کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم
آج ہی منشی اشتیاق علوی کا خط آیا ہے، انھوں نے لکھا ہے، کہ حضرت مولانا علی میاں قبلہ کی
بت معلوم ہوا کہ وہ رائے بریلی میں یہ خبر جانکاہ سنتے ہی سکتہ میں آگئے، اور دونوں کسی سے بات نہیں کی۔

عبید الرحمٰن

مشاہیر ادب کے خطوط

۱۸ر دسمبر ۱۹۶۸ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مکرمی و محترمی سلام مسنون، کل اخبار سے شاہ معین الدین صاحب
، سانحۂ رحلت کی خبر ملی، کتنی اچانک اور کیسی اندوہ ناک جس کی طرف خیال بھی نہیں گیا تھا، موت
نی ہی اٹل کیوں نہ ہو، زندگی اور زندہ رہنے کے بھی کچھ قرائن ہوتے ہیں، جن کا لحاظ ہوتا ہی ہے،

ہم سب مرحوم سے اتنی دور رہ کر اور اتنا کم ملنے کا اتفاق ہونے کے باوجود اس مفارقت پر اتنے بے قرار ہیں، تو آپ کا اور دوسرے وابستگان شبلی منزل اور دارالمصنفین کا کیا حال ہوگا جہاں کی فضا میں مرحوم کی دلآویز شخصیت پیوست تھی، وہ ان کی شرافت، شائستگی، تواضع و تکریم اور علم کا وزن و وقار،

حیات سلیمان کس محبت، افتخار و اعتبار سے بھیجی تھی، اور باوجود چند در چند معذوریوں کے میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا، حالانکہ اس کی صرف جزو بندی ہوئی تھی اور اوراق کٹے نہ تھے، لیکن مرحوم نے معلوم نہیں کتنی اور کیسی محبت سے بے اختیار ہو کر کتاب جوں کی توں بھیج دی، مجھ پر اس کا اثر ہے، اور اس وقت جبکہ یہ سطریں آپ کو لکھ رہا ہوں، وہ تازہ ہو کر اور زیادہ تکلیف دہ ہوگیا ہے، سوچتا ہوں بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی مفارقت سے کتنی حسرتناک ہو جاتی ہیں، کبھی کبھی اون کی بڑی باتوں کی یاد سے دلفگارتر۔

معارف میں مرحوم کے لکھے ہوئے شذرات وزن اور وقعت میں معارف کے پیشینوں کی یاد تازہ کرتے تھے، حال میں حج کی واپسی پر مرحوم نے جو باتیں جس طرح لکھی ہیں، انکو میں نے خاص طور پر پڑھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ سفر حج کا ذکر ہر شخص ایک ہی انداز سے کرتا ہے، دیکھوں شاہ صاحب کس طرح کرتے ہیں، انھوں نے جو کچھ جسطرح لکھا ہے بڑا سنجیدہ، موثر اور دلنشین تھا، اور مشورے دئے تھے بڑے عملی، ضروری اور وقیع تھے، اسے پڑھ کر بہت خوش اور مطمئن ہوا، مرحوم نے میری توقعات سے بہتر لکھا، اور بندھے ٹکے خانوں سے باہر نکلنے کی مرحوم میں کتنی اچھی مناسبت تھی، معارف کے شذرات میں مرحوم کی یہ صلاحیت پورے طور پر نمایاں رہتی تھی، نازک اور سنگین مسائل پر بڑی منصفی، توازن اور جرأت سے اظہار خیال کرتے تھے،

حیات سلیمان کی تدوین میں مرحوم نے حسب عقیدت، احتیاط اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے، وہ دارالمصنفین کی دیرینہ گرانقدر روایات کے عین مطابق ہے،

ایسے غم ناک حادثہ پر دیر تک متاثر رہنے اور اسکا تذکرہ کرنے کے قابل نہیں رہا میں اس دعا پر اکتفا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور مرحوم سے محبت اور انکی عزت کرنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین! یہ بھی دعا مانگتا ہوں کہ خداوند کریم آپ کو اس قابل بنائے، اور رکھے کہ آپ شبلی منزل اور دارالمصنفین کی بیش بہا اور گوناگوں خدمات اور روایات کو اپنی شخصیت اور علمی خدمات سے تادیر تازہ اور تابندہ رکھیں اور دارالمصنفین کے معیار اور مقصد کو آگے بڑھانے کیلئے ذہین اور مخلص اسکالرس کی جماعت فراہم اور منظم کرنے میں کامیابی عطا فرمائے آمین! دعا ہے آپ خیریت سے ہوں آپ سب کے غم میں شریک۔

مخلص رشید احمد صدیقی

جامعہ نگر نئی دہلی

۱۹ دسمبر ۱۹۷۴ء

سید المحترم السلام علیکم

شاہ معین الدین مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھکر بہت رنج اور افسوس ہوا، جانا تو ہر ایک کو ہے اور مرحوم عرصہ سے علیل رہتے تھے، مگر ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں، وہ ایک اہم اور گراں قدر ادارے کی جان تھے اور خود بھی ایک ادارہ تھے جس ایثار اور عالی ہمتی کے ساتھ انھوں نے آپ کی مدد سے دارالمصنفین کو برسوں چلایا، اور حد درجہ ہمت شکن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ادارے کے کام کو جاری رکھا اسکی جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہے، ان کی جدائی نے گویا آپ کو تنہا چھوڑ کر کمر توڑ دی، اللہ تعالیٰ انکو جنت میں جگہ دے اور انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے آپ کی صحت و سلامتی کیلئے آپکے مداح اور ادارے کے ہمدرد بہت بدعا رہیں گے خدا آپ کی مدد کرے اور کام کو جاری رکھنے کی ہمت اور وسائل عطا فرمائے، آپکے غم میں شریک

بشیر حسین زیدی

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۲۰ دسمبر ۱۹۷۴ء

محب مکرم شاہ صاحب قبلہ کے انتقال کی خبر سے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان نہیں کر سکتا، کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں، حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں رہا

کیا ہوگا اس کم بخت اردو کا، پرانے بادہ آشام ایک ایک کرکے اٹھتے جاتے ہیں، اور جو نئے ہیں ان کے اندر نہ وہ دل سوزی ہے، اور نہ وہ دیدہ وری، علم و فضل کا تو سوال ہی نہیں، جانشینوں سے کہیں یہ بوجھ اٹھ سکتا ہے؟ بقول خواجہ میر درد، ایک قاتل بس آپ رہ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، مجھے اپنی کوتاہیاں معلوم ہیں، بہت ہی بے علم آدمی ہوں لیکن دارالمصنفین اور معارف کے سلسلہ میں جو خدمت بھی آپ سپرد فرمائیں گے اسے بخوشی بجالاؤں گا۔

شاہ صاحب مرحوم بڑی ہمت افزائی فرماتے تھے، ۲۴ اپریل ۷۳ء کے خط میں لکھتے ہیں "بلا تصنع لکھتا ہوں کہ آپ کی تحریر پر رشک آتا ہے کاش ایسی چند سطریں لکھ سکتا"۔ ان کا خیال آتا ہے تو دل لوٹنے لگتا ہے۔ بنا شد ہر کس از جانم فراموش۔

آپ کا شریک غم

خواجہ احمد فاروقی

نفیس منزل بدر باغ
علی گڑھ

۱۸ دسمبر ۷۴ء

مجی صباح الدین صاحب تسلیم

ہمارے دوست شاہ معین الدین صاحب ندوی کا انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، شاہ صاحب سے دیرینہ مراسم تھے، ان کی علمی و ادبی صلاحیت کے علاوہ ان کی مخلصانہ روش، وہ رہ کر یاد آتی ہے، اور ان کی وضعداری، ملاقات آخری دفعہ شاید ۱۹۶۹ء میں دہلی میں غالب کے اجتماع کے سلسلہ میں ہوئی تھی، انجمن کے جلسوں میں کئی سال سے وہ نہ آسکے تھے، یہ بھی سنا تھا، کہ ادھر صحت اچھی نہیں رہتی تھی، اب ادارے کی ساری ذمہ داریاں آپ ہی پر ہیں، خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، دارالمصنفین کا کام تو بہرحال کسی طرح چلتا ہی چاہئے، کچھ کام نوجوانوں پر ڈالیے، اہم کاموں کی نگرانی ہی اپنے ذمہ رکھیے، حالات صبر آزما ہیں، مگر آپ جیسے مخلص اور غیر معمولی صلاحیتوں والوں کیلئے راستے نکل ہی آتے ہیں،

مخلص

لکھنؤ

۱۹/دسمبر ۱۹۷۴ء قبلہ! السلام علیکم

خط ملا۔ اسی کے ساتھ یہ اندوہناک اطلاع بھی ملی کہ شاہ صاحب مرحوم نے ہمیں داغِ مفارقت دیا، میں ان سے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں ملا تھا، پینتالیس برس بیت گئے لیکن انکی وضعداری، محبت اور ادب دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا، عظمتِ علم کے باوجود فروتنی، علم کی گہرائی اور وسعت کے باوجود شہرت سے گریز اور گوشہ نشینی، میری آزادہ روی اور آزادگفتاری کے باوجود ان کا بے پایاں خلوص، انکا دلنشین صوفیانہ اندازِ زندگی، اُن کی ناقابلِ تسخیر مسکراہٹ، ان کا تبحر، انکی شگفتہ نثر، ادب و شعر سے ان کا گہرا لگاؤ، خردوں سے برابر والوں جیسا برتاؤ، شبلی و سلیمان ہی سے نہیں، سہیل و عبد السلام ہی سے نہیں بلکہ علم گڈھ اور پورب سے وابستگی انکی وسیع النظری اور وسعتِ قلب کے ساتھ انکی طبعی شگفتگی و دلداری کا ثبوت ہیں، وہ یقیناً زاہد تھے لیکن ان میں زاہدانہ یبوست نہ تھی، وہ عالم تھے لیکن ان کو غرورِ علم نہ تھا، وہ ادیب تھے لیکن خود کو خادمِ ادب ہی کہتے اور سمجھتے رہے، وہ ہمارے ثقافتی اور علمی روایات کے امین تھے، انکے اُٹھ جانے سے دار المصنفین کی محفل ہی نہیں بلکہ علم و ادب کی محفل کا اہم گوشہ سنسان ہو گیا، لیکن اپنا اختیار کیا ہے، رضا بقضائہ و تسلیماً لامرہٖ۔ اس عظیم حادثے میں میری جانب سے تمام اربابِ دار المصنفین اور مرحوم و مغفور کے متوسلین کو ادائے تعزیت اور تلقینِ صبر کریں، خدا مرحوم کو اپنے حبیبؐ کے جوار میں جائے عالی مرحمت کریں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شریکِ غم۔ علی جواد زیدی

۱۶/دسمبر ۷۴ء

دفتر ماہنامہ شاعر، بمبئی۔ مکرمی صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب سلام مسنون

آپ کو، دار المصنفین کے ارکین اور شاہ صاحب مرحوم کے پسماندگان کو کس دل سے اور

کن الفاظ میں تعزیت نامہ لکھوں، پرسوں سنیچر کی شب میں ایک اجتماع کے اختتام کے بعد محبی سید شہاب الدین دسنوی نے یہ المناک خبر سنائی، کہ حضرت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا، وہاں کئی ہزار آدمیوں کی بھیڑ تھی، اور ان گنت لوگ مل جل رہے تھے، لیکن کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہ کر سکا، خود قلب کی تکلیف میں مبتلا ہوں اور بمشکل اوس اجتماع میں گیا تھا، ۱/۲ ۱۲ شب کو واپسی ہوئی اور پھر صبح کے ۲ بج گئے کروٹیں بدلتے بدلتے بڑا سانحہ ہوا ہے، علمی دنیا کا یہ نقصان عظیم ہے، دار المصنفین کا آخری ستون گر گیا، اللہ آپ سب کو، اُن کے پس ماندگان و وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے، اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

شاہ صاحب مرحوم سے زندگی میں دو ہی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، یوں لگتا تھا کہ کسی معصوم فرشتہ سے ملاقات ہو رہی ہے، اون کا وہ علمی کام، دار المصنفین کی قیادت، دوستوں اور عزیزوں سے شفقت و محبت کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔

کل اتوار کے روزنامہ انقلاب میں بھی انکے انتقال پر ملال کی اطلاع شائع ہو گئی تھی، تفصیلات سے لاعلم ہوں۔ آپ کا شریک غم اعجاز صدیقی۔ مدیر شاعر

گل مرگ ہوٹل لکھنؤ، باسمہ

محترمی صباح الدین صاحب سلام مسنون

ابھی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اس اطلاع سے بہت صدمہ ہوا، کہ ہمارے محترم شاہ معین الدین احمد انتقال کر گئے، ان کی تو علالت کی اطلاع بھی ہم لوگوں کو نہیں تھی، غالباً اچانک وفات ہوئی، خدائے برتر سے دعا ہے کہ اپنے حبیب کے صدقہ میں انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اور اُن کے پس ماندگان اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، پروفیسر نذیر احمد صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں اور اس صدمہ میں آپکے برابر کے شریک ہیں، سوگوار مختار الدین احمد و نذیر احمد،

(باقی)

مطبوعاتِ جدیدہ

خطۂ پاک اوچ ۔ مرتبہ:۔ جناب مسعود حسن شہاب صاحب. متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۳۳ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۔ ۱۵ روپے پتہ اردو اکیڈمی بہاول پور ۔

اوچ ریاست بہاولپور (مغربی پاکستان) کا قدیم متبرک مقام ہے، اس کتاب میں اسکی مفصل تاریخ اور گذشتہ شوکت وعظمت کے ساتھ یہاں کے علماء وصوفیہ، آثار قدیمہ اور نوادر وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، یہ نو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے اوچ کی قدامت، اس کے پرانے ناموں اور محل وقوع کا ذکر کر کے اسکی اہمیت وعظمت دکھائی گئی ہے، مصنف کا خیال ہے کہ پانچ ہزار سال قبل آریوں کی آمد سے بھی پہلے اوچ کی بنیاد پڑ چکی تھی پھر اسلام سے پہلے اور بعد کے مختلف حکمرانوں کے عہد کے اوچ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں محمد بن قاسم کی فتوحات، عربوں کے تسلط کی روداد اور ان کے دور کے تہذیبی وتمدنی حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، تیسرے، چوتھے اور چھٹے ابواب اس لحاظ سے زیادہ اہم ہیں کہ ان میں اوچ کے ممتاز علماء وفضلاء ومشائخ کے علاوہ ان صوفیہ کا بھی ذکر ہے، جنھوں نے اوچ کے روحانی مرکز سے فیضیاب ہو کر ہند وبیرون ہند کے مختلف مقامات میں رشد وہدایت کی قندیلیں روشن کی تھیں۔ علما وصوفیا میں سید صفی الدین گازرونی، قاضی منہاج اور سید حمید الدین ناگوری بہاء الحق زکریا ملتانی، سید جلال الدین سرخ بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سید صدر الدین راجو قتال اور سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید سکندر بن مسعود ترمذی، شاہ مجیب اللہ صاحب،

خانقاہ جیسے جلالی کی شریف، حسام الدین متقی، مولانا سماء الدین سہروردی، مولانا جمالی سہروردی اور شاہ جمالی لاہوری وغیرہ جیسے اکابر کے تذکرے شامل ہیں۔ تیسرے باب میں اوچ کے مدرسہ فیروزیہ اور چوتھے میں تصوف کے وہاں مروج سلاسل و خانوادوں سلسلۂ گازرونیہ، سہروردیہ اور خانوادۂ بخاریہ و گیلانیہ کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے، ان ابواب میں تصوف کی اصل حقیقت اور صوفیہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا گیا ہے، آخری ابواب میں اوچ کی قدیم عمارتوں، قلمی نوادر، زبان، قوموں، مذہبوں اور اس کے نواح کی بعض اور قدیم بستیوں کا ذکر ہے۔ اوچ کی یہ تاریخ فقر و شہنشاہی، سلطنتوں کے عروج و زوال اور تہذیبوں کے ارتقاء و تنزل کی داستان ہونے کی بنا پر مرقع عبرت ہے۔ اس میں اوچ کے علاوہ ملتان، سندھ، بہاولپور اور بعض دوسرے علاقوں کے متعلق بھی مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، لیکن جیسا کہ مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایسی قدیم بستی کے متعلق خاطر خواہ مواد نہ ملنے کی وجہ سے ان کو قدیم منتشر کڑیوں کو جوڑنے کے لیے ظن و تخمین سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ اس لیے بعض واقعات و روایات کی صحت شبہہ سے خالی نہیں معلوم ہوتی۔ کتاب محنت و جستجو سے لکھی گئی اور معلوماتی ہے۔ طرز بیان اور تحریر میں سلاست و شگفتگی ہے، اوچ کی قدیم عمارتوں اور نادر مخطوطات کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔

جواہر الاصول ۔ (عربی) مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۱۰۰، قیمت۔ تحریر نہیں۔ پتہ۔ شرف الدین الکتبی و اولادہ، ۲۹ شارع محمد علی بمبئی ۳۔

یہ رسالہ نویں صدی ہجری کے عالم ابو الفیض محمد بن محمد بن علی فارسی ہروی کی تصنیف اور اصول حدیث کے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہے، قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے اپنے ذاتی اور جامع مسجد بمبئی کے کتبخانہ کے قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا متن مفید حواشی و تعلیقات

کے ساتھ پہلی دفعہ شائع کیا ہے، مقدمہ و خاتمہ اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ خاتمہ میں علم اصول حدیث کی ضرورت و اہمیت و فضیلت، بعض مخصوص اصطلاحات اور فن تدوین حدیث کی مختصر تاریخ تحریر کی گئی ہے، اور پہلے حصہ میں دو ابواب ہیں ان کی مختلف فصلوں میں متن کی قسموں مثلاً صحیح اور انواع مسند وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں سند کے مباحث کی ذیل میں بیان کیے گئے ہیں، انہیں راوی کے ضروری اوصاف کا ذکر ہے، تیسرے حصہ میں حدیث کی روایت، نقل کے مختلف طریقے، تحریر و کتابت کے ضروری قاعدے اور راوی اور آداب و شرائط بیان کیے گئے ہیں، چوتھا حصہ رجال کے ناموں اور طبقوں کے متعلق ہے، خاتمہ میں محدث کے صدق اور نقد حدیث کے مباحث کے علاوہ بعض نامور محدثین کی فہرست دی گئی ہے، یہ رسالہ ابن صلاح کے مقدمہ اور نووی کی تقریب کا خلاصہ اور متقدمین حاکم، خطیب اور ذہبی وغیرہ کی کتابوں سے ماخوذ ہے، گو اس میں کوئی خاص ندرت و خصوصیت نہ ہو تاہم ترتیب، طرز بیان اور مسائل کے استقصا کے لحاظ سے قابل قدر ہے، اس لئے قاضی صاحب نے اس کو شائع کرکے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، حاشیے میں انھوں نے پیش نظر دونوں نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح اور متن کی مجمل و مبہم عبارتوں اور بحثوں کی توضیح کے لیے اصول کی متداول کتابوں کے حوالے اور ضروری تفصیلات نقل کر دی ہیں، انھوں نے رسالے کے بعض دوسرے قلمی نسخوں کا بھی ذکر کیا ہے، مگر پتہ نہیں ترتیب و اشاعت میں ان سے مدد کیوں نہیں لی،

املا نامہ — مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۸۸
قیمت:- عہ/ پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔

اردو رسم الخط کی طرح اردو املا کا مسئلہ بھی عرصہ سے غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے مگر اس کی جانب بہت کم لوگوں نے اعتنا کیا ہے، پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحومین نے اس کی جانب زیادہ توجہ کی تھی اور ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو

کی کمیٹی اصلاح رسم الخط نے املا کے بارے میں سفارشات پیش کی تھیں اب مرکزی حکومت نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے اس نے اردو املا کے ساتھ اس جانب بھی دھیان دیا ہے اور اس کے لیے ایک سہ نفری کمیٹی تشکیل کی ہے ۔

چنانچہ کمیٹی کے ایک لائق رکن رشید حسن خان صاحب نے اردو املا کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور دوسرے لائق رکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات و اصلاحات کو اس کتاب میں مرتب کیا ہے اس میں اردو املا کے مختلف النوع مسائل کے متعلق سفارشات درج ہیں مثلاً عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے جو الفاظ اردو میں رائج ہیں انکے املا میں اصل کی پیروی کی جائے یا اردو کے مروج طریقہ کو قائم رکھا جائے ، اسیطرح جو الفاظ نون سے لکھے تو جاتے ہیں مگر پڑھے میم سے جاتے ہیں جیسے گنبد وغیرہ انکے بارہ میں املا کے کیا قاعدے ہونے چاہئیں یہ اور اسیطرح کے دوسرے مسائل میں املا کو متعین کرنے کیلئے کمیٹی نے جو سفارشات پیش کی ہیں یہ کتاب انکا مجموعہ ہے اسمیں متعدد حروف الف، تنوین، ت ۔ ة ــــ ط ۔ ذ، ز، ژ، س، ص، نون، نون غنہ، یائے مختفی، ہائے مخلوط، ہمزہ سے بنے ہوئے الفاظ اور بعض اعداد وغیرہ کے املا کی بے اعتدالی اور انتشار کو دور کرنے کیلئے اصلاحات بھی تجویز کی گئی ہیں اور لفظوں کے درمیان فاصلہ اور انکو ملا کر لکھنے کے قاعدے، اعراب، علامت اور رموز اوقاف وغیرہ کے بارہ میں بھی ہدایتیں دی گئی ہیں، عموماً اس کمیٹی نے انہی سفارشات کو برقرار رکھا ہے جنکو انجمن کی کمیٹی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے پہلے تجویز کیا تھا مگر بعض مقامات پر اختلاف بھی کیا گیا ہے اور بقول ڈاکٹر عبدالعلیم صدر ترقی اردو بورڈ ان سفارشات میں قدیم علم اور جدید صوتیات دونوں کے تقاضوں کو نظر میں رکھکر بنیادی اصولوں کی وضاحت بھی صاف اور سلیس طور پر کی گئی ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے مختصر مگر جامع، مفید اور لائق مطالعہ ایک مقدمہ ہے املا میں اصلاح و یکسانیت کی کوشش ایک مفید اور ضروری اقدام ہے اسکا خیر مقدم کیا جانا چاہیے لیکن ایسے غور اور اہم مسئلہ میں مزید غور و فکر اور ارد لسانیات کے ماہرین اور ہر طبقہ کے ممتاز اہل قلم کے خیالات معلوم کرنا بھی ضروری ہے ایسی اہم کتاب میں کتابت کی غلطیوں کا پایا جانا افسوسناک ہے صفحہ ۳۱ پر مولا کو ان الفاظ کی فہرست میں دیا گیا ہے جنکے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ پہلے ہی سے معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں مگر اسکے بعد ہی اسکو ان الفاظ میں بھی شامل کر دیا گیا ہے جنکا املا دونوں طرح رائج ہے یعنی مولا اور مولیٰ ۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی ایک ہی بات صحیح ہوگی ۔ " ض "

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، قیمت [illegible] شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح بڑا خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد ان میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

[illegible]

حیاتِ سلیمان

[illegible] سید صاحب [illegible]

[illegible] مذہبی [illegible]

[illegible] سیاسی حالات [illegible]

[illegible] تمام ملی، قومی، سیاسی [illegible]

[illegible] مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات [illegible]

[illegible] مسئلۂ حجاز، انہدام مقابر و آثار [illegible] کی بھی مختصر تفصیل آگئی ہے

[illegible] سید صاحب کی زندگی کا سب سے [illegible] ہے اس کی [illegible] برس اور

[illegible] کی ترقی کی [illegible] تک [illegible] پاکستان [illegible]

پھر [illegible] پاکستان کے چند سالہ قیام کے [illegible] انھوں نے جو [illegible] انجام دیں [illegible]

[illegible] کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی [illegible]

[illegible] سید صاحب کے خطوط [illegible] یہ کتاب [illegible]

[illegible] کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا [illegible] ہے۔ ویسی ہی دلکش [illegible]

قیمت ۱۸ روپے

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

بٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — فروری ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سیّد صباح الدّین عبد الرّحمٰن — عبد السّلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنّفین اعظم گڈھ

کاتب تبلہ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۳۔ مولانا عبدالسلام بلگرامی ندوی لکھنؤ
۴۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ∴ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء، وشعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل، اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۵ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۵ء عدد ۲

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۸۲

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۸۵-۱۰۸

شرح السنۃ امام بغوی — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۰۹-۱۲۳

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ — مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی گوپاموی ایم اے سابق لکچرار شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۱۲۴-۱۳۶

تعزیتی تجاویز اور خطوط — ۱۳۷-۱۵۱

ادبیات

آہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی — جناب پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۱۵۲-۱۵۳

تاریخ وفات — جناب قمر سنبھلی — ۱۵۳

مرثیۂ شاہ صاحب — جناب ساحل بمبئی — ۱۵۴

قطعات تاریخ وفات — جناب حاذق ضیائی سہسرامی — "

نذرانۂ عقیدت — جناب احمد کرم عارف بنارسی — ۱۵۵

ماتم شاہ صاحب — جناب یحییٰ حنفی — "

قطعۂ تاریخ — جناب رحمت الٰہی صاحب برق صدیقی اعظمی — ۱۵۶

نالۂ غم — جناب مولوی عثمان احمد صاحب [illegible] جونپوری — "

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۱۵۷-۱۶۰

شذرات

جناب شاہ صاحب کی اچانک رحلت سے دارالمصنفین کی فضا اب تک سوگوار ہے، اُن کو بھلایا نہیں جاتا،

اُن کی کسی چیز پر نظر پڑ جاتی ہے تو ع دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

اُن کے ساتھ چالیس سال تک جتنے کیف آگیں دن گذرے اب اسی کی یاد اندوہگیں بنی ہوئی ہے،

اُن کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

بارالٰہا! اُن کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے معمور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما رہ، آمین!

اسی مہینہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی دارالمصنفین میں قیام کے لئے تشریف لے آئے ہیں، اُن کی آمد سے یہاں کی سوگواری میں نہ صرف کمی پیدا ہو جائیگی، بلکہ اُن کے علم و فضل سے پورا فیض اٹھانے کا موقع ملے گا، وہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے عزیز شاگرد رہ چکے ہیں، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک عرصہ سے مدرّس رہنے کے بعد جامعہ ملیہ، نئی دہلی میں دینیات اور تاریخ اسلام کے استاد بھی رہے، جہاں اپنی نیکی، پرہیزگاری، اخلاص مندی اور فرض شناسی کی وجہ سے مقبول تھے، ڈاکٹر عابد حسین کے ادارۂ اسلام اور عصرِ جدید کے سہ ماہی رسالہ کی مجلسِ ادارت کے رکن بھی ہیں، اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی ہیں، اس سال سے پہلے حج کے موقع پر شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ وہ بھی سعودی عرب کے امیر فیصل کی طرف سے زیارت خانۂ کعبہ کے لئے مدعو تھے، اور دونوں ہم سفر بھی رہے، شگفتہ اور با وزن تحریر لکھنے میں دبستانِ شبلی ہی کے مقلد ہیں، دارالمصنفین سے اُن کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئی ہیں، اُن کی تشریف آوری سے ہمارے رفقاء کا زخوش ہیں، ہم بھی یہ کہکر اپنے دیدہ و دل سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، ع تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں،

دارالمصنفین کو قائم ہوئے اب ساٹھ سال ہو رہے ہیں، اس کے اسلاف اور اُن کے اخلاف نے جو کچھ کیا، اس کو مولانا جامی کی ایک تمثیل میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے خاقانی کے ایک

مشہور قصیدہ کی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر طبع آزمائی کی جس میں امیر خسرو بھی اپنے فن کا کمال دکھا چکے تھے، تو اپنا قصیدہ ختم کر کے لکھا کہ خاقانی نے خوانِ نعمت بچھایا، امیر خسرو نے اس کو نمک ڈال کر بامزہ بنایا، مگر خود انھوں نے کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلوا دیئے، اسی طرح علامہ شبلی نے جو خوانِ نعمت بچھایا تھا، اس کو اُن کے شاگردوں نے سجایا، ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے اس خوان پر کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلانے کا فرض انجام دیا، مگر اب یہ ہاتھ دھلانے والے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں،

ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں شبلی، سلیمان، اسلام اور مسعود نہیں پیدا ہو سکتے، مگر اُن کا کام ایک پوری جماعت کے ذریعہ سے انجام پا سکتا ہے، جو زیادہ سے زیادہ با صلاحیت افراد کے جمع کرنے کے بعد ہی بنائی جا سکتی، مگر اس کی تشکیل کے مادی وسائل کی فراہمی کے سوال پر ہر طرف سے یہ خاموشی دارالمصنفین کو یہ آواز سنائی دیتی ہے ع داغ لالہ کیلئے کیا فکر مرہم کیجئے، دارالمصنفین کے اسلاف نے جس ایثار کے ساتھ اس کی خدمت کی، اس کی قدر اُن کی زندگی میں نہیں بلکہ اُن کے بعد ہوئی، اسی طرح دارالمصنفین کے نشا شفوہا کے بعد ہی اُس کے کارناموں کی مشعل روشن کر کے اس کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا،

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمّید ناامیدی اُس کی دیکھا چاہئے،

اس ادارہ میں برسوں خونِ جگر پی پی کر ایک کتاب تیار کی جاتی ہے، اُس کی اشاعت پر علمی حلقوں میں تو مدح و تحسین کے پھول برسائے جاتے ہیں، مگر یہ گودام میں برسوں کیا قرنوں پڑی رہتی ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا، کہ "دارالمصنفین کے قدر دانوں معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے، کہ قدر دانی، تعریف اور شکر گذاری اپنی جگہ پر اچھی چیزیں ہیں، لیکن اُن سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالمِ مادی میں دینی اور روحانی کاموں کے لئے بھی مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دارالمصنفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کے لئے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ"

فرضِ کفایہ ہی نہیں بلکہ فرضِ عین بھی ہے کہ قدرداں اور بخشندے آگے بڑھ کر دامے درمے اس کی دل کھول کر مدد کریں، اگر مرحوم کی جود و فیض سے عطیات اور چندہ کا یہ نتیجہ ہو کہ اس کی مطبوعات کے خریدار زیادہ سے زیادہ ہوں، بقول اُن کے "یہ کوئی احسان نہیں ہوگا، بلکہ ایک سودا جس میں چاندی کے چند ٹکڑوں، بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آئے گی، جو بے بہا اور لازوال ہے،"

اس اپیل کی خاطر خواہ ساعت نہیں ہوئی تو پھر میری آہ کو بھی اثر ہونے کے لئے ایک عمر چاہیے، لیکن میرے بے صبر کہنے سے کوئی مہربان کیوں ہو، دارالمصنفین کی بزم کے آشفتہ سروں کو تشنہ کامی روکر اُس کے مقصد کی تکمیل میں استواری دکھائی ہے، اور جب اس کے لئے ترک وفا کا سوال ہی نہ ہو تو چارہ ساز اور غم گسار نہ سہی، ع :-

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

دارالمصنفین کے پچھڑے ہوئے علمی کاموں میں ابھی طباعت و اشاعت کے لئے حسبِ ذیل مسودے تیار ہیں، (۱ - ۲) مقالات سلیمان جلد چہارم و پنجم (۳) مقالات عبدالسلام جلد دوم (۴) تذکرۃ المحدثین جلد دوم (۵) تبع تابعین جلد دوم، (۶) محمود غزنوی (۷) بزمِ تیموریہ جلد دوم (۸ - ۹) غالب مدح و قدح کی روشنی میں جلد اول و دوم (۱۰) ہندوستان کے عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان فرمانرواؤں کی مذہبی رواداری (۱۱) شاہانِ مغلیہ کی مذہبی رواداری (۱۲) فارسی میں نعت گوئی (۱۳) مولانا محمد علی کی یاد میں : (۱۴) علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات (۱۵) خریطۂ جواہر،

یہاں سے ہر سال دو نئی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی روایت رہی ہے اس طرح صبر آزما حالات کی ناسازگاری کے باوجود اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل سے ابھی آیندہ چھ سات سال تک اس کی علمی روایات میں کمی نہ آئے گی، ع :

نقشِ پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

مقالات

ہندوستان کے عہدِ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ مقالہ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کے ایک جلسہ میں، ۲۰ اپریل ۱۹۶۹ء میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے المالطیفی ہال میں پڑھا گیا، جلسہ کے صدر ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت مہاراشٹر تھے، جلسہ میں وقت کی قلت کے سبب مقالہ کے کچھ حصے چھوڑ چھوڑ کر پڑھے گئے، اب مزید اضافہ کر کے معارف میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمہید: اس مقالہ کا موضوع "ہندوستان کے عہد ماضی میں مذہبی رواداری" ہے، عہد ماضی سے مراد وہ دور ہے جبکہ اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت رہی، وہ یہاں آئے تو انکو یہاں کے ایسے باشندوں سے سابقہ پڑا جو انکے ہم مذہب نہ تھے، اس مقالہ میں یہ ظاہر کرنا ہو کہ ان دونوں مذاہب کے پیرودں میں استیلا اور اقتدار کی خاطر صرف خونریزی اور غارتگری ہوتی رہی یا دونوں میں فراخ دلی، رواداری، بے تعصبی اور کشادہ دلی بھی رہی، تاریخ کے مواد کچے ہوتے ہیں، وہ دلوں کو توڑنے اور جوڑنے دونوں کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں، کسی ملک کے کسی دور کی صرف خونریزی اور ہولناکی کی داستانیں جمع کر دی جائیں تو اسکی تاریخ یقیناً قصائی کی دوکان ہو جائیگی لیکن اس عہد میں ایسے بہت کچھ مواد ملیں گے جن سے مہر و محبت کی داستانیں، دلجوئی اور دلنوازی کی حکایتیں قلمبند کیجائیں تو اسی عہد کی تاریخ دلآزار ہونے کے بجائے دلنواز بنجائے، مورخ کا قلم بھی عجیب ہوتا ہے، یہ شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، کانٹا بھی ہے پھول بھی، زہر بھی ہے تریاق بھی، پیار و چمکار بھی ہے تو نفرت و عداوت کی تلوار کی جھنکار بھی، یہ کلیجہ کو چھید کرکے لاعلاج ناسور بھی پیدا کر سکتا ہے تو دلوں کو سرور بھی بخش سکتا ہے، اس مقالہ میں شبنم، پھول، پیار

اور سرور کی کہانیاں سنائی ہیں۔

لڑائیوں کی سیہ کاریاں | یہ صحیح ہے کہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان کو بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں، ان لڑائیوں میں خون ریزی بھی ہوئی، ان کی فوجوں نے بعض علاقوں میں غارتگری بھی کی، انھوں نے برسرپیکار باشندوں کے لیے سخت، نامناسب اور تکلیف دہ کلمات بھی کہے، ان کے مورخین اپنے فاتحانہ غرور اور جنگ جویانہ ذہن سے ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے غیر مسلموں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور دکھ بھی، لیکن آجکل کی لڑائیوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا مقابلہ گذشتہ زمانے کی لڑائیوں سے کیا جائے تو گذشتہ زمانے کی ساری جنگی سیہ کاریاں ماند پڑجاتی ہیں، دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر اٹیم بم سے جو خونریزی، ہولناکی، تباہی اور غارتگری برپا کی، وہ انسان کی تاریخ کا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ میں کسی فتح و تسخیر کے سلسلہ میں ایسی ہولناکی اور بربادی کی مثال نہیں ملے گی، ان سطروں کے لکھتے وقت ریڈیو سے یہ خبر سنی کہ امریکن فوج نے شمالی ویٹ نام میں کم از کم بہتر لاکھ بم گرائے ہوں گے، اس سفاکی کی مثال تو تیمور جیسے ظالم سفاک کے یہاں بھی نہیں ملے گی، پھر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں بھی فتح و تسخیر کے سلسلے میں کیا نہیں ہوتا رہا، ۱۰۶۶ء میں ولیم اول نے برطانیہ پر حملہ کیا تو اس کا حکم تھا کہ آدمی اور جانور دونوں میں کسی کی رعایت نہ کیجائے، گھر، غلہ، کاشتکاری وغیرہ سب برباد کر دیجائیں، نو سال تک یورک اور ڈرہم کے بیچ میں زمین کے کسی ٹکڑے پر کھیتی نہیں ہوئی، چند سال کے اندر سارے عہدے اور اختیارات ملکی باشندوں سے لیکر نارمنوں کو دیدیے گئے، جنھوں نے اصلی باشندوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا، انکے کھیتوں کو برباد کیا، ان کی عورتوں سے بدسلوکی کی، افراد کو جیلوں میں رکھا، ایک لاکھ عورتوں

اور مردوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا، سترہویں صدی میں جرمنی میں تیس سالہ جنگ شروع ہوئی جس میں یورپ کی کئی حکومتیں ملوث ہوئیں، اس طویل مدت کی لڑائیوں میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں صرف چھ ہزار گاؤں باقی رہ گئے، موردیا، بیوریا، فرنکونیا، سوابیا وغیرہ خوں ریزی، قحط اور وباؤں سے بالکل تباہ ہوگئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں صرف ساٹھ لاکھ آدمی زندہ رہ گئے، ایسی مثالیں یورپ کی تاریخوں میں بکثرت ملیں گی۔

ہندوستان کے مسلمان فاتحوں کی ہولناکی اور خونریزی کا مقابلہ یورپ کے فاتحین سے کیا جائے تو پھر ان کی کہانی زیادہ ہولناک نظر آئے گی، گو ظلم بہرحال ظلم ہے، ظلم میں زیادہ اور کم کا سوال نہیں ہوتا لیکن کسی حکومت کے ظلم و ستم، جبر و استبداد کے واقعات کے مقابلہ میں اس کے فیاضانہ سلوک اور رواداری نہ برتاؤ کا پلڑا بھاری رہے، تو وہ یقیناً قابل تعریف ہے، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں اگر قہرمانی اور ستم آرائی ہوئی تو اس کی کہانیاں ان کے لیے چھوڑ دیجئے جو نفرت و حقارت پھیلا کر دلوں کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن آیئے ذرہ مہر و وفا، یگانگت و موانست اور اخلاص و محبت کی داستانیں بھی سن لیجئے،

ہندوستان سے عربوں کا لگاؤ ہندوستان میں مسلمانوں کی باضابطہ تاریخ عربوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے، عربوں کو تو ہندوستان سے ہمیشہ بڑا لگاؤ رہا، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسلام سے بہت پہلے زمانۂ جاہلیت میں اپنی لڑکیوں اور محبوباؤں کے نام ہندہ رکھتے تھے، اور بہت سی ہندوستانی اشیا کے نام مثلاً ہندی تلوار، صندل اور عود کا ذکر اس دور کے شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے، اور جب کلام پاک نازل ہوا تو بقول استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ اس میں جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں، مسک (مشک)، زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور) کا ذکر ہے (عرب و ہند کے تعلقات

عربوں کا یہ خیال رہا کہ حضرت آدمؑ دنیا میں دجنا کے مقام پر اتارے گئے جو ہندوستان میں واقع ہے، نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین پر ہوا۔ (تفسیر درمنثور سیوطی ج ۱ ص ۵۵) اسی مناسبت سے عربوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے، اور حضرت علیؓ نے بھی فرمایا کہ سب سے پاکیزہ اور خوشبودار مقام ہندوستان ہے، (سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان باب اول)۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے امام زین العابدین کی والدہ ماجدہ نسلاً سندھی تھیں، گو ان کو ایرانی بھی بتایا جاتا ہے، اگر پہلی روایت صحیح سمجھ لیجائے تو اسلام کے قابل احترام طبقہ یعنی سادات کے ایک بڑے حصہ کا تعلق اسی برصغیر سے ہو جاتا ہے، تاریخی حیثیت سے عربوں کا بحری بیڑا حضرت عمرؓ کے زمانہ (۱۵ھ/۶۳۶ء) میں بمبئی ہی کے علاقہ تھانہ میں آیا تھا، جو اس وقت ایک اہم بندرگاہ تھا، اس کے بعد یہ عرب بھروچ اور پھر دیبل کی طرف بڑھے، یہ سب علاقے ایک عرصہ دراز تک بمبئی ہی میں شمار کیے جاتے تھے۔

محمد بن قاسم کی مہم ان علاقوں میں عرب تاجر برابر آتے جاتے رہتے تھے، جن کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ولید بن عبد الملک (۷۰۵–۷۱۵ء) کے زمانے میں عراق کے حاکم حجاج ابن یوسف (المتوفی ۹۵ھ/۷۱۴ء) نے محمد بن قاسم کو فارس سے سندھ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا، یہ فوجی مہم اس لحاظ سے بڑی تاریخی کہی جا سکتی ہے کہ لشکر کشی کے باوجود اس میں مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا وہی عملی نمونہ پیش کیا گیا جو اسلام کی صحیح تعلیم تھی، یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فوج سندھ میں پھول برساتی ہوئی داخل ہوئی، اس کی فوج کے نیزوں سے

کسی کو کاری زخم نہیں لگا، اس کی تلواروں سے خون نہیں بہا، اس کے آتشیں اسلحہ سے بربادی اور اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے غارتگری نہیں ہوئی، لڑائی بہرحال ہولناک اور خوں ریز ہوا کرتی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خوں ریز اور ہولناک لڑائیوں کے بعد ان عرب فاتحوں کا سلوک مفتوحوں کے ساتھ کیا رہا۔

حجاج بن یوسف کی نصیحتیں | عام طور سے حجاج بن یوسف ایک بڑا جابر اور خونی حاکم سمجھا جاتا ہے، لیکن سندھ کی فتوحات کے سلسلے میں اس نے محمد بن قاسم کو جو پہلی تحریر میں ہدایتیں بھیجیں اس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی تھیں:

خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو، صبر کرتے رہو، دشمن کے ملک میں پہنچو تو کشادہ جگہ میں اترو، جب ہاتھیوں کی فوج سامنے آئے تو الگ الگ ٹکڑیاں بناؤ اور جب وہ حملہ کریں تو ایک جگہ جم کر ان پر تیر برساؤ، برگستوان کو شیر اور ہاتھی کی شکل کا بناؤ (چچ نامہ حیدرآباد اڈیشن، ص ۹۹-۹۸)

"ہمیشہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہا کرو، دعائیں پڑھتے رہو، خدائے عزوجل کا ذکر ہر وقت زبان پر رکھو، توفیق الٰہی سے نصرت کے خواہاں رہو، خداوند تعالیٰ تم کو فتح دے گا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ العظیم کو اپنا مددگار بناؤ .... جب دشمنوں سے مقابلہ کرو تو خاموش رہو، اگر دشمن نعرے لگائیں، فحش بکیں اور لڑنے آئیں تو ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک حکم نہ پہنچے .... (ایضاً ص ۱۰۱)

"جو مال، متاع، ہاتھی، گھوڑے تمہارے ہاتھ آئیں، ان کو تم اپنی ملکیت نہ سمجھو، تاکہ تم اپنے یاروں میں نیک نام رہو، ہر ایک کا احترام کرو، اور سب کی دلدہی میں لگے رہو، لشکر کو جن چیزوں کی احتیاج ہو اس کو رفع کرنے کی کوشش کرو، جب علاقہ پر حکومت

یقینی ہو جائے اور قلعے محفوظ ہو جائیں تو جو کچھ بچے اس کو رعایا کی رفاہ اور بہبود میں خرچ کرنے میں دریغ نہ کرو۔ ان کے کھانے پینے کا پورا انتظام کرو، سپاہیوں کو مالِ غنیمت بھی دو اور ایسی فیاضی کرتے رہو کہ لشکر میں غلہ ارزاں ہو، کاشتکاروں اور تاجروں کے سامنے ہر قسم کی رعایت کرو، کیونکہ ان کی مرفہ حالی اور آسودگی سے ملک مزروع اور آباد رہتا ہے، اور اس طرح وہ تمہاری طرف بھی مائل رہیں گے۔ (ایضاً ص ۱۱۶)

"جو کوئی تم سے اقطاع یا ولایت کا طلب گار ہو تو اس کو ناامید نہ کرو، اس کے التماس کو قبول کرو، رعایا کو امان دے کر ان کے دلوں کو مضبوط کرو، بادشاہی کے چار ارکان ہیں، (۱) مدارا (یعنی خاطرداری)، مواساۃ (دلجوئی)، مسامحت (ہمدردی) مصاہرت (رشتہ داری)، (۲) مال اور عطیہ کا لینا دینا (۳) دشمنوں کی مخالفت میں صحیح رائے قائم کرنا، (۴) رعب، ہیبت، شہامت، قوت اور شوکت کا اظہار کرنا، ان باتوں سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہئے، راجہ جس بات کا التماس کریں، اس کا پورا عہد کر کے ان کو راہ پر لاؤ، جب وہ خدمت کے لیے آمادگی کا اظہار کریں اور مال گذاری خزانے میں ادا کرتے رہیں تو ان کو ہر طرح کی قوت پہنچاتے رہو، دشمنوں کے مکر و فریب سے بچتے رہو۔ .... مسلمانوں کا کوئی سفیر کہیں بھیجو تو اس کا مذہبی عقیدہ درست ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر بات کو رعب کے ساتھ جھجک کے بغیر کہہ سکے ، .... جو شخص وحدانیت الٰہی کا اقرار کرے اور تمہاری اطاعت قبول کر لے، تو اس کے تمام مال و اسباب، علاقے زمین اور کھیتی کو برقرار رکھو، اور جو اسلام قبول نہ کریں، ان کو اسی حد تک گزند پہنچاؤ کہ وہ مطیع ہو جائیں، جو لوگ تمرد اختیار کریں تو ان سے لڑنے کے لئے تیار رہو، ایسی جگہ جا کر لڑو جہاں زمین کشادہ ہو، تاکہ مرد مرد کے ساتھ اور شہ سوار شہ سوار کے ساتھ

میدان میں جولانیاں کرسکیں، جب لڑائی میں مصروف ہوجاؤ توکرم الٰہی پر توکل کرو (ایضاً ۱۲۹-۱۴۸)

محمد بن قاسم کا فیاضانہ برتاؤ

حجاج بن یوسف بڑا زبردست حاکم گذرا ہے، اس کے احکام کی سرتابی مشکل سے ہوا کرتی تھی، محمد بن قاسم اس کو اپنا شفیق بزرگ سمجھتا رہا، کیونکہ وہ اسکا چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ اس کا داماد بھی تھا، حجاج بھی اس کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس لیے دونوں کے فکر وعمل میں بڑی ہم آہنگی رہی، اسکے علاوہ محمد بن قاسم میں ذاتی طور پر غیر معمولی شرافت اخلاق اور شرافت نفس تھی، اس لیے اس نے نہ صرف حجاج کے احکام کی پوری تعمیل کی، بلکہ جنگ کے بعد اس نے اپنے مفتوحوں صلح خواہوں اور امن پسندوں سے جو روادارانہ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کیا، وہ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

سندھ پر فوج کشی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ لنکا کے راجہ نے حجاج بن یوسف کے پاس خیرسگالی کا ایک وفد بھیجا تو اس وفد کے ساتھ آٹھ جہاز تھے، جن میں راجہ کی طرف سے تحائف بھرے تھے، ان جہازوں میں ایک مسلمان تاجر کی بیوہ عورت اور یتیم لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں، اور مسلمان عورت اور مرد بھی حج کے ارادہ سے ان پر سوار ہوگئے تھے، یہ جہاز بلاد قازرون میں پہنچے تو باد مخالف کی وجہ سے دیبل کی طرف بہک گئے، یہاں کے بحری قزاقوں نے ان جہازوں کا سارا مال لوٹ لیا، اور مسافروں کو قید کرلیا، ان قیدیوں میں قبیلہ عزیر کی ایک عورت بے اختیار پکار اٹھی یا حجاج اغثنی (اے حجاج بچاؤ) حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بے تاب ہوگیا اور اس نے سندھ فتح کرنے کا مصمم ارادہ کیا، پہلے دو فوجی مہموں کو توناکامی ہوئی، لیکن محمد بن قاسم ہرطرح کامیاب رہا، وہ اردبیل فتح کرکے دیبل کی طرف بڑھا اور جب اس کو فتح کرنے میں لگا ہوا تھا تو ایک برہمن اس کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ہماری نجوم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ لشکر اسلام کی فتح ہوگی، پھر ایک

جوتشی نے آکر فتح کی بشارت دی، اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر میرے اہل وعیال کے جان ومال کو امان دیجائے تو وہ ان مسلمان قیدیوں کا پتہ بتا سکتا ہے جو لنکا کے جہاز پر سے گرفتار کر لیے گئے ہیں، محمد بن قاسم نے اس کو امان دی اور اسی کی مدد سے وہ قیدی محمد بن قاسم کے پاس لائے گئے، یہ قیدی ایک ایسے شخص کی حراست میں تھے جو عاقل، دانا، پرہیزگار اور ادیب بھی تھا، محمد بن قاسم نے اس کو سزا دینا چاہا، لیکن اس نے عرض کیا کہ قیدی خود بتائیں گے کہ اس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، قیدیوں نے بالاتفاق کہا کہ اس نے ہماری تواضع و مدارات کی جس کے لیے ہم اس کے شکر گذار ہیں، اور وہ ہمیشہ اسلامی لشکر کی خوش خبری سے ہمارے دلوں کو تسکین دیتا رہا، یہ سنکر محمد بن قاسم نے اس شخص کو معاف کر دیا جس کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا، محمد بن قاسم نے خوش ہوکر اس کو دیبل میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور یہ پورا علاقہ اس کی امارت میں دیدیا (ایضاً ص ۱۰۹)

مفتوحین سے حسن سلوک | نیرون کے محاصرہ کے بعد جب محصورین نے اس کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا تو اس کی خبر محمد بن قاسم نے حجاج کو دی، اس نے فوراً لکھا کہ جو تم سے امان چاہتے ہیں ان کو پناہ دو، اگر کسی جگہ کے اکابر تم سے آکر ملیں تو ان کو قیمتی خلعت دو اور ان کو اکرام و انعام سے سرفراز کرنا ضروری سمجھو، عقل کو اپنا پیشوا بناؤ تاکہ اس علاقہ کے امرا اور معارف تمھارے قول و فعل پر اعتماد کریں، محمد بن قاسم نے ان ہدایات پر عمل کیا، اور نیرون کے حاکم کو کہلا بھیجا کہ اب جب کہ قلعہ کا دروازہ کھل گیا ہے، تمھارے اکرام و احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، اس پیام کے بعد نیرون کا حاکم بہت سے تحائف لے کر محمد بن قاسم کے پاس آیا، پھر اپنے قلعہ میں واپس ہوکر محمد بن قاسم کی ضیافت کی، اور برابر اس کے پاس تحفے بھیجتا رہا، لشکر میں غلہ کی کمی تھی جسکو اس نے پورا کیا۔ (ص ۱۱۱

محمد بن قاسم کے اس سلوک کا اثر سندھ کے اور دوسرے باشندوں پر بھی پڑا، جب وہ سیوستان کی طرف بڑھا تو اس کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجا بجھرا (بجے رائے) تھا، وہاں کے بودھوں اور دوسرے لوگوں نے بجھرا کے پاس ایک عرضداشت بھیجی کہ ہم کو معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے پاس امیر حجاج کا فرمان ہے کہ جو شخص اس سے امان مانگے اس سے عہد و پیمان کر کے اس کو اپنی پناہ میں لے لو، اہل عرب بہت باوفا ہیں، وہ جس بات کا وعدہ کر لیتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں، بہتر ہے کہ ہم ان سے عہد و پیمان کر لیں، بجھرا نے لوگوں کی باتیں نہ مانیں، لڑائی ہوئی اور اس کو شکست ہوئی، جس کے بعد سیوستان کے لوگوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی، سیوستان تک اسلامی لشکر کو پہنچانے میں نیرون کے حاکم نے ہر طرح مدد کی، (ص ۱۳۰ - ۱۱۹)

محمد بن قاسم سیوستان سے سیسم کی طرف بڑھا، تو راستہ میں راجہ داہر کے ایک ماتحت حاکم کاکا کوتک نے اس کی اطاعت قبول کر لی، وہ مذہبًا بودھ تھا، جب اپنے ماتحت سرداروں اور معتمدوں کے ساتھ محمد بن قاسم کے پاس پہنچا تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، محمد بن قاسم نے اس سے پوچھا، اے امیر ہند! تمھارے یہاں خلعت دینے کی کیا رسم ہے، کاکا نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں یہ رسم ہے کہ خلعت پانے والے کو کرسی دیجاتی ہے، اس کو ریشم اور حریر کے ہندو وضع کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور اس کے سر پر پگڑی باندھی جاتی ہے، محمد بن قاسم نے کاکا کو اسی طرح خلعت عطا کیا جس سے نواح کے لوگوں پر اطاعت گذاری کا بڑا اچھا اثر پڑا، محمد بن قاسم اور کاکا سے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے، اس دوستی سے اسلامی لشکر کو آیندہ فتوحات میں بڑی مدد ملی، کاکا نے بھی اسلامی طاقت سے ہر قسم کے فوائد حاصل کیے، اسکے پاس بڑی دولت جمع ہو گئی اور اسکے ....

دشمن اس کی راہ سے ہٹ گئے۔ (ص ۱۲۴-۱۲۲)

محمد بن قاسم سنہ ۹۳ھ میں قلعہ اشبہار کو فتح کر کے دریائے سندھ کے مغربی کنارے آیا، تو سورتھ کے حاکم موکہ بن بسایا نے بیس سرداروں کے ساتھ اس کے سامنے سپر ڈالدی، جب یہ لوگ اس کے پاس آئے تو موکہ کو کرسی پر بیٹھایا، ایک لاکھ درہم بطور انعام عطا کیے، ایک سبز چتر بھی مرحمت کیا، جس کی چوٹی پر مور بنا ہوا تھا، علاقہ بیٹ کی حکومت بھی اسکے سپرد کی، اور ایک عہد نامہ لکھکر دیا کہ اس علاقہ کی حکومت اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے گی، اس کے سرداروں کو بھی خلعت اور گھوڑے دیے، ان عنایتوں کی وجہ سے موکہ عربوں کا بڑا وفادار بن گیا، اس نے آیندہ فتوحات میں ہر قسم کی مدد پہنچائی (۱۳۶-۱۳۵)

ضرورت سے زیادہ رواداری پر حجاج بن یوسف کا انتباہ

راجہ داہر اپنے ماتحت حاکموں کو اس طرح محمد بن قاسم سے ملتے دیکھ کر بہت پریشان ہوا، اس نے اپنے بیٹے جے سیہ (جے سنگھ) کو عربوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بیٹ کی طرف روانہ کیا، وہ بڑھکر دریائے اٹک کے ساحل پر مقیم ہوا، یہاں پچاس روز تک دونوں فوجیں قریب ہی پڑی رہیں، محمد بن قاسم کے لشکر میں قحط پڑ گیا، گھوڑے بڑی تعداد میں مرنے لگے، راجہ داہر خوش ہوا، اور طنز آمیز باتیں لکھکر اس کو صلح کا پیغام بھیجا، یہ معلوم کر کے حجاج نے مزید گھوڑے اور سامان بھیجے، محمد بن قاسم کی ضرورت سے زیادہ رواداری سے اندیشہ ناک ہو کر بطور انتباہ یہ لکھا کہ تم دشمنوں کو امان دینے میں بڑے حریص ہو گئے ہو، یہ امر مجھکو مکروہ معلوم ہوتا ہے جس دشمن کی عداوت کا امتحان ہو چکا ہو اس کو امان دینا مناسب نہیں، وضیع اور شریف کو ایک سطح پر نہیں رکھنا چاہیے، عقل سے اس طرح کام انجام دو کہ دشمنوں کو تمھارے عجز کا خیال نہ ہو، مدت سے تم دشمنوں کے مقابل میں پڑے ہو، تم صلح کی کوشش کرتے ہو، اس صلح جوئی کو لوگ تمھارے

فتور وقصور پر محمول کریں گے، تم اپنی سیاست اور شہامت کو بکار رکھو، اپنی سہم وفہم پر بھروسہ کرو، راست گو اور قوی رائے بنے رہو، غفلت کو راہ نہ دو، عزم مصمم کے ساتھ خدا کے آگے دل وجان کو حاضر رکھو۔ (چچ نامہ ص ۱۵۲ - ۱۵۱)

محمد بن قاسم کے ساتھ ٹھاکروں اور جاٹوں کا تعاون

موکہ بن بسایا نے اس سلسلے میں مدد کے طور پر کشتیاں فراہم کیں، بھیم کے ٹھاکروں اور پچھم کے جاٹوں کو لیکر حاضر ہوا اور سا کرہ کے سرداروں کو جزیرہ بیٹ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ غنیم کی پیش قدمی کو روکیں (ایضاً ص ۱۵۵) راجہ داہر کی ایک فوج سے محمد بن قاسم کے لشکر کی مڈبھیڑ رجھور کے مقام پر ہوئی، موکہ کا بھائی راسل داہر کی فوج کے ساتھ تھا، کیونکہ داہر نے بیٹ کا علاقہ اس کے سپرد کر دینے کا وعدہ کیا تھا، داہر کی فوج کو شکست ہوئی تو راسل محمد بن قاسم سے آکر مل گیا جب وہ اس کے پاس آیا تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے کہا کہ تم آگئے ہو تو مل کر رہو، تمھارے ساتھ ہر قسم کی عنایتیں کی جائیں گی، جو علاقہ تم مانگو گے تم کو دیا جائیگا، راسل نے جواب دیا کہ آپ نے رہین منت کیا ہے تو آپ کی اطاعت برابر کرتا رہوں گا (ایضاً ص ۱۶۶) راسل اور موکہ دونوں نے مل کر محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے اور مقامی جھیل اور ندی پار کرنے میں رہنمائی کی، اور دونوں نے اسلامی لشکر کا قبضہ جے پور نامی ایک گاؤں پر کرا دیا، جو فوجی لحاظ سے اہم مقام تھا۔ (ایضاً ص ۱۶۷)۔ راجہ داہر کو خبر ملی تو اس نے خود فوج لے کر بڑھا، اور یکم رمضان ۹۳ھ کو طرفین کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی، کئی روز تک جنگ جاری رہی، اس درمیان میں چند برہمن محمد بن قاسم کے پاس آئے امان کی درخواست کی اور پھر انھوں نے اطلاع دی کہ راجہ داہر کی فوج عقب سے غیر محفوظ ہے، اس اطلاع پر محمد بن قاسم کے سرداروں نے ان برہمنوں کی معیت میں زبردست

حملہ کیا جس سے غنیم میں ابتری پھیلی (ایضاً ص ۱۷۷) پانچ روز تک لڑائی ہوتی رہی، آخری روز راجہ داہر مارا گیا (ص ۱۸۱) پھر راجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ اور اس کی ایک دوسری بیوی رانی بائی نے راور کے قلعہ میں محصور ہو کر محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا لیکن راور بھی فتح کر لیا گیا، رانی تو ستی ہو گئی، اور جے سنگھ برہمن آباد چلا گیا، (ایضاً ص ۱۹۴) محمد بن قاسم برہمن آباد کی طرف بڑھا تو راستہ میں بہرور اور دہلیلہ کے قلعوں کو فتح کر لیا، (ایضاً ص ۱۹۸)

راجہ داہر کے وزیر کی عزت افزائی دہلیلہ کی فتح کے بعد راجہ داہر کا وزیر سی ساکر محمد بن قاسم سے امان کا طلب گار ہوا، اسلامی لشکر میں آیا تو محمد بن قاسم اس سے بڑی عزت کے ساتھ ملا، اس کی تعظیم و تکریم میں کسی بات کی فرو گذاشت نہیں کی، اس کے استقبال کے لیے اپنے امراء کو بھیجا، اور پھر اپنا وزیر بنا لیا جس کے بعد وہ مسلمانوں کے معاملات کا مشیر ہو گیا، محمد بن قاسم نے اپنا سارا راز اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا، اپنے علاقہ کے معاملات، حکومت کے انتظامات اور مہمات کی تفصیلات کے بارے میں اس سے صلاح و مشورہ کرنے لگا، ایک روز سی ساکر نے اس سے کہا "اے امیر عادل! آپ نے زمین کی مالگذاری قدیم رسم و رواج کے مطابق مقرر کی ہے، اس میں دست درازی نہیں ہوتی ہے، رعایا کی گردن پر کسی محصول کا بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے، اس سے رعیت نہایت خوش ہے، رعایا نوازی اور عدل گستری کا ایسا آئین و دستور ہے جس سے سارے دشمن پامال ہوں گے، رعایا خوش رہے گی اور ملک فتح ہوگا، (ص ۲۰۰ نیز دیکھو تاریخ ہندستان جلد اول از ذکاء اللہ ص ۲۱۲)

برہمن آباد کے باشندوں اور برہمنوں کے ساتھ حسن سلوک دہلیلہ سے محمد بن قاسم برہمن آباد کی طرف بڑھا، تو جے سنگھ کے سپاہی یلغار کر کے اس کے لشکر میں رسد پہنچنے نہیں دیتے اور

طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے، محمد بن قاسم نے اس کی اطلاع موکہ کو دی تو وہ ان تخریبی کارروائیوں کو روکنے کے لیے ایک لشکر کے ساتھ پہنچا اور اس کے ساتھ مسلمان فوجی امرا نباتہ بن حنظلہ کلابی، عطیہ ثعلبی، صارم بن ابی صارم ہمدانی، عبدالملک مدنی بھی ہوئے، ان سب کا سردار موکہ ہی کو بنایا گیا جس نے آگے بڑھکر جے سنگھ کو ایسا خوفزدہ کیا کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کشمیر کی طرف روانہ ہوگیا۔ (ص ۲۰۲-۳)

برہمن آباد پہنچ کر محمد بن قاسم نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کیا، جو چھ مہینے تک جاری رہا موکہ بھی ساتھ رہا، اس نے محمد بن قاسم کے دوران محاصرہ میں مشورہ دیا کہ یہ قلعہ [illegible] شہروں کی آبرو ہے، اگر یہ قبضہ میں آگیا تو سارا سندھ اس کے زیر نگیں آجائیگا اور دوسر مستحکم قلعے ماتحت ہوجائیں گے، داہر کی اولاد یا تو مطیع ہوجائے گی یا بھاگ کھڑی ہوگی، (ایضاً ص ۲۰۵)۔ محصورین نے سپر ڈال دی، وہ امان کے طلب گار ہوئے تو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ جو کوئی لڑے تو اس کو مارو، ورنہ کسی اور پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، قلعہ والوں میں سے جس نے محمد بن قاسم کے آگے آکر سر جھکا دیا، اس کا سر اس نے اونچا کیا، اس کو امان دی، اور اس کو اس کے گھر میں آباد کیا۔ (ایضاً ص ۲۰۶) قیدیوں میں داہر کی ایک رانی لادی نامی بھی تھی، داہر کی دو بیٹیاں بھی تھیں، جو اس کی دوسری رانی کے بطن سے تھیں، وہ جب محمد بن قاسم کے سامنے لائی گئیں تو ان کے چہروں پر نقاب ڈال کر علیحدہ بٹھائی گئیں، (ایضاً ص ۲۰۷) بعد میں محمد بن قاسم نے ولید بن ملک اور حجاج کی اجازت سے رانی لادی کو خرید لیا اور سیاسی مصلحت کی بنا پر اس سے نکاح کر لیا، قلعہ کے کاریگروں، تاجروں، پیشہ وروں اور عام لوگوں کو امان دی گئی، قیدی رہا کر دیے گئے، قلعہ کے برہمنوں کو دکھ تھا کہ ان کو شکست ہوئی، وہ مجبور اکر کے محمد بن قاسم کے پاس آئے، زرد لباس پہنے ہوئے تھے،

ماتم کرتے ہوئے محمد بن قاسم سے کہا کہ اے امیر ! ہمارا راجہ برہمن تھا، تم نے اس کو قتل کیا، اس کے جو وفادار تھے وہ تو لڑ کر مر گئے، ہم زرد لباس پہنے اور ماتم کرتے ہوئے تمھارے پاس آئے ہیں، تم ہم لوگوں کے متعلق کیا حکم دیتے ہو، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ میں اپنے سر و جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تم بڑے وفادار ہو، میں تم کو امان دیتا ہوں، اس شرط پر کہ تم داہر کے ماننے والوں کا پتہ بتا دو، برہمنوں نے اس کی تعمیل کی۔ (ایضاً ص ۲۰۸)

برہمنوں کی ایمانداری پر بھروسا اس کے بعد محمد بن قاسم ملکی انتظام میں لگ گیا، جو لوگ اپنی خوشی سے اسلام لائے ان کے حقوق عربوں کی طرح ہو گئے، اور جنھوں نے اسلام قبول کرنا پسند نہیں کیا، ان کو جنگی ٹیکس یعنی جزیہ دینا پڑا، جو لوگ مالدار تھے ان سے فی کس ۴۸ درہم نقرئی یعنی تقریباً ۱۲ ۱/۲ روپے، متوسط درجہ کے لوگوں سے فی کس ۲۴ درہم یعنی چھ روپے، اور کم حیثیت لوگوں سے بارہ درہم یعنی تین روپئے سالانہ وصول کئے گئے، اس کے بدلے میں ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنے اسلاف کے مذہب پر قائم رہیں، اور اپنی ساری ملکیت یعنی کھیت اور گھوڑے اپنے قبضہ میں رکھیں، (ایضاً ص ۹-۲۰۸) برہمن آباد وہاں کے امینوں کے حوالہ کر دیا گیا، اور ہر ایک امین سے اس کی حیثیت کے مطابق نذر مال گذاری ادا کرنے کا وعدہ لیا گیا۔ قلعہ کے چار دروازوں کا اہتمام بھی ان ہی کے سپرد کر دیا گیا، ہندوستان کے رسم و رواج کے مطابق ان کے ہاتھ پانوں کے لیے ان کو سونے کے کڑے اور گھوڑے مع زین کے دیے گئے، ان میں سے ہر ایک کے لیے دربار میں جگہ مقرر کی گئی، جن تاجروں، صناعوں اور کاشتکاروں کو نقصان پہنچا تھا ان کے لیے حکم صادر کیا گیا کہ خزانے سے ان کو چاندی کے بارہ درہم دیے جائیں، (ایضاً ص ۲۰۹) محمد بن قاسم برہمنوں کی طرف زیادہ مائل ہوا، ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا، کیونکہ اس کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ

ایماندار ہوتے ہیں، اس کے ساتھ دغا نہ کریں گے، وہ ان کو عہدے یہ کہکر دیتا کہ یہ نسلاً بعد نسلٍ تمہارے یہاں برقرار رہے گا، دوسروں کو نہیں دیا جائے گا، اس کا اچھا اثر یہ پڑا کہ یہ برہمن علاقہ میں ہر جگہ جاکر یہ کہنے لگے کہ اگر یہاں کے لوگ عربوں کی نیازمندی کریں گے تو وہ انکے مورد فضل وکرم ہونگے، (ایضاً ص ۲۱۰-۱۱) چنانچہ کاشتکار وغیرہ خود محمد بن قاسم کے پاس آئے اور خراج دینا قبول کر لیا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن عمال کو ہدایت دی کہ سلطان اور رعایا کے درمیان پوری سچائی سے معاملات طے کیے جائیں، اگر تقسیم کا معاملہ ہو تو دونوں میں نصفا نصف طے کیا جائے، خراج اتنا مقرر کیا جائے کہ یہ ادا ہو سکے، خراج دینے والوں کے ساتھ زیادتی نہ کیجائے، تاکہ ملک خراب نہ ہونے پائے۔ (ایضاً ص ۲۱۱)

عام لوگوں کے ساتھ نرمی یہ تو برہمن عمال کو ہدایت دی گئی، پھر محمد بن قاسم نے تمام لوگوں کو علٰحدہ بلاکر ان سے کہا کہ تم ہر طرح خوش رہنے کی کوشش کرو، کسی بات کا اندیشہ نہ لاؤ، تم سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے گا، میں تم سے خراج کے لیے کوئی دستاویز یا قبالہ نہیں لکھاتا ہوں، جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے اس کو ادا کرتے رہو، وصولی میں بھی تمھارے ساتھ نرمی اور رعایت کی جائے گی، تمھاری ہر درخواست کی شنوائی ہوگی، شافی جواب پاؤگے، اور تمھاری ہر مراد پوری ہوتی رہے گی۔ (ایضاً ص ۲۱۲)

مندر میں عبادت کی عام اجازت برہمن آباد میں ایک بہت بڑا مندر تھا، لڑائی کے زمانہ میں یہاں لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، فتح کے بعد بھی لوگ خوف کی وجہ سے یہاں نہیں آتے جاتے تھے، جس سے اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی، مندر کے برہمن اور مہنت فاقہ کرنے لگے، ایک روز وہ محمد بن قاسم کے دروازے پر آئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا اے امیر عادل! آپ کو بقا حاصل ہو، ہم مندر کے پجاری ہیں، ہم کو اسی مندر سے روزی ملتی ہے، آپنے سب پر رحم کیا،

سوداگروں کو مال دلوادیا، تاجروں کی تجارت کھلوادی، اوروں کو ذمی بناکر اپنے کاموں میں لگا دیا، ہم کو کرم خداوندی سے امید ہے کہ آپ ہندوؤں کو حکم دیں گے کہ وہ مندر میں آکر اپنے معبود کی پرستش کریں، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ تمھارا مندر راور کے دارالسلطنت سے متعلق ہے، اس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہے، ہندوؤں نے عرض کیا کہ یہ مندر برہمنوں سے متعلق ہے، یہ ہمارے پنڈت اور پروہت ہیں، ہمارے یہاں کی شادی اور غمی میں وہی رسمیں ادا کرتے ہیں، ہم نے خراج دینا اسی لیے قبول کرلیا ہے کہ ہم میں ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی، ہمارا مندر خراب ہو رہا ہے، ہم وہاں جاکر پوجا کرنے سے محروم ہیں آپ اس کی مرمت کرادیں تاکہ ہم وہاں جاکر پوجا کریں، اور ہمارے برہمنوں کی وجہ معاش ہو، محمد بن قاسم نے یہ ساری باتیں حجاج کو لکھکر بھیجیں، وہاں سے جواب آیا کہ

> حالات معلوم ہوئے، اگر برہمن آباد کے مقدم اپنا مندر بنانا چاہتے ہیں تو اب جبکہ انھوں نے ہماری اطاعت قبول کرلی ہے اور دارالخلافت میں مال کے ادا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے تو اس مال کے علاوہ ان پر ہمارا کوئی اور حق نہیں، جب وہ ذمی ہوگئے ہیں تو ان کے جان و مال میں کسی طرح کا تصرف صحیح نہیں، ان کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، مذہب کی پیروی میں کسی شخص پر زجر نہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر میں جس طرح چاہے رہے۔

پرانے مراسم کا تحفظ | حجاج کے اس فرمان کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے اہم لوگوں مقدموں اور برہمنوں کو بلاکر حکم دیا کہ وہ اپنے مندر کی تعمیر کرائیں، مسلمانوں کے ساتھ خرید و فروخت کریں، بے خوف و خطر رہیں، اپنے حال کو بہتر بنانے میں کوشاں رہیں بھکاری برہمن کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اپنے باپ دادا کے مراسم کو بجا لائیں، برہمنوں

کو جو صدقے یعنی دکھشنا دیے جاتے تھے وہ اب بھی دیے جائیں، مالگذاری کے سو درہم میں تین درہم برہمنوں کے لیے علیحدہ کر دیے جاتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت ان کی مدد ہوتی رہے، اور بقیہ رقم خزانہ میں داخل کر دی جاتی تھی، تاکہ اس میں خیانت نہ ہو، یہ روایت باقی رکھی جائے، امراء جو مواجب برہمنوں کو دیا کرتے تھے، وہ پہلے کی طرح دیا کریں، برہمنوں کو اس کی بھی اجازت دی گئی کہ وہ بدستور سابق ایک تانبے کا برتن لیکر گھر گھر جائیں، غلہ مانگا کریں تاکہ وہ بھوکے نہ مریں، محمد بن قاسم نے برہمنوں کی تمام باتوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے مندر ایسے ہیں کہ جیسے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے آتشکدے ہیں، ان کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں عبادت کریں، محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے مقدموں کو رانا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (ایضاً ص ۱۴-۲۱۳)

رعیت نوازی کی تلقین

اس نے لوہانہ کے جاٹوں کی قدیم روایات کو برقرار رکھا، گو وہ بہت ہی وحشیانہ تھیں لیکن ان میں دخل اندازی کرنا پسند نہیں کیا، حجاج نے ایک دوسرے مراسلہ میں محمد بن قاسم کی سپہ داری، رعیت نوازی، ملکی انتظام اور رفاہ عام کے کاموں کی تعریف کی، کیونکہ جو خراج مقرر کیا گیا تھا وہ پابندی سے وصول ہو جاتا تھا، پھر ایک دوسرے خط میں ہدایت دی کہ وہ رعیت نوازی اور عدل گستری کا ایسا نمونہ پیش کرے کہ اس کا نام روشن ہو، اور دشمن اس کی اطاعت کے آرزومند ہوں۔ (ایضاً ص ۷۱۲)

صناعوں، تاجروں اور کسانوں کی حوصلہ افزائی

محمد بن قاسم برہمن آباد سے چل کر منھل پہنچا، تو وہاں کے سمانی باشندوں کے سرداروں اور تاجروں نے اطاعت قبول کر لی، تو ان کو امان دی گئی کہ وہ مالگذاری پابندی سے ادا کرتے رہیں اور اپنے وطن میں اطمینان کی زندگی بسر کریں، محمد بن قاسم نے ان ہی کے ہر فرقہ کے ایک آدمی کو سردار مقرر کیا اور جب اس کی خبر حجاج

کو دی گئی تو اس نے لکھا کہ جو اطاعت قبول کریں تو ان کے حلق میں صفائی کا پانی جاری کردو، ان کو امان دو، ان کے صناعوں اور تاجروں پر زیادہ بار نہ ڈالو، اور جو زراعت اور عمارت میں تن دہی سے کام کرتے ہوں ان کو مالی مدد کر کے ان سے خاطر تواضع سے پیش آؤ، جو لوگ اسلام لے آئیں ان سے زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ یعنی عشر لو، اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں تو وہ قدیم دستور کے مطابق اپنی صنعت و زراعت میں سے اتنا ہی مال ادا کریں جتنا وہ پہلے دیتے آئے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

مقامی باشندوں کے ناچ پر انعام

محمد بن قاسم کے رحم و کرم کی شہرت ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ جب وہ منہل سے قوم سمہ کے حدود میں لوہانہ پہنچا تو وہاں کے لوگ ناچتے اور ڈھول بجاتے ہوئے اس کے استقبال کے لیے آئے اور کہا کہ ان کے یہاں جب کوئی نیا بادشاہ یا والی آتا ہے تو وہ اس کا اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں، محمد بن قاسم اس ناچ سے محظوظ ہوا اور اس نے اپنے فوجی سردار خریم بن عمر سے بیس دینار سرخ انعام دلوائے۔ (ایضاً ص ۲۱-۲۲۰)

راجہ داہر کی رانی کا تعاون

محمد بن قاسم لوہانہ سے سہتہ پہنچا تو وہاں کے سردار اور کاشتکار ننگے پاؤں اور ننگے سر اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور امان کے خواہاں ہوئے، ان سے خراج لے کر ان کو امان دی گئی، اور ان ہی میں سے کچھ لوگوں نے عرب فوج کی رہبری الور تک کی جو سندھ کا بہت بڑا شہر اور پایہ تخت تھا، اس وقت یہاں راجہ داہر کا لڑکا گوپی (یا توفی) فرماں روا تھا۔ اس نے وہاں کے لوگوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے اور وہ ہند سے لشکر لا کر عربوں سے فیصلہ کن جنگ کرے گا، وہ قلعہ میں محصور ہو کر عربوں سے لڑنے میں مشغول ہوا، اس وقت تک رانی لادی محمد بن قاسم کے اخلاق حمیدہ سے متاثر ہو کر اس کی اطاعت گزار بیوی بن چکی تھی، اس نے سیاہ اونٹ پر سوار ہو کر

قلعہ والوں کو پکار پکار کر راجہ داہر کی موت کا یقین دلایا، اور ان کو امان طلب کرنے کی تلقین کی لیکن قلعہ والے سمجھے کہ یہ چنڈالوں اور گائے کھانے والوں کا محض فریب ہے، کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا، آخر میں گوپی قلعہ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، قلعہ والوں نے امان طلب کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھا، ان کو بھی امان دی گئی، محمد بن قاسم قلعہ میں داخل ہوا تو ایک مندر (نوبہار) سے گذرا، وہ اس کے اندر چلا گیا، دیکھا کہ ایک سنگ مرمر کے گھوڑے پر ایک عورت سوار ہے، جس کے دونوں ہاتھوں میں یاقوت وجواہرات کے کنگن ہیں، اس نے عورت کے ایک ہاتھ سے کنگن اتار لیا، اور ایک پجاری سے مخاطب ہوکر بولا کہ تمھارے معبود کو خبر نہیں کہ اس کے ہاتھوں میں دو کنگن کے بجائے ایک رہ گیا ہے" یہ سن کر پجاری نے گردن نیچی کر لی، محمد بن قاسم نے ہنس کر بت کے ہاتھ میں کنگن ڈال دیا، اس کے بعد اس نے اعلان کیا کہ غیر فوجی لوگوں کو امان دی جائے، اور جو شخص مقابلہ کرے اس کو ہلاک کیا جائے،

معاہدے کی پابندی کا احترام مقابلہ کرنے والوں میں ایک شخص آگے بڑھ کر بولا کہ میں ایک عجیب بات ظاہر کرنا چاہتا ہوں، جو میں امیر کے سامنے ظاہر کروں گا، وہ محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا، تو اس نے کہا کہ میں اس شرط پر ظاہر کروں گا کہ میرے اہل وعیال کے ساتھ مجھکو بھی امان دی جائے، محمد بن قاسم نے کہا میں نے تجھکو امان دی، اس نے پھر کہا کہ امان نامہ عنایت ہو اور اس پر دستخط ہوں، محمد بن قاسم کو خیال ہوا کہ شاید اسکے پاس بیش قیمت جواہرات یا زیورات ہوں اس لیے امان نامہ پر دستخط کرکے اس کے ہاتھ میں دیدیا، اس کے بعد اس شخص نے اپنی داڑھی اور مونچھوں اور بالوں کو دراز کیا، اپنے پاؤں کی انگلیاں سر سے لگائیں، پھر رقص کرنے لگا، اور یہ کہتا جاتا تھا کہ ایسی عجیب

بات کبھی ظاہر نہیں ہوئی ہوگی، محمد بن قاسم کو تعجب ہوا کہ یہ کون سی عجیب بات ظاہر کرنے کے لائق تھی لشکریوں نے کہا کہ اس نے فریب دیا، اس کو امان نہ دی جائے، مگر محمد بن قاسم نے کہا قول قول ہے اور عہد عہد ہے، اس سے پھرنا بڑے آدمیوں کا کام نہیں، اس کو ہلاک کرنے کے بجائے قید میں رکھا جائے، اور حجاج کا بھی فیصلہ معلوم کیا جائے، اس کو اس کے خاندان کے بائیس ۲۲ آدمیوں کے ساتھ قید خانہ بھیج دیا گیا، حجاج کو اس معاملہ کی خبر بھیجی گئی، تو اس نے علماء کا فتویٰ لے کر یہ حکم بھیجا کہ اس آدمی کو آزاد کر دیا جائے، تاکہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔ (ایضاً ص ۲۲۸ - ۲۲۱)

راجہ داہر کے چچازاد بھائی پر اعتماد کلی

محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر بابیہ کا محاصرہ کیا، اس کے قلعہ کا حاکم ککسہ تھا جو راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، اس نے محمد بن قاسم کو نذرانے بھیجے، جس کے بعد عرب کے سپہ سالار نے اس کی بڑی خاطر کی، وہ بڑا عالم و حکیم بھی تھا، اس لیے محمد بن قاسم نے اس کو اپنا وزیر بنالیا، اور وہ تمام کلی و جزئی باتوں کا مشیر ہو گیا، اس کو تخت کے آگے بٹھایا جاتا، پھر تمام افسروں اور سپاہیوں کا افسر بنا دیا گیا، تمام نواحی علاقے اس کے سپرد کر دیے گئے، خزانہ کی کنجیاں بھی اس کے حوالہ کر دی گئیں، اور مبارک مشیر کا خطاب دیا گیا، وہ بھی محمد بن قاسم کا یار بن کر اس کی آیندہ لڑائیوں میں شریک رہا (ص ۲۳۶ - ۲۳۵)

برہمن کی خیر خواہی

محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو ایک برہمن نے اس پر یہ راز ظاہر کیا کہ یہاں ایک جگہ حوض ہے، جس کا دور ایک سو گز ہے، اس کے وسط میں ایک پچاس گز دور کا ایک مندر ہے، اس میں ایک کمرہ دس گز لمبا اور آٹھ گز چوڑا ہے، اس کے اندر بڑی دولت چھپا رکھی گئی ہے، اس کو پاٹ کر کے اس کے اوپر ایک مندر بنا دیا گیا ہے، جس میں سونے کی ایک

مورتی نصب کر دی گئی ہے، اور حوض کے گرد درخت لگا دیے گئے ہیں، محمد بن قاسم وہاں پہنچا تو وہاں اس کو دو سو تیس من سونا اور تیرہ ہزار دو سو من سونے کی خاک تانبے کے ٹکڑوں میں ملی (ایضاً ص ۲۴۰)

محمد بن قاسم کی موت پر ماتم

ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر سرحدی قلعوں کو فتح کیا، اور کیرج کے تسخیر کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کو حجاج کی وفات کی خبر ملی، یہ ۹۵ھ تھا، سندھ عراق کے حاکم کے ماتحت تھا، اس لئے محمد بن قاسم وہاں کے حاکم کی حمایت سے محروم ہو گیا، حجاج کے مرنے کے آٹھ مہینے کے بعد ۹۶ھ میں ولید بن عبد الملک کا بھی انتقال ہو گیا، اس کے بعد سلیمان تخت پر بیٹھا، جس کو حجاج سے عداوت کی حد تک اختلاف تھا، حجاج گو مر چکا تھا، لیکن اس کے حامیوں سے سلیمان نے انتقام لیا، سلیمان نے عراق کا حاکم یزید بن مہلب کو بنایا، جو حجاج اور اس کے خاندان کا پرانا دشمن تھا، وہ عراق کا حاکم بنا تو محمد بن قاسم اس کی نظروں میں کھٹکا، اس نے اس کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو مقرر کر دیا، اور جب محمد بن قاسم کیرج یا کورج فتح کر چکا تھا تو یزید نے سندھ پہنچکر اس کو گرفتار کر لیا، اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پانوں میں بیڑی ڈال کر عراق روانہ کر دیا، جہاں وہ قید خانہ میں ڈال دیا گیا، اور وہیں وفات پا گیا، عرب اور سندھ کے لوگ اس المیہ پر خون کے آنسو بہاتے رہے، ایک عربی شاعر حمزہ بن بیض الحنفی نے اپنے عربی مرثیہ میں کہا کہ بہادری، دل کی بڑائی اور فیاضی محمد بن قاسم کے حصہ میں تھی، وہ سترہ سال ہی کی عمر میں فوجوں کا سردار بن گیا، یہ سرداری زمانۂ ولادت سے کس قدر قریب تھی، ایک اور شاعر نے کہا محمد سترہ برس ہی کی عمر میں لوگوں کا سردار بن گیا، حالانکہ اس وقت اسکے ہم عمر شباب کی سرمستیوں اور دنیا کی رعنائیوں

میں فریفتہ ہو کر سیادت و قیادت کی حقیقت سے بے خبر اور غافل تھے۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴، ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول، شائع کردہ دار المصنفین ص ۱۰۲)

بلاذری ہی کا بیان ہے کہ اہل ہند نے محمد بن قاسم کے غم میں گریہ وزاری کی اور اس کا ایک مجسمہ کیرج میں تیار کیا۔ (فتوح البلدان ص ۴۴۰)

محمد بن قاسم کے کارنامے پر تبصرہ شمس العلماء ذکاء اللہ نے محمد بن قاسم کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اگرچہ محمد بن قاسم کی نوعمری اور شباب کا عالم تھا، مگر وہ بڑا مدبر اور شجاع تھا شمشیر اور تدبیر دونوں سے کام لیتا تھا، اگر اتفاقیہ کہیں شمشیر سے کچھ ستم کیا تو تدبیر سے اسکی مکافات بھی ضرور کی، اگر کہیں بتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ تبخانوں کی مرمت کرنے کا بھی حکم دیدیا، اگر کہیں لوٹ مار سے دشمنوں کو خستہ حال کیا تو ان کو بیت المال سے معاوضہ بھی دلادیا، قدیم قاعدہ جو ہندوؤں کا تھا کہ زر مالگذاری میں سے تین فیصدی خزانہ شاہی میں اسلیے داخل کرتے تھے کہ اس روپیہ سے برہمنوں کو خدمات کا معاوضہ دیا جائے وہ اس نے بدستور قائم رکھا، یہاں جو شخص ہندی سندی ذی لیاقت اس کو ملا اس کی قدر شناسی کی، بلکہ یہاں کے لائق آدمیوں کو اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور سرفراز کیا، اس نے یہاں کے وزیروں کو وزیر اور مشیر اپنا مقرر کیا اور اپنے پاس ان کو رکھا، غرض مردم شناسی اور دلجوئی اس پر ختم تھی، دشمنوں کے ساتھ جو اس نے نیک سلوک کیے تھے، وہ کمتر کوئی کیا کرتا ہے۔

(تاریخ ہندوستان ج ۱ ص ۲۴۵)

موجودہ دور کے ہندو مورخین مسلمانوں کے دور کی تاریخ پر تبصرہ کرنے میں اپنے

ذاتی اور قومی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، پھر بھی ان کے قلم سے تعریفی کلمات کبھی کبھی نکل پڑتے ہیں، جادو ناتھ سرکار اپنی مشہور تصنیف "تاریخ اورنگ زیب" میں ایک جگہ ضمنی بحث میں یہ لکھ گئے ہیں :-

"شروع کے عرب فاتحوں خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادتگاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے، جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو انکو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کو ہوتے، ورنہ پھران کو جزیہ ادا کرنا پڑتا، جس کے بعد انکو اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی آزادی ہوتی ۔ (جلد سوم ص ۲۵۳)

الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمد بن قاسم کے کارناموں پر جہاں تنقیدیں کی ہیں، وہاں یہ بھی لکھتے ہیں :-

سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ تاریخ کی رومانی داستانوں میں سے ایک ہے، اس کی شگفتہ نوجوانی، اس کی جرأت مندی، اس کی بہادری اور فوجی مہمات کے درمیان اس کے شریفانہ برتاؤ اور آخر میں اس کے زوال کی المناکی سے اسکی ذات کے گرد شہادت کا ہالہ دکھائی دیتا ہے، اس نے اپنی نوجوانی میں سپہ گری کا جوہر دکھایا اس سے اس کی ذات سے بڑی امیدیں بندھ گئیں، اسی لیے وہ ہندوستان کی مہم پر بھیجا گیا، حجاج نے اس کے ساتھ چھ ہزار منتخب شامی اور عراقی سپاہی کیے، اس کی معیت میں اتنے ہی اونٹوں کے مسلح سوار تھے، تین ہزار اونٹوں پر حربی سامان لادے گئے .... محمد مکران پہنچا تو یہاں کے حاکم محمد ہارون نے اور فوجی سامان اور پانچ منجنیق مہیا کیے، جو دیبل بھیج دیے گئے، ان عرب سپاہیوں

کے علاوہ محمد بن قاسم نے اپنے جھنڈوں کے نیچے ان جاٹوں اور میدیوں کو جمع کیا جو ہندوؤں کی غیرروادارانہ حکومت سے عاجز تھے اور بہت ذلت برداشت کر رہے تھے، وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، ان کو اچھے کپڑے پہننے کی ممانعت تھی، ان کو ننگے سر رہنے کا حکم تھا ان ذلتوں سے وہ محض لکڑہارے اور پن بھرے بنکر رہ گئے تھے، ان کے دلوں میں ایسا عناد بھرا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی قسمت کو فوراً ایک اجنبی کے سپرد کردیا۔

(ہسٹری آف مڈیول انڈیا ص ۵۶-۵۵)

عربوں کی عام رواداری سندھ میں عربوں اور سندھی عربوں کی حکومت ۹۰ھ سے ۴۱۶ھ تک یعنی ۳۲۶ برس تک رہی، اس مدت میں زراعت سندھی باشندوں ہی کے سپرد رہی، کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرنے کیلیے سندھی ہی مقرر کیے جاتے، انکی ملازمت موروثی ہوتی شروع میں مالگذاری عموماً اتنی ہی وصول کیلگئی جو وہ پہلے کرتے آئے تھے، ہندوؤں کے رسم ورواج میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی ہندوؤں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ انکی پنچایت میں ہوا کرتا تھا، ہندوؤں کی عبادت گاہیں لڑائی کے زمانے میں تومسمار ہوئیں یا جن میں بیشمار دولت پوشیدہ رکھی جاتی تھی، انکے خلاف فتح وتسخیر کے سلسلے میں فوجکشی ضروری ہوئی مگر امن کے زمانہ میں انکو وہی درجہ دیا گیا جو اسلامی ممالک میں عیسائیوں کے گرجوں اور آتش پرستوں کے آتش کدوں کو دیا گیا تھا، ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:-

ہندوستان میں کسی حکومت کے مقبول ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اسکے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اور عبادت کرنے میں آزادی ہو، ہندوستان کے مسلم حملہ آوروں نے مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کرلیا تھا، اور اپنی حکمت عملی اسی کے مطابق بنائی، آٹھویں صدی میں محمد ابن قاسم نے سندھ میں اپنی حکومت کا جو نظم ونسق قائم کیا وہ اعتدال اور رواداری کی روشن مثال ہے۔ (ہسٹری آف جہانگیر۔ ص ۷۹-۸۸)

(باقی)

شرح السُّنّۃ امام بغویؒ

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

دفعِ تعارض | بعض حدیثیں بظاہر باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں، مگر علمائے فن اور حدیث کے شارحین نے اس طرح کی حدیثوں میں جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کرکے ان کے اختلاف و تناقض کو دور کردیا ہے، امام بغوی نے بھی حدیثوں کے تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق اور سلام و کلام ترک کرنا مناسب نہیں ہے، اس کے مقابلہ میں بعض ایسی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باطل و خرافات میں ملوث اور دین میں تحریف کرنے والے مسلمانوں سے وہی قطع تعلق کرلینا چاہئے، اس طرح کی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

سیکون فی آخر اُمتی اناس یحدثونکم بما لم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم وایاھم،	پس ان لوگوں سے اپنے کو بچانا	آخر میں میری امت کے اندر ایسے لوگ ہوں گے، جو تم لوگوں سے ایسی باتیں بیان کریں گے جن کو تم لوگوں اور تمھارے آبا نے نہ سنا ہوگا،[۴]

اسی طرح جب غزوۂ تبوک میں حضرت کعب بن مالکؓ، مرارہ بن ربیعہ اور ہلال بن امیہؓ بلا عذر شریک نہیں ہوئے، تو رسول اللہ اور صحابۂ کرام نے ان لوگوں کا مقاطعہ کیا، اور پچاس دنوں تک ان سے کوئی ربط و تعلق نہ رکھا۔ ان حدیثوں میں بظاہر جو تضاد معلوم ہوتا ہے، امام بغوی نے اس کو رفع کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"تین دنوں سے زیادہ بے تعلقی کی ممانعت کا تعلق ایسے دو شخصوں سے ہے جن کے درمیان باہمی معاملت میں خرابی کی وجہ سے کشیدگی واقع ہوگئی ہو، اور ان کی بھائی چارگی ختم ہوگئی ہو، لیکن دین کے معاملہ میں کوتاہی اور مداہنت کرنے والوں سے ترک تعلق کرنے پر اس ممانعت کا اطلاق نہ ہوگا، کیونکہ اہلِ اہوا اور بدعتوں میں ملوث لوگوں سے تو ہمیشہ کے لئے مقاطعہ کیا جائے گا، الا آنکہ وہ لوگ توبہ کرلیں، اور بدعت کے ارتکاب اور دین میں مداہنت سے باز آجائیں، جیسا کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے اصحاب نے کعبؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں سے اس وقت تک تعلقات منقطع رکھے، جب تک کہ وحی الٰہی نے ان لوگوں کی برأت اور بے گناہی سے آپ کو مطلع نہیں کیا تھا"

(جلد اول ص ۲۲۴ تا ۲۲۶)

تعارض کی ایک اور مثال یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں قبر کو مسطح کرنے اور اونچی نہ بنانے کا ذکر ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے، کہ آپ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کی قبر کو مسطح کرایا تھا، مگر اس کے برعکس سفیان تمار نے روایت کی ہے، کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کی قبر کو غیر مسطح دیکھا تھا، امام بغوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر یہ دونوں روایتیں صحیح و ثابت ہیں، تو ان میں تطبیق اس طرح دی جائے گی کہ آپ کی قبر پہلے تو مسطح ہی تھی، مگر بعد میں وہ اونچی کردی گئی تھی، چنانچہ ولید بن

عبدالملک اور بعض لوگوں کے بیان کے مطابق حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے زمانہ میں آپ کی قبر میں تبدیلی کی گئی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبروں کے سلسلہ میں اصل حکم مسطح کرنے کا ہے، اور یہی اولیٰ واحسن بھی ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے جب عثمانؓ بن مظعون کو دفن کیا تو اُن کے سرہانے پتھر رکھ کر فرمایا کہ اس کی وجہ سے میرے بھائی کی قبر جان لی جائے گی، اور اُن کے جو متعلقین آئندہ فوت ہوں گے ان کو اُن ہی کے قریب دفن کیا جائے گا، غرضیکہ قبر کو اونچی اور زمین کی سطح سے بلند بنانا ناپسندیدہ ہے، امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ قبر کو اتنی ہی اونچی کرو کہ جس سے اس کے قبر ہونے کا پتہ چل سکے تاکہ اس پر نشست و برخاست کی جائے، اور نہ اُسے روندا جائے، یہ مقدار ایک بالشت ہوسکتی ہے، علماء کا بیان ہے کہ قبر کو بھرنے اور ہموار کرنے کے لئے اور جگہ سے مزید مٹی لانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسی مٹی کو کو استعمال کرلینا چاہئے، جو کھودتے وقت قبر سے نکلی ہو"

(جلد ۵ ص ۴۰۳، ۴۰۴)

بعض حدیثوں کے الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے، امام بغوی نے اس کی جانب بھی اعتنا کیا ہے، جیسے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں لیکن بعض اور حدیثوں میں لا الہ الا اللہ کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس اختلاف کا ازالہ ملاحظہ ہو،

" حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں "یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ" کا ذکر نہیں ہے، مگر ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے، امام خطابی فرماتے ہیں، کہ یہ فرق اختلاف اوقات کا نتیجہ ہے، کیونکہ دین کے احکام

فرائض مختلف وقتوں میں یکے بعد دیگرے فرض کئے گئے ہیں، پس پہلی (حضرت ابوہریرہؓ کی) حدیث ان فرائض کے وجوب سے پہلے کی ہے، اور ابن عمرؓ اور انسؓ کی حدیثیں ان فرائض کے وجوب کے بعد کی ہیں، اس لئے ان میں نماز و زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے"، (جلد اوّل ص ۷۰ و ۷۹)

اعتقادی وکلامی مباحث | عباسی دور میں یونانی منطق وفلسفہ کی جب نشر و اشاعت ہوئی تو مسلمان فلسفہ و کلام کی غیر ضروری بحثوں میں پڑ کر دین کی حقیقت اور اس کی اصلی روح سے دور ہونے لگے، اور ایمان و راسخ العقیدگی شک و تذبذب میں تبدیل ہونے لگی، اس موقع پر محدثین کی جماعت اُن کی صحیح رہنمائی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، اور اس نے اُن کے ایمان و اعتقاد کو مستحکم رکھنے کے لئے ایمانیات و عقائد میں بحث و تدقیق اور فلسفہ و کلام میں غور و خوض کی شدت سے مخالفت کی، امام بغوی نے بھی اپنے پیشرو محدثین کی طرح ان مباحث میں پڑنے کو غیر ضروری اور ان میں سکوت کو افضل بتایا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"علماء اہل سنت صفاتِ الٰہی میں بحث اور علم کلام سیکھنے اور اس میں بحث و تفتیش کرنے کی ممانعت پر متفق ہیں، ...... امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ لوگو بدعتوں سے بچو، اُن سے دریافت کیا گیا کہ بدعتیں کیا ہیں؟ ارشاد ہوا کہ اہل بدعت وہ ہیں جو خدا کے ناموں، اس کی صفتوں، اس کے کلام، اس کے علم اور اس کی قدرت کے بارہ میں بحث و گفتگو کرتے ہیں، اور ان چیزوں میں خاموشی نہیں اختیار کرتے جن میں صحابۂ کرام اور تابعین عظام نے سکوت اختیار کیا تھا..... سفیان ثوری سے جب کلام کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ باطل سے اجتناب کرو، بدعتیں چھوڑ دو، اور سنتوں کی پیروی کرو"[۱]

---

[۱] جلد اوّل ص ۲۱۷،

ایک حدیث میں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے، کہ ان اوقات میں سورج شیطان کی دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے، اور زوال کے وقت نماز پڑھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس وقت جہنم کی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں امام بغوی فرماتے ہیں، :-

"ان اسباب و علل کی حقیقت و ماہیت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، ہمارے لئے ان پر ایمان لانا اور اُن کی تصدیق کرنا تو ضروری ہے، مگر اُن میں غور و خوض سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے۔" (جلد سوم - ص ۳۳۰)

کلامی مباحث سے اس قدر بیزاری کے باوجود بعض اور محدثین کی طرح امام بغوی کو بھی ضرورتاً اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے ان سے یک گونہ تعرض کرنا پڑا ہے تاہم اس طرح کے مسائل میں ان کے خیالات کتاب و سنت کے ظاہر کے مطابق اور احتیاط پر مبنی ہیں، اور انھوں نے ان امور کے بارہ میں اہل سُنت و الجماعت کے نقطۂ نظر سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے، اس کی بعض مثالیں اس لئے قلمبند کی جاتی ہیں، کہ ان سے اُن کے اعتقادی مسلک کا اندازہ ہوگا،

اعتقادی و کلامی بحثوں میں خلق قرآن کا مسئلہ نہایت اہم ہے، فرقۂ معتزلہ نے اپنے دورِ عروج میں اُس کی جس قدر پُر زور تائید کی تھی، اسی قدر محدثین اور علمائے حق نے اس کا پُر زور رد بھی کیا تھا، محدثین و فقہاء کے سرخیل امام احمد کو اسی وجہ سے سخت زد و کوب کیا گیا تھا، امام بغوی نے خلق قرآن کے رد میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، اس میں پہلے متعدد آیتیں نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ قرآن اللہ کا کلام، اس کی وحی و تنزیل اور صفت ہے، وہ نہ خالق رمخلوق ہے اور نہ محدث و حادث۔ ان آیتوں کے بعد وہ یہ روایت درج

فرائض مختلف وقتوں میں یکے بعد دیگرے فرض کئے گئے ہیں، پس پہلی (حضرت ابو ہریرہؓ کی) حدیث ان فرائض کے وجوب سے پہلے کی ہے، اور ابن عمرؓ اور انسؓ کی حدیثیں ان فرائض کے وجوب کے بعد کی ہیں، اس لئے ان میں نماز و زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے"۔ (جلد اوّل ص ۷۰ و ۷۹)

اعتقادی وکلامی مباحث عباسی دور میں یونانی منطق و فلسفہ کی جب نشر و اشاعت ہوئی تو مسلمان فلسفہ و کلام کی غیر ضروری بحثوں میں پڑ کر دین کی حقیقت اور اس کی اصلی روح سے دور ہونے لگے، اور ایمان و راسخ العقیدگی شک و تذبذب میں تبدیل ہونے لگی، اس موقع پر محدثین کی جماعت اُن کی صحیح رہنمائی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، اور اُس نے اُن کے ایمان و اعتقاد کو مستحکم رکھنے کے لئے ایمانیات و عقائد میں بحث و تدقیق اور فلسفہ و کلام میں غور و خوض کی شدت سے مخالفت کی، امام بغوی نے بھی اپنے پیشرو محدثین کی طرح ان مباحث میں پڑنے کو غیر ضروری اور ان میں سکوت کو افضل بتایا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"علمائے اہل سنت صفاتِ الٰہی میں بحث اور علم کلام سیکھنے اور اس میں بحث و تفتیش کرنے کی ممانعت پر متفق ہیں، ...... امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ لوگو بدعتوں سے بچو، اُن سے دریافت کیا گیا، کہ بدعتیں کیا ہیں؟ ارشاد ہوا کہ اہل بدعت وہ ہیں جو خدا کے ناموں، اس کی صفتوں، اس کے کلام، اس کے علم اور اس کی قدرت کے بارہ میں بحث و گفتگو کرتے ہیں، اور ان چیزوں میں خاموشی نہیں اختیار کرتے جن میں صحابۂ کرام اور تابعین عظام نے سکوت اختیار کیا تھا، .... سفیان ثوری سے جب کلام کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ باطل سے اجتناب کرو، بدعتیں چھوڑ دو، اور سنتوں کی پیروی کرو"[۱]

---

[۱] جلد اوّل ص ۲۱۶،

ایک حدیث میں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے، کہ ان اوقات میں سورج شیطان کی دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے، اور زوال کے وقت نماز پڑھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس وقت جہنم کی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں امام بغوی فرماتے ہیں، :-

"ان اسباب و علل کی حقیقت و ماہیت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، ہمارے لئے ان پر ایمان لانا اور اُن کی تصدیق کرنا تو ضروری ہے، مگر اُن میں غور و خوض سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے۔" (جلد سوم - ص ۴۳۰)

کلامی مباحث سے اس قدر بیزاری کے باوجود بعض اور محدثین کی طرح امام بغوی کو بھی ضرورتاً اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے ان سے یک گونہ تعرض کرنا پڑا ہے تاہم اس طرح کے مسائل میں ان کے خیالات کتاب و سنت کے ظاہر کے مطابق اور احتیاط پر مبنی ہیں، اور انھوں نے ان امور کے بارہ میں اہل سُنّت و الجماعت کے نقطۂ نظر سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے اس کی بعض مثالیں اس لئے قلمبند کی جاتی ہیں، کہ ان سے اُن کے اعتقادی مسلک کا اندازہ ہوگا،

اعتقادی و کلامی بحثوں میں خلق قرآن کا مسئلہ نہایت اہم ہے، فرقۂ معتزلہ نے اپنے دورِ عروج میں اُس کی جس قدر پُر زور تائید کی تھی، اسی قدر محدثین اور علمائے حق نے اس کا پُر زور رد بھی کیا تھا، محدثین و فقہا، کے سرخیل امام احمد کو اسی وجہ سے سخت زدوکوب کیا گیا تھا، امام بغوی نے خلق قرآن کے رد میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، اس میں پہلے متعدد آیتیں نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ قرآن اللہ کا کلام، اس کی وحی و تنزیل اور صفت ہے، وہ نہ خالق ہے نہ مخلوق ہے، اور نہ محدث و حادث۔ ان آیتوں کے بعد وہ یہ روایت درج

کرتے ہیں کہ "قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آج کی رات مجھے نیند نہ آئی، آپ نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا مجھے ایک بچھو نے ڈنک مار دیا تھا آپ نے فرمایا کہ "اگر تم نے شام ہی کو یہ کہہ دیا ہوتا

أعوذ بکلمات اللہ التامات	میں مخلوقات کے شر سے اللہ کے کامل و
من شر ما خلق،	تام لفظوں کی پناہ میں آتا ہوں،

تو انشاء اللہ تمھاری تکلیف زائل ہوگئی ہوتی اس کے ضمن میں امام بغوی لکھتے ہیں:۔

"یہ اور اس طرح کی وہ تمام حدیثیں جن میں کلماتِ الٰہی سے استعاذہ کا ذکر ہے، اس امر کی دلیل ہیں کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ کا کسی مخلوق سے استعاذہ ثابت نہیں ہے، البتہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے کلام سے اسی طرح استعاذہ کیا ہے جس طرح خود اس سے کیا ہے، قرآن مجید میں اللہ سے استعاذہ کا ذکر متعدد مواقع پر آیا ہے:۔

اعوذ بک من ھمزات الشیاطین	اے خداوند! میں شیطانوں کے
واعوذ بک رب ان یحضرون،	وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں
(مومنون، ۹۷، ۹۸)	اور اس بات سے بھی کہ وہ میرے پاس آئیں،

دوسری جگہ ہے:۔

قل اعوذ برب الفلق،	کہو کہ میں صبح کے خداوند کی پناہ
(فلق۔ ۱)	مانگتا ہوں،

تعوذ کے الفاظ ہیں:۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم — میں ملعون شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں،

اسی طرح آپؐ نے خدا کی صفتوں سے بھی استعاذہ کیا ہے، ایک حدیث میں ہے:۔

قل اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ من شر ما اجد، — کہو کہ میں تمام چیزوں کے شر سے اللہ کی عزت و قدرت کی پناہ میں آتا ہوں،

لیکن آپ نے کسی مخلوق سے کبھی استعاذہ نہیں کیا، اسی لئے امام احمدؒ (اعوذ بکلمات اللہ التامات) سے استدلال کرتے تھے، کہ قرآن مجید مخلوق نہیں ہے کیونکہ کوئی مخلوق بھی نقص سے خالی اور کامل نہیں ہے،

امت کے سلف اور علمائے سنت کا مسلک یہی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اس کی وحی ہے، وہ خالق و مخلوق نہیں، خلق قرآن کا عقیدہ بدعت و ضلالت ہے، صحابہ و تابعین کے زمانہ میں کوئی اس کا قائل نہ تھا، یہ توجعد بن درہم کی ایجاد ہے، اس نے یہ عقیدہ ظاہر کرکے اہلسنت والجماعت کی مخالفت کی تھی، خالد بن عبداللہ قسری نے اسی کی پاداش میں اسے قتل کر دیا تھا، اس کے بعد فرقۂ جہمیہ کے بانی جہم بن صفوان نے اس نظریہ کی اشاعت کی،

سفیان بن عیینہ عمرو بن دینارؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم اپنے شیوخ سے ستر سال سے یہ سنتے آئے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اہل بیت کے امام جعفر بن محمد صادقؒ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اس بارہ میں وہی کہتا ہوں جو میرے آباؤ اجداد کہا کرتے تھے، کہ قرآن خالق نہ

مخلوق نہیں، بلکہ کلام الٰہی ہے"[1]

مسئلۂ صفات میں انھوں نے کئی جگہ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، چنانچہ ایک حدیث ہے کہ "انسانی قلوب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں" اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:۔

"انگلی (اصبع) اللہ عزوجل کی ایک صفت ہے، اس طرح کی اور صفتوں کا بھی قرآن و حدیث میں ذکر ہے جیسے نفس (ذات) وجہ (چہرہ) عین (آنکھ) ید (ہاتھ) رجل (پاؤں) اتیان و مجی (آنا) نزول الی السماء الدنیا (دنیوی آسمان کی طرف اترنا) استواء علی العرش (تخت پر متمکن ہونا) ضحک (ہنسنا یعنی راضی ہونا) اور فرح (خوش ہونا یعنی پسند کرنا) وغیرہ،

ان سب صفتوں پر ایمان لانا، ان کو ان کے ظاہر پر محمول کرنا، اور ان کی تاویل و تشبیہ سے بچنا، اور یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی صفتیں مخلوق کی صفتوں کے مانند نہیں ہیں جس طرح کہ خود اس کی ذات مخلوقات کی ذاتوں کے مشابہ نہیں ہے،

لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر (شوریٰ۔۱۱)	اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے، دیکھنے والا ہے،

ان سب صفتوں پر ایمان لانا ان کو قبول کرنا اور ان کی تاویل و توجیہ اور تمثیل و تشبیہ سے اجتناب کرنا، علماء سلف اور اہل سنت کا معمول تھا، وہ اُن کی حقیقت معلوم کرنے کے بجائے ان کا علم اللہ کے حوالے کرتے ہیں:۔

والراسخون فی العلم یقولون	اور راسخ علم والے کہتے ہیں کہ ہم اس

[1] جلد اول ص ۱۸۵ تا ۱۸۷،

آمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا، ایمان لائے، سب ہمارے رب
(آل عمران۔۷) کی جانب سے ہے،

سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے جو اوصاف قرآن مجید میں بیان کئے ہیں، اُن کی قرأت وتلاوت پر اکتفا اور تاویل میں خاموشی اختیار کی جائیگی، کیونکہ اُن کی تفسیر وتاویل کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہے، امام مالکؒ سے الرحمٰن علی العرش استوی (طہٰ۔۵) (خدائے رحمٰن تخت پر متمکن ہوا) کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ استوا کی حقیقت نامعلوم، اور اُس کی کیفیت مجہول ہے، البتہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے، مگر اس کے متعلق سوال وتفتیش بدعت ہے، ان سے اور امام اوزاعیؒ وسفیان بن عیینہؒ سے روایت وصفات الٰہی سے متعلق حدیثوں کے بارہ میں دریافت کیا گیا، تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ ان کو اسی طرح ماننا اور تسلیم کرلینا چاہئے، جس طرح یہ بیان ہوئی ہیں، لیکن ان کی کیفیت وحقیقت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیئے، زُہریؒ سے منقول ہے کہ اللہ کے ذمہ ان صفتوں کی وضاحت، رسول کے ذمہ اُن کو پہنچانا، اور ہمارے ذمہ ان کو ماننا ہے،"

(جلد ۱۔ ص ۱۶۸ تا ۱۷۱)

اسی طرح ایک جگہ اللہ کی صفاتِ ضحک اور فرح کے متعلق لکھتے ہیں، کہ ان کی بندوں کی صفاتِ ضحک وفرح سے کوئی نسبت نہیں ہے، بلکہ اُن سے اس کی پسندیدگی اور رضا کا اظہار مقصود ہے، متقدمین اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ مخلوق کی صفتوں سے منزہ ہے،

(جلد ۵ ص ۸۸)

مسئلہ خلافت اور خلفائے راشدین کے درجہ و مرتبہ کے بارے میں ان کا وہی مسلک ہے جو اہلسنت والجماعت کا ہے، چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث:-

فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، — سو تم لوگوں پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرنا ضروری ہے،

کے تحت تحریر فرماتے ہیں:-

"اس سے خلفائے راشدین (ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم) کی جملہ صحابہ پر فضیلت و برتری ظاہر ہوتی ہے، یہ لوگ انبیائے کرام کے بعد تمام لوگوں سے افضل ہیں، اور باہم فضیلت میں ان بزرگوں کی وہی ترتیب ہے، جو خلافت میں ہے یعنی سب سے افضل تو حضرت ابو بکرؓ ہیں، پھر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ ہیں۔[1]

رسول اللہؐ نے جس طرح تمام صحابہ میں خلفائے راشدین کو افضل قرار دیا ہے اسی طرح خلفاء میں شیخین کو افضل بتایا ہو، چنانچہ حضرت ابوحذیفہؓ سے مروی ہے کہ:-

اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر وعمر (جلد اول ص ۲۰۸) — میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کرو،

---

[1] ایک جگہ امام ثوریؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "جو شخص حضرت علیؓ کو شیخین سے افضل و مقدم سمجھتا ہو، وہ گویا مہاجرین و انصار کی عیب جوئی کرتا ہے جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس کے بارہ میں مجھے خطرہ ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی اس کے لئے مفید نہ ہوگا" (جلد اول ص ۲۲۹)

تفسیری بحثیں امام بغوی فقہ و حدیث کی طرح تفسیر میں بھی مکمل دستگاہ رکھتے تھے، فنِ تفسیر میں اُن کی ایک مستقل تصنیف ہے، شرح السنۃ سے بھی اُن کے تفسیر میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے اکثر ابواب آیاتِ قرآنی سے مزین ہیں، اور شرح میں بھی بطور استدلال آیتیں نقل کی گئی ہیں، اور کہیں کہیں حقائق و نکات بھی بیان کئے گئے ہیں، بعض ابواب کے شروع میں جو آیتیں نقل کی گئی ہیں، اُن میں بعض کی مختصر تشریح و وضاحت کی گئی ہے، مثلاً عذابِ قبر کے باب میں حسبِ ذیل آیتیں مختصر تشریح کے ساتھ درج ہیں:-

وحاق بآل فرعون سوء العذاب النار یعرضون علیها غدواً وعشیا، (مومن - ۴۵)	اور فرعونیوں کو بُرے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ کہ اس پر وہ لوگ صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں،

اس آیت میں بتایا گیا ہے، کہ فرعون اور اُس کے لاؤ لشکر کو غرق کئے جانے کے بعد صبح و شام عذاب دیا جاتا ہے، پھر فرمایا:-

ویوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب، (مومن ۴۶)	اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر سخت عذاب میں ڈالو،!

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز آلِ فرعون کو عالمِ برزخ اور قبر کے عذاب سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا، دوسری جگہ ہے:-

ولو تری اذ الظالمون فی	اور اگر تم دیکھ پاتے، اس وقت کو

غمرات الموت والملائکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن آیاتہ تستکبرون

(انعام - ۹۳)

جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے، اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیئے جاؤ گے، بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کر رہے تھے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج (قبر میں) بھی ظالموں اور گنہگاروں کو عذاب دیا جائے گا۔

"معیشۃ ضنکا (طٰہٰ - ۱۲۴)

کی تفسیر عذاب قبر بھی کی گئی ہے، (جلد پنجم ص ۱۲۴)

قرآن مجید اور بعض حدیثوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "سبع مثانی" عطا کئے جانے کا ذکر ہے، اُس کی تفسیر و وضاحت میں رقمطراز ہیں،

"سبع مثانی سے سورہ فاتحہ مراد ہے، جو سات آیتوں پر مشتمل ہے، اس کو مثانی اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ نماز کی ہر ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سورہ چونکہ صرف امت مرحومہ کے لئے مستثنیٰ و مخصوص کی گئی ہے اور گذشتہ قوموں کو نہیں عطا کی گئی تھی، اس لئے اس کو مثانی کہا گیا ہے تیسرا قول یہ ہے کہ حمد و ثنا کے مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مثانی کہلاتی ہے

ایک قول یہ ہے کہ مثانی سے مکمل قرآن مراد ہے کیونکہ خود اس میں مذکور ہے،

اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی ، (زمر-۲۳)

اللہ نے بہترین کلام اتارا، ایسی کتاب جو باہم دگر مشابہ اور بار بار دہرائی گئی ہے،

یہاں مکمل قرآن کو مثانی کہا گیا ہے، کیونکہ اس کے اندر امثال وقصص دہرا کر بار بار بیان کئے گئے ہیں پس حدیث نبوی (انھا السبع من المثانی) کا مطلب یہ ہوگا کہ فاتحہ جو سات آیتوں والی سورہ ہے، مجموعہ قرآن میں سے ہے، مثانی سے وہ سورتیں بھی مراد لی گئی ہیں جن کی آیتیں دو سو سے کم اور مفصلات سے زیادہ ہیں اس صورت میں گویا ان سورتوں کو مثانی مئین (دو سو آیتوں والی سورتوں) کے مقابلہ میں کہا گیا ہے، جن کی حیثیت مبادی کی اور ان سے متصل ان سورتوں (دو سو سے کم والی) کی حیثیت مثانی کی ہے" (جلد چہارم ص ۴۴۴ و ۴۴۸)

سورۂ آل عمران میں قرآن مجید کی آیتوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں، (۱) محکمات، (۲) متشابہات، مصنف ان کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"مجاہد نے محکمات سے اُن آیتوں کو مراد لیا ہے جن میں حلال وحرام (احکام ومسائل) کا ذکر ہے، اور متشابہات کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں بعض آیتوں کی تصدیق کرتی ہیں، جیسے مندرجہ ذیل آیتیں ایک دوسرے کے مفہوم کی مؤید ہیں،

وما یضل بہ الا الفاسقین، (بقرہ-۲۶)

اور وہ اس (قرآن کے ذریعہ) گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں

اور :-

ويجعل الله الرجس على الذين لا يعقلون، (يونس - ۱۰۰)	اور اللہ گندگی (گمراہی) کو ان لوگوں پر ڈالتا ہے، جو عقل سے کام نہیں لیتے

نیز :-

والذين اهتدوا زادهم هدى، (محمد - ۱۷)	اور جو لوگ عقل کی راہ اختیار کرتے ہیں، اللہ اُن کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ محکمات سے غیر منسوخ آیتیں مراد ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے :-

تلك ايات الكتاب الحكيم (یونس)	یہ محکم کتاب کی آیتیں ہیں،

دوسری جگہ فرمایا :-

كتاب احكمت آياته ثم فصلت، (هود - ۱)	یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں (پہلے) محکم کی گئیں، پھر اُن کی تفصیل بیان کی گئی،

محکم کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایسی آیتیں جن کے معنی بالکل ظاہر اور واضح ہوں، اور متشابہ کے بارہ میں متعدد اقوال ہیں، امام خطابی اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ جن آیتوں کا مفہوم ان کے ظاہری الفاظ سے واضح نہ ہو، وہ متشابہ ہیں، اُن کی دو قسمیں ہیں، (الف) وہ جن کا مفہوم محکم کی جانب رجوع کرنے کے بعد واضح ہو جائے، (ب) جن کی حقیقت اور تاویل سے واقفیت کی کوئی صورت ہی نہ ہو، اور سوائے اللہ کے ان کی تاویل کوئی نہ جان سکتا ہو جیسے

لوگوں کی سرشت میں کجی ہوتی ہے، وہی اس طرح کی آیتوں کی تاویل کے درپے ہوتے ہیں، جیسے تقدیر، مشیت اور صفات الٰہی سے متعلق آیتیں جن کی حقیقت معلوم کرنے کا ہم کو مکلف نہیں کیا گیا ہے، اور نہ ان کے اسرار ہم پر منکشف کئے گئے ہیں، اس طرح کی آیتوں کی ٹوہ میں پڑنے والا فتنہ کا متلاشی ہوتا ہے۔[1]

(جلد اول ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

---

[1] مصنف کی بعض توجیہات محل نظر ہیں، محکمات و متشابہات کا معاملہ چونکہ نہایت مہتم بالشان ہے، اس لئے ان کے متعلق محقق و مرجح قول بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، محکمات سے دراصل وہ آیتیں مراد ہیں جو بدیہیات و قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہوتی ہیں، ان کو قبول کرنے میں کبھی عقل کو تردد اور تامل نہیں ہوتا، بلکہ ہر قلب سلیم رکھنے والا شخص اُن کو تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، جیسے توحید و معاد کے نظری دلائل و شواہد اور خیر و شر اور معروف و منکر کے مسلمات وغیرہ (بقیہ حاشیہ ص) رہیں، متشابہات قرآن سے وہ آیتیں مراد ہیں، جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کی دسترس سے باہر کی باتیں قرآن نے تشبیہی و تمثیلی رنگ میں بیان کی ہیں، یہ باتیں جس بنیادی مسئلہ اور حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں، وہ بجائے خود تو واضح ہوتی ہیں، مگر چونکہ اُن کا نادیدہ عالم سے تعلق ہوتا ہے، اس وجہ سے قرآن اُن کو تشبیہ و تمثیل کے پیرایہ میں پیش کرتا ہے، تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں، اور اُن کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کر دیں، خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور آلام سے متعلق جو آیتیں ہیں، وہ متشابہات کہلائیں گی،

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا ابو الحسین صاحب فاروقی گوپاموی ایم اے سابق لکچرار شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

حضرت مولانا الحاج سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ محلہ مرداد قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، جہاں حضرت یحیٰی منیریؒ کا مزار پُر انوار ہے، مولانا مرحوم و مغفور کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی کچھوچھوی قدس سرہٗ کے بھانجے حضرت سید عبد الرزاق جیلانی حسنی حسینی سے ملتا ہے، جو اب حضرت مخدوم سمنانی کی طرف منسوب ہو کر اشرفی کہلاتا ہے۔ اسی سلسلہ کے خاندان کی ایک شاخ دلی میں بھی تھی جو اب پیر الٰہی بخش کالونی کراچی پاکستان میں ہے،

مولانا ممدوح کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اپنے اعمام محترم جو سب کے سب عالم و فاضل تھے، تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جونپور تشریف لاکر حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم کے درس میں شریک ہوئے اور ان ہی سے سند فراغت حاصل کی، ممدوح کو اپنے استاذ مرحوم سے غیر معمولی تعلق تھا،

مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم خیرآبادی سلسلہ کے نامور اور ممتاز شاگرد اور براہ راست علامہ فضل حق خیرآبادی مرحوم سے مستفیض تھے، مولانا سید سلیمان اشرفؒ کا برتاؤ و اکرام میرے ساتھ علاوہ شاگردی اور ماتحتی کے اسی خیرآبادی سلسلہ کا فیضان تھا،

کیونکہ حضرت شمس العلما، مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ کی پھوپھی زاد بہن کا میں نواسہ تھا، یہ نسبت حضرت مولانا ممدوح کی بارگاہ میں میری بھی عزت کا باعث تھی،

مولانا ممدوح علی گڑھ کے مشہور دارالعلوم میں بحیثیت معلم دینیات اس زمانے میں ملازم ہوئے جب نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین خاں صاحب اس کے آنریری سکریٹری تھے، آپ کو علی گڑھ لانے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، اس زمانہ میں دارالعلوم میں ممتاز علما کا مجمع تھا، جن میں مولانا خلیل احمد اسرائیلی، مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا رشید احمد، مولانا عبدالحق حقی، شمس العلما، مولانا عباس حسین مجتہد، موخرالذکر نہ صرف شعبۂ دینیات کے معلم بلکہ ایم اے کو عربی کورس بھی پڑھایا کرتے تھے، انھوں نے بحالت ملازمت طویل عمر گذار کر علی گڑھ ہی میں انتقال کیا۔

مولانا ممدوح کے تعلقات و روابط اپنے معاصرین سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں اور حکام دارالعلوم سے ہمیشہ خوشگوار رہے، ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی بن جانے کے بعد جب مرحوم کا مرتبہ اور عہدہ دونوں بڑھ گئے تھے، اس میں کوئی فرق نہ آیا، اور وہ شعبۂ دینیات کے صدر اور لیڈر ہو گئے تھے، یونیورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر مہاراجہ محمود آباد تھے، یہ خدمت عرصہ دراز تک اعزازی رہی، اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر اور ریاضی کے ماہر اور کیمبرج کے فاضل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد یہ دو وائس چانسلر ہوئے، حضرت مولانا مرحوم اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب میں "اسلامک اسٹڈیز" کے مسئلہ میں اختلاف ہو گیا جس نے بہت طول کھینچا اور دونوں میں آخر تک کشیدگی رہی۔

مولانا مرحوم و مغفور اپنے استاد زادوں کی بڑی خدمت کرتے تھے، اپنے استاد کے داماد کو اپنی ماتحتی میں ملازمت دلوائی، ان کے بیٹے کی تعلیم کے کفیل ہوئے اور میٹرک پاس کرانے کے بعد

ان کو یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت دلوائی، وہ مرحوم کے ساتھ ہی رہتے تھے، اور باوجود ملازم ہو جانے کے کفالت حسب سابق جاری رہی،

مولانا مرحوم نے آخر عمر میں محض بہ اتباع سنت نبویہ اور اپنی والدۂ مرحومہ کے حکم کی تعمیل میں شادی بھی کر لی تھی، جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور اہلیۂ محترمہ شادی کے چند سال بعد مرگئیں، مولانا مرحوم اپنے بھانجے سید معین کے بھی کفیل تھے، ان کو ایل ایل بی تک تعلیم دلوائی، سید معین سشن جج کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے، مولانا مرحوم کے ایک بڑے بھائی تھے، جن کو ممدوح نے مرتے دم تک اپنے پاس رکھا، وہ پولیس کے محکمے میں آفیسر تھے، دماغی توازن خراب ہو گیا تھا، اچھے پڑھے لکھے تھے، وہ کسی سے نہ بولتے تھے اور نہ کسی کو ستاتے تھے، یونیورسٹی لائبریری جا کر کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے، حضرت مولانا مرحوم جیسی انکی خدمت کی اسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا مرحوم کو تدریس و تحریر اور تقریر پر غیر معمولی قدرت و مہارت حاصل تھی، ان کی تصانیف میں المبین نامی کتاب نے علمی حلقوں میں کافی قبولیت حاصل کی، یہ عربی زبان کی فضیلت پر ہے، ہندوستانی اکیڈمی نے اس پر انعام بھی دیا تھا، خود مرحوم نے اس کی عمدہ کتابت و طباعت پر شروانی پریس کے مالک مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی مرحوم کو انعام دیا تھا، دوسری کتاب حج کا سفرنامہ ہے جو بے حد مفید ہے، تیسری کتاب اس سوسائٹی سے متعلق ہے جو "خسرو سوسائٹی" کے نام سے نواب اسحاق خاں مرحوم نے جب وہ سکریٹری تھے، دارالعلوم میں قائم فرمائی تھی، اور جس کی غایت یہ تھی کہ حضرت امیر خسرو کے پنج گنج جو ممدوح قدس سرہٗ العزیز نے "خمسۂ نظامی" کے جواب میں لکھا تھا، مثلاً ہفت پیکر کے جواب میں ہشت بہشت وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کی مبسوط شرح لکھی جائے، چنانچہ ایک ایک مثنوی کو دارالعلوم کے علماء پر تقسیم کر دیا تھا، مولانا مرحوم و مغفور کے حصہ میں ہشت بہشت آئی، جن حضرات نے ان تعالیٰ تصانیف کا مطالعہ کیا ہے

دو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ مثنوی ہفت پیکر اور ہشت بہشت کا تقابلی تبصرہ نہ صرف مولانا ممدوح کی علمی فضیلت کا مظہر ملکہ ان کے صوفیانہ مسلک کا بدرجۂ اتم ترجمان ہے، کیونکہ دونوں مثنویاں تصوف میں ہیں،

میں نے اسی تقابلی تصنیف کی مدد سے ایم اے کے طلبہ کو درس بھی دیا تھا، پہلی بار ایم اے میں یہ پانچواں پرچہ رکھا گیا تھا جس کی تدریس میرے سپرد کی گئی، اور اس پرچہ کا پہلی بار میں ہی ممتحن بھی ہوا تھا، حضرت مولانا مرحوم ومغفور نے ترک موالات کے دور میں اسلامی نظریہ کی تائید میں تین رسالے تالیف کیے، پہلا الرشاد، دوسرا البلاغ اور تیسرا النور، آخری رسالہ ضخیم اور کافی مدلل ہے، اسلامک اسٹڈیز کے مسئلہ پر بھی آپ نے مبسوط و مدلل کتاب لکھی جو نواب سرمزمل اللہ خاں شروانی مرحوم وائس چانسلر کے حکم سے بڑے اہتمام سے چھاپکر شائع کی گئی۔

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم ومغفور کے علم و فضل کا اندازہ وہ لوگ خوب کرسکتے ہیں جنھوں نے ممدوح سے درس لیا، یا ان کے مواعظ حسنہ سنے، ان کا وعظ سیدھے سادے الفاظ میں تصنع، تکلف اور لفاظی کے بغیر بڑا دلکش ہوتا تھا، مرحوم جمعہ کو عصر و مغرب کے درمیان یونیورسٹی کی مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، جس میں ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی، مرحوم و مغفور کی خوش بیانی نہایت دلکش ہوا کرتی تھی، آپ صرف تین جگہوں پر وعظ فرمایا کرتے تھے، ایک اجمیر شریف کے عرس میں درسگاہ شریف کے مدرسہ میں، دوسرا ربیع الاول میں دہلی میں خان بہادر سید بہاء الدین مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر کے یہاں، تیسرا الہ آباد میں ایک تمباکو فروش تاجر کے یہاں ان کے علاوہ کہیں وعظ نہ فرماتے تھے، جب کوئی وعظ کی فرمائش کرتا تو جواب میں فرماتے کہ ہمارا کھاتہ تو تین جگہ ہے، اس کے علاوہ ہم وعظ نہیں کہتے، ہم مدرس ہیں، واعظ نہیں، ایک مرتبہ علی گڑھ کے رئیس جو اکثر حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے،

اپنی نیازمندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے درخواست کی کہ مولانا ان کے گھر پر وعظ فرمائیں، حضرت ممدوح نے وہی جواب ان کو بھی دیا جو اوپر درج ہوا۔

مولانا مرحوم و مغفور کا اخلاق بے مثال تھا، لیکن خودداری اور عزت نفس کے ساتھ، جو کسی زمانے میں شرافت کا معیار اور اس کا جزو اعظم تھا، اس کو ممدوح نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، میرے نزدیک مولانا اُن ممتاز علماء میں تھے جنھوں نے دنیائے انسانیت کو یہ سبق دیا تھا کہ علمائے دین اور پیشوایان شرع متین کی کس طرح عزت کیجائے، یہ حضرت ہی کی خودداری کا طفیل تھا کہ علی گڑھ نے علماء کے احترام کا سبق سیکھا اور وہاں علماء کا وقار قائم رہا، جو اب تقریباً ہر جگہ مفقود ہے، جس میں میری رائے میں نام نہاد علماء کا بھی قصور ہے، مولانا ممدوح کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی بڑے آدمی کے گھر نہیں گئے، سرراس مسعود (مسعود جنگ) جو نہ صرف وائس چانسلر تھے، بلکہ جنھوں نے جدید تنظیمی کمیشن تشکیل کرکے یونیورسٹی کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا، مولانا مرحوم نے ان کے یہاں بھی کبھی حاضری نہیں دی، علی گڑھ کی سلور جوبلی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی، باہر سے بڑے بڑے مہمان آکر شریک ہوئے، لیکن مولانا اپنے چبوترے سے جس پر شام کو احباب کے ساتھ نشست فرماتے تھے، نہیں اترے، حالانکہ جلسہ حضرت کی نشست گاہ اور کمرہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا، بلکہ شرکائے جلسہ خود بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوئے،

مولانا مرحوم کا طریقۂ درس بالخصوص دار العلوم میں جہاں دینیات کی تدریس محض امتحان پاس کرانے کے لیے تھی، بہت پسندیدہ اور دلکش تھا، نصاب تعلیم اس دلنشین انداز میں پڑھاتے تھے کہ طلبہ بڑی تعداد میں کامیاب ہوتے تھے،

میں ۱۹۲۳ء میں پہلے انٹرمیڈیٹ کالج میں دینیات کا لکچرر مقرر ہوا، چند مہینوں کے بعد مجھے حضرت مولانا کی تحریک پر بی اے سی اور ایف اے سی کے طلبہ کو دینیات پڑھانے

کے لیے مقرر کر دیا گیا، یہاں یونیورسٹی کے سائنس کے طلبہ کو دینیات اور اردو بھی پڑھاتا تھا، شعبۂ دینیات میں جب B.T.H اور M.T.H کے درجات کھولے گئے تو B.T.H کا تفسیر کا پرچہ مجھے پڑھانے کے لیے دیا گیا، میرے طریقۂ درس کی حضرت مولانا نے غیر معمولی تحسین فرمائی، ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پرو وائس چانسلر کا اصول تھا کہ وہ تدریس کے لیے کسی اہل آدمی کو صدر شعبہ کے مشورہ سے منتخب کر لیا کرتے تھے، شعبہ کی قید کے پابند نہ تھے، ان کے مستعفی ہونے کے بعد جب شعبۂ دینیات کی جدید تنظیم ہوئی تو یہ آزادی ختم کر دی گئی، ایک شعبہ کا مدرس دوسرے شعبہ میں کام نہیں کر سکتا تھا، مولانا مرحوم نے اپنے شعبہ کیلئے میرا انتخاب فرمایا اور شعبۂ دینیات کا کل کام میرے سپرد کر دیا، شعبہ میں تین آدمی تھے، میں لکچرر، مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی جونپوری ناظم دینیات اور حضرت مولانا ریڈر اور صدر شعبہ تھے،

امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا مولانا کا اصول طلبہ کے لیے غیر معمولی معاون تھا، حالانکہ طلبہ کے حلقہ میں مشہور تھا کہ مولانا مرحوم کاپی جانچنے میں سخت ہیں، جو واقعہ کے برعکس تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، ایک مرتبہ ایف اے اور ایف سی کے طلبہ کے امتحان کی تقریباً پانچ سو کاپیاں جانچنے کے لیے مولانا کے پاس آئیں، مولانا نے مجھکو بلا کر فرمایا "مولانا میں آپ کو ایک تکلیف دیتا ہوں وہ یہ کہ پانچسو کاپیاں آپ دیکھکر نمبر دیدیجئے، میں نے عرض کیا کل انشاء اللہ دیکھ لونگا، دوسرے روز دوپہر کو ظہر کی نماز کے وقت تک سب کاپیاں میں نے دیکھ ڈالیں، اور نمبر دیکر کاپیاں قاعدے سے رکھکر ان کے بیدار ہونے سے پہلے چلا آیا، عصر کے وقت مجھسے پوچھا، میں نے عرض کیا کہ کاپیاں دیکھکر نمبر دیدیے ہیں، حیرت سے فرمایا کہ کتنے فیل ہوئے، میں نے عرض کیا تینتیس، فرمایا یہ تعداد بہت زیادہ ہے، اور فرمایا کہ مولانا یہاں طلبہ دینیات پڑھنے کے لیے نہیں، بلکہ گریجویٹ ہونے کے لیے آتے ہیں کہ روزی سے لگ جائیں، اگر اتنی تعداد امتحان میں ناکام ہوگئی تو

پورے امتحان میں ناکام سمجھے جائیں گے، اس لیے دوبارہ کاپی جانچیے اور جس طالب علم کو دس نمبر ملتے ہوں اس کو کامیاب کر دیجئے، چنانچہ دوسرے روز میں نے اسی اصول پر دوبارہ کاپیاں دیکھیں اور عرض کیا کہ اب صرف پندرہ طلبہ ناکام ہیں، فرمایا یہ تعداد بھی زیادہ ہے، زیادہ سے زیادہ پانچ طلبہ فیل ہونے چاہئیں، میں نے عرض کیا کہ اب پندرہ کاپیاں آپ خود ملاحظہ فرماکر نمبر دیدیں، اب میں ان کو نہیں دیکھوں گا، چنانچہ ممدوح نے خود دیکھ کر پانچ کو ناکامیاب رکھا، اور باقی کو کامیاب کر دیا، یہ تھا حضرت مولانا کا طالب علموں کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ،

حضرت ممدوح کے خصائل اور کردار کی چند مثالیں اوپر دی جاچکی ہیں، جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے،

آپ کی بے خوفی اور بے باکی بے مثال تھی، وہ کسی کے علم و دولت کے آگے جھکنا جانتے ہی نہ تھے، لیکن اہل فضل و کمال کی بڑی قدر کرتے تھے، علم دین نے ان کو مجسم خلق اور انسانی خوف سے بے نیاز کر دیا تھا، مزاج میں انتہادرجہ کی نفاست تھی، کھانا اچھا کھاتے تھے، مگر قلیل مقدار میں، لباس کا بڑا اہتمام تھا، خاص طور پر جمعہ کے دن بہت چوڑی آستین کا لباس زیب تن کرتے تھے،

لباس کے سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، ایک روز جاڑوں کے موسم میں نواب سر مزمل اللہ خاں رئیس بھیکم پور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی "بارگاہ سلیمانی" میں حاضر ہوئے، اس وقت موصوف روسی پوستین پہنے ہوئے تھے، موٹر سے اتر کر علیک سلیک کے بعد نواب صاحب نے کہا کہ یہ پوستین میں نے روس سے منگوایا ہے، حضرت ممدوح نے پوستین کی تعریف کے ساتھ انکی امارت کی بھی توصیف کر دی، تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب چلے گئے، دوسرے روز حضرت مولانا نے روس سے ایک پوستین کی فرمایش بھیجدی، دوسرے مہینے ہی پوستین آگئی، حضرت ممدوح اسکو پہنکر نواب صاحب مرحوم کے پاس گئے، اور ان کو پوستین دکھا کر فرمایا کہ میں نے اسکو روس سے

منگوایا ہے، نواب صاحب تعریف کرکے خاموش ہو گئے، مولانا مرحوم کے پاس شیروانیاں اور بڑے مدراسی رومال بہت تھے، جو ان کے ذوق لباس کی ترجمانی کرتے تھے،

بے دودھ کی چائے نہ صرف خود استعمال کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی پیش کرتے اور فرماتے کہ دودھ کے ملانے کے بعد چائے کہاں رہتی ہے، وہ تو دودھ ہو جاتی ہے، مولانا مرحوم کا نہ صرف ماتحتوں کے ساتھ مشفقانہ و مربیانہ برتاؤ تھا، بلکہ نجی ملازمین، باورچی اور خدمتگار پر بھی پدرانہ شفقت فرماتے تھے، اول دن سے ان کے دو ملازم تھے، ایک باورچی اور ایک خدمتگار جو ان کی آخری حیات تک رہے، مولانا ممدوح نے حج و زیارت کا سفر بڑے اہتمام سے کیا تھا، جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا، ان کی والہانہ کیفیت اور شوق و وارفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، مرحوم نے جدہ کے بعد واپسی تک جوتا نہ پہنا، ان کی اتباع میں ان کے رفقا خان بہادر زین الدین صاحب مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر اور یونیورسٹی ٹریزرر اور پروفیسر حمید الدین خاں صاحب مرحوم صدر شعبۂ فارسی یونیورسٹی بھی برہنہ پا رہے، ممدوح اپنے رب کی بارگاہ میں سراپائے "عبدیت" ہو کر حاضر ہوئے تھے، مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین پر انھوں نے جو صبح و شام گذارے ان کے رفقا، اس کے جو واقعات سناتے تھے، اس سے بارگاہ نبوی سے ان کے بے پایاں عظمت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے،

مولانا مرحوم کی بارگاہ میں شام کو عصر اور مغرب کے درمیان احباب کی نشست ہوا کرتی تھی جس میں مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم اڈیٹر کانفرنس گزٹ، مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی مرحوم، نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، ڈاکٹر کریم حیدر مرحوم، پروفیسر اقتصادیات، خان بہادر چودھری نبی احمد مرحوم، سید زین الدین صاحب مرحوم اور کبھی کبھی ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم اور پروفیسر

حمید الدین مرحوم بھی ہوتے تھے، میں بھی بحیثیت ایک جونیر کے حاضری دیتا تھا، اور جب حاضری سے کسی وجہ سے قاصر رہتا تھا تو آدمی بھیجکر طلب فرماتے تھے، اس نشست میں اگر کسی مسئلہ کو پیش کیا جاتا تو جواب ملتا کہ یہ ہماری گپ کا وقت ہے، مسائل وغیرہ کے اوقات دوسرے ہیں،

مولانا مرحوم حسب ذیل وائس چانسلروں اور پرو وائس چانسلروں کے ماتحت رہے لیکن خودداری کو ٹھیس نہ آنے دی کبھی کسی کے یہاں حاضری نہیں دی بلکہ یہ حضرات خود کبھی کبھی بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوتے تھے، اور مولانا حسب مرتبہ ان کی آؤ بھگت فرماتے تھے، مہاراجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم، نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم، سر شاہ سلیمان مرحوم جج ہائی کورٹ الہ آباد، یہ آپکے استاذ بھائی مولوی محمد عثمان وکیل جونپور کے فرزند ارجمند تھے، اس لیے مولانا ان کے ماتحت ہونے کے باوجود ان کو اسی رشتہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور سر سلیمان مرحوم حضرت ممدوح کا کافی احترام کرتے تھے، سر راس مسعود مرحوم جو پہلے تنخواہ دار وائس چانسلر تھے، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم، مسٹر راس لوکھم، مسٹر مارٹن، ان میں صاحبزادہ آفتاب احمد مرحوم کے سوا جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا، باقی ہر وائس چانسلر سے تعلقات خوشگوار رہے،

حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے بھی بڑھکر کوئی خبطی نہ ہوگا اس کے بعد اپنے لطائف بیان فرماتے ہوئے خود بھی حظ اٹھاتے اور میں بھی لطف لیتا، فرمایا کہ ایک بار ایک صاحب دوپہر کو جب میں سو رہا تھا کمرہ کے اندر چلے آئے (یہ گرمیوں کا موسم تھا) اور السلام علیکم کہہ کے سونے کے کمرہ میں جو کرسی تھی اس پر بیٹھ گئے، ان کی آواز سے آنکھ کھل گئی لیکن میں اوڑھے ہوئے لیٹا رہا اور سلام کا جواب اسی نیم خوابی کی حالت میں دیدیا، انھوں نے فرمایا کہ میں نے جناب کو اپنی ایک تصنیف بھیجی تھی، میں نے بھی لیٹے لیٹے

...واپ دیا کہ ہاں بھی ہوگی، فرمایا اس پر میں آپ کی رائے کا طلب گار ہوں جس کے لیے اب تک منتظر رہا، میں نے جواب دیا، ہر کتاب پر رائے دینا ضروری نہیں ہے، یہ سنکر وہ اٹھے اور سلام کر کے کہا آپ کے علم و اخلاق کی شہرت سنی تھی، اخلاق تو دیکھ لیا، علم کا پھر کبھی امتحان ہو جائیگا، یہ کہکر چلدیے، میں گھبراکر اٹھا کہ کون صاحب ہیں اور اپنی لاپرواہی کی معذرت پیش کروں مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا،

ایک مرتبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ایک بزرگ عالم حضرت مولانا شیر علی صاحب مرحوم جو مولانا مرحوم کے جونپور میں رفیق درس رہ چکے تھے، تشریف لائے، جاڑوں کا موسم تھا، حضرت کے مہمان تھے، سخت سردی تھی، ان کے رہنے کا انتظام کمرہ کے اندر کر دیا گیا تھا، خود حضرت مولانا جاڑوں میں بھی لحاف اوڑھکر برآمدہ میں سویا کرتے تھے، تہجد کے وقت حضرت مولانا شیر علی صاحب اٹھے، دروازہ کھولا جس کی آواز سے مولانا کی آنکھ کھل گئی، نیم خوابی کی حالت میں پوچھا کون؟ مہمان بزرگ نے اپنا نام لیا اور فرمایا "مولانا گرم پانی وضو کے لیے چاہیے" مولانا نے اسی نیم خوابی کی کیفیت میں لیٹے لیٹے جواب دیا کہ دوزخ میں ہے۔ مہمان نے برجستہ فرمایا، بہتر ہے اٹھیے اور اس کا راستہ بتائیے، اس برجستہ جواب پر میں ہنس پڑا ... میں نے کہا کہ مولانا آپ نے اس برجستہ اور موزوں جواب سے ایک طرف تو مجھکو قائل کر دیا، دوسری طرف میری نیند بھی اڑا دی۔

مولانا مرحوم جاڑوں میں بھی سقاوے کا ٹھنڈا پانی وضو اور پینے کے لیے استعمال فرماتے تھے اور گرمیوں میں پنکھا استعمال نہیں کرتے تھے، مگر میں نے یہ آخری قانون اس طرح سے توڑ دیا کہ مولانا نے دس بارہ آدمیوں کی دعوت کی، میں ہی اس کا منتظم تھا، میں دہلی جاکر میز کا ایک پنکھا جو کافی بڑا تھا اور سستا مل گیا تھا، خرید لایا، بڑے کمرہ میں دسترخوان بچھایا گیا تو میں نے ایک کونے میں

اسٹول پر دہ پنکھا رکھ دیا جس نے تمام مہمانوں کو ہوا دی۔

مولانا مرحوم جیسا کہ اوپر لکھا گیا، جاڑوں کے موسم میں بھی باہر کے برآمدہ میں سویا کرتے تھے، ایک روز رات کو کسی وقت بارش ہوگئی، بوچھاڑ کا پورا پانی پلنگ پر آیا، ممدوح فرماتے تھے کہ جب پانی کی ٹھنڈک پیٹھ میں لگی تو میں سمجھا کہ سانپ پلنگ پر چڑھ آیا، ہو فوراً لحاف پھینک کر پلنگ کے نیچے کھڑا ہوگیا، تو دیکھتا ہوں کہ پانی پلنگ پر ہے، حد درجہ پشیمان ہوا۔

میں نے حضرت ممدوح کی پوری نو سال ماتحتی کی، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، ہمیشہ میرے طریق تدریس کو سراہا، ۱۹۳۳ء میں، میں ایک صاحب کے غلط اور گمراہ کن وعدوں کی بنا پر حیدرآباد کی خدمت پر آمادہ ہوگیا، چنانچہ میری درخواست پر صدر شعبہ کی سفارش پر اگزیکیٹو کونسل نے مجھے ایک سال کی رخصت بلا تنخواہ دیدی، اور میں حیدرآباد چلا گیا، اگرچہ مولانا مرحوم نے میرے حیدرآباد جانے کو ناپسند فرمایا، مگر میرے اصرار پر بہرحال مجھکو اجازت مرحمت فرمادی۔

وہاں جب ملکی اور غیر ملکی کے ہنگامہ نے سر اٹھایا تو میں نے علی گڑھ کی واپسی کا فیصلہ کرلیا اور مہاراجہ بہادر صدر اعظم حکومت کو استعفا پیش کردیا، مولانا مرحوم و مغفور کو اپنے ارادہ سے مطلع کردیا، مولانا نے جو تفصیلی خط مجھے بھیجا تھا، وہ انتہائی شفقت سے معمور تھا، انھوں نے میرے ارادہ کی توصیف فرمائی، اور اسکے بعد تحریر فرمایا، آپ نے مشورہ طلب فرمایا اور اپنے مخلصانہ اعتماد سے میری عزت افزائی فرمائی ہے، رائے پیش کرنا ضروری ہے، مولانا! نہ میں عاقل، نہ فرزانہ اور نہ آزمودہ کار، ہاں آپ ہی کے بزرگوں نے اپنے خوان فیض سے جو ریزے علوم شرعیہ کے مجھے عطا فرمائے ہیں، ایسے موقع پر اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ میری پختہ رائے ہے کہ آپ علی گڑھ تشریف لے آئیں......... آپ جیسی

شخصیت اس وقت ہندوستان میں نادر الوجود ہے........ بادل ناخواستہ میں آپ کے حیدر آباد جانے پر یوں راضی ہوا تھا کہ آپ وہاں جاکر اپنے چند بیکار عزیزوں کیلئے کچھ شغل پیدا کرلیں گے لیکن برس روز کا یہ نتیجہ ہے کہ ذہنی کوفت، مالی نقصان، وطن کی جدائی، احباب کی مفارقت، یہ سب ہے، مگر روپیہ مفقود،

آگے چل کر اپنے طبعی تعلق کو اس طرح سے ظاہر فرماتے ہیں" آپ کے تشریف لے جانے سے میرا بازو ٹوٹ گیا، میرے شعبہ میں روح نہیں ہے، ایک مخلص کرم فرما سے محروم ہو جانا بڑی مصیبت ہے........ صحبت گذشتہ کا نوحہ اور ماتم، خدا کے لیے اب بھی سمجھ جائیے اور یہاں چلے آئیے" خط کو ختم کرنے سے پہلے بہار کے زلزلہ کا حال لکھتے ہوئے اپنے دولت کدہ کے نقصان کا بھی ذکر فرمایا، اور لکھا کہ زلزلہ نے تو دل پر اثر کیا ہی تھا کہ اسی عرصہ میں آج محمد امین صاحب زبیری نے سرفراز فرمایا، پانچ منٹ کی سرفرازی نے طبیعت کے اعتدال کو پامال کر دیا، اس لیے اگر کوئی لفظ یا جملہ نامناسب قلم سے نکل گیا ہو تو اسے معاف فرمائیے"۔

اس کے بعد میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا، اور مہاراجہ کشن بہادر صدر اعظم کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا، جسے انھوں نے مشفقانہ انداز میں اطمینان دلاکر بیش گاہ خسروی میں میرے لیے فرمان حاصل کرلیا، افسوس ہے کہ میں حیدر آباد ہی میں تھا کہ حضرت مرحوم نے تھوڑے دنوں کی ناسازی مزاج کے بعد اسی مکان میں جس میں روز اول آکر مقیم ہوئے تھے، ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ روز چہارشنبہ کو انتقال فرمایا، حضرت مرحوم کی وفات کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صدیوں پہلے گذرنے والے علماء و مشائخ کی ساری خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، حضرت یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے، قبر پر حسب ذیل کتبہ کندہ ہے، جواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا مصنفہ ہے:

سلیمان اشرف سراہل تقویٰ — بہ علم و عمل والہ دین اشرف
چو نفسش شنید آیۂ ارجعی را — بہ جنت شد از قرب حق مشرف
پسش از دل پاک حسرت نوشتہ — بہ جنات عدن سلیمان اشرف

قطعہ کے آخری شعر سے سال وفات نکلتا ہے، جس کے پہلے مصرع کے الفاظ "دل پاک" سے تخرجہ اس طرح سے کہا ہے کہ لفظ پاک کا الف گویا پاک کا "دل" ہے، عدد ایک کو دوسرے مصرع کے اعداد میں جوڑ دیا جائے تو باعتبار حساب جمل ۱۳۵۸ھ ہو جاتے ہیں، اگرچہ یہ تخرجہ ذرا دور از کار ہے لیکن ایک عالم کے قلم کا ہے اس لیے قابل تسلیم ہے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کی مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا اور ہزاروں محققانہ، علمی و ادبی و تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، جو ۴۸ سال سے اپنی شاندار روایات کے ساتھ یکساں جاری ہے، اسکے مضمون نگاروں میں تلامذۂ شبلی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوظفر ندوی وغیرہ فضلائے ندوہ کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش ہیں، جنکے تحقیقی مضامین، علمی مقالات و ادبی نگارشات سے اسکے صفحات مزین ہیں، کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے مشکل ہی سے اردو کا کوئی رسالہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے، اسکی شہرت ہندستان سے گزر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، یورپ کے ہر ملک کے مستشرقین نے اسکے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات اور محققانہ معلومات کی داد دی ہے، اور جن مستشرقین نے اسلام و تاریخ اسلام پر جب جب بھی اعتراضات کیے، سید صاحب نے اسی کے صفحات میں انکے جوابات دیے۔ اس رسالہ کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے مکتبہ میں محفوظ ہے، جن صاحب کو اس بیش بہا علمی ذخیرہ کی ضرورت ہو، دفتر سے خط و کتابت کریں۔

منیجر

تعزیتی تجاویز اور خطوط

(۲)

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کی رحلت کے سلسلہ میں تعزیتی تجویزیں اور خطوط ابتک برابر موصول ہو رہے ہیں، ان کا فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے ہم معارف کے ذریعہ ان تمام اداروں، بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اس حادثۂ جانکاہ میں دار المصنفین کے کارکنوں کے غم میں شریک ہوئے۔

(ص - ع)

حسب ذیل اداروں کی طرف سے تعزیتی تجویزیں موصول ہوئی ہیں:۔

(۱) شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ (اس کے پرنسپل جناب شوکت سلطان صاحب اس حادثہ کے وقت لکھنؤ میں تھے، وہاں سے انھوں نے تعزیتی تار بھیجکر اظہار غم کیا) (۲) مدرسہ نسواں انٹر کالج اعظم گڈھ (۳) دار العلوم مئوناتھ بھنجن اعظم گڈھ (۴) یوپی سنی وقف سنٹرل بورڈ لکھنؤ (۵) شعبۂ اسلامیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (۶) شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ (۷) جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی (۸) شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی دلی (۹) اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ (۱۰) انجمن ترقی اردو بمبئی (۱۱) جمعیۃ الطلبہ جامعہ فیض عام مئو ضلع اعظم گڈھ (۱۲) انجمن نادیۃ الاتحاد الجدید طلبۂ دار العلوم دیوبند (۱۳) مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (۱۴) انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی (۱۵) انجمن ترقی اردو بنارس (۱۶) جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر

(۱۷) دار العلوم فاروقیہ کاکوری (۱۸) جامعہ فاروقیہ صبر حد جونپور (۱۹) ایران سوسائٹی کلکتہ (۲۰) مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج۔ جونپور۔ (۲۱) شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڈھ۔

خطوط

راج بھون بھبنیشور ۲۴ جنوری ۱۹۸۶ء گورنر اڑیسہ

مکرمی صباح الدین صاحب! تسلیم

کرم نامہ ملا، جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کے انتقال کی اطلاع سے بیحد صدمہ ہوا، صاحب ممدوح نہ صرف جید عالم، پرہیزگار اور خدا ترس بزرگ تھے، بلکہ آپ کی طرح انھوں نے بھی اپنی زندگی دار المصنفین کے لیے وقف کر دی تھی، ان کے انتقال سے ادارہ کو بڑا نقصان پہنچا، خداوند کریم آپ کو اور آپ کے رفقاے کار کو مزید تقویت بخشے، امید ہے کہ آپ اس سانحہ کو برداشت کرتے ہوئے دار المصنفین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقف ہو جائیں گے، تاکہ یہ تاریخی علمی ادارہ اپنی پرانی شان کے ساتھ چلتا رہے، اور جو حضرات اس سے تعلق رکھیں وہ نہ صرف علم کی خدمت کریں بلکہ ہندوستان کے اتحاد و یگانگت کی قوتوں کو اور زیادہ مستحکم کریں، اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اچھی اور قابل احترام روایات کو قائم رکھتے ہوئے ملک کی ترقی میں بھرپور حصہ لیں، یہی مقصد حضرت شبلی مرحوم اور حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم اور دیگر اکابر کا تھا، اس میں انسانیت کی بھی بہتری ہے۔ میری طرف سے تمام احباب اور پرنسپل صاحب شبلی کالج کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں۔ میری نیک تمنائیں اس ادارہ اور آپکے ساتھ انشاء اللہ ہمیشہ رہیں گی، میں آپ سب احباب کی دعاؤں کا محتاج ہوں، امید کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔

اکبر علی خاں

راج بھون بمبئی۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۵ء

مکرمی!

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر مجھکو شاق گذری، خدا اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں لے، میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ اپنے نانا کے توسط سے مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے نیاز حاصل تھا، اور بچپن میں تو مولانا شبلی مرحوم کو بھی اپنے نانا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا اور کبھی کبھار انکی گود میں بیٹھنے کی عزت بھی حاصل ہوئی تھی۔

علی یاور جنگ

شعبۂ تاریخ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۷۵ء

برادر مکرم! سلام مسنون

کرم نامہ ملا، کیا بتاؤں شاہ صاحب کی یاد دل سے بھلائی نہیں جاسکتی، ان کی وجہ سے ایک خلا سا محسوس ہونے لگا، بقول عرفی

تراچہ آگہی کہ مرا از غروب آفتاب چہ گنجہائے سعادت زیاں جاں آمد

آپ کی جو ذہنی اور قلبی کیفیت ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ "معارف" میں آپ کا مضمون کئی بار پڑھا، اس کے ایک ایک لفظ سے سوز دل کی بو آتی ہے۔ یقیناً آپ کے لیے یہ سخت آزمایش کا وقت ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

...... مجھے یقین ہے کہ آپ نہ صرف ان روایات کو قائم رکھیں گے بلکہ دار المصنفین آپکی سرپرستی میں مزید ترقی کرے گا، ایسے حادثہ میں رنج و غم بالکل فطری بات ہے لیکن اس سے قوتِ عمل پر اثر نہیں پڑنا چاہیے، اب ان بزرگوں کی ارواح کو خوش اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ادارہ کی ترقی کے لیے مزید جد و جہد کی جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب صلاحیتیں دی ہیں، بہ دل زہو جیے،

اپنے کاموں میں لگ جایئے، اللہ مدد کرے گا۔

میں انشاء اللہ فروری میں دمشق چلا جاؤں گا، آپ سے امید ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

والسلام

آپ کا خلیق احمد نظامی

آبگلہ - گیا - ۱۷/ دسمبر ۸۴ء

برادرم صباح الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم - اچانک شب میں شاہ معین مرحوم کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، ڈھائی بجے شب تک آنکھوں سے آنسو رواں رہے اور اپنی اور ان کی نوعمری سے اس عمر تک کی زندگی کے سارے مرقعے یکے بادیگرے آنکھوں کے سامنے آتے رہے، تقریباً پوری رات بیداری میں گذر گئی، میری ان کی باہم یگانگی میں بھی بے مثال یگانگی تھی، قلب آجتک بے چین ہے، اگر میں سفر کے قابل ہوتا تو میں آپ لوگوں کے پاس پہنچکر آپ کے غم میں شریک ہوتا، اتفاق سے بڑی دشواریوں کے بعد چند دن ہوئے بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا ہے اس وقت تک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے، میں تقریباً دو سال سے لکھنے پڑھنے اور کہیں آنے جانے سے معذور رہوں، تقریباً دو سال ہوئے پٹنہ گیا تھا، اس کے بعد ہی ہائی بلڈ پریشر کا اثر پڑا، کئی بار چکر کھا کر زمین پر گرا، ذیابیطس کا بھی سخت حملہ رہا، ان بیماریوں کی وجہ سے موتیابند کا آپریشن ممکن نہ تھا، اب اپریشن کرایا تھا، خیال تھا کہ سفر کے لائق ہونے کے بعد ہی میں اعظم گڈھ پہنچونگا، اب میں کیا کہوں کہ دل کی تمنا یہی تھی کہ میاں معین کے پاس چند دن ٹھہر کر گھل مل لیتا اور پھر آگے سفر کا قصد تھا، افسوس میری ان کی آخری ملاقات اسی جوبلی کے موقع پر رہی، انکی محبت اور یگانگی کی یاد اپنی جگہ رہ کر مختلف باتیں یاد دلاتی رہتی ہیں، اس وقت آنکھوں کے

سامنے ان سے آخری ملاقات کا وہ منظر ہے جب وہ ۱۲ بجے شب کو میرے لیے اپنے بغل میں دبائے ہوئے بستر میری قیام گاہ پر لائے، اس وقت تنہائی میں جو باتیں ہوئیں، وہ سب ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں اور مجھے تڑپا رہی ہیں، جتنے دنوں بھی اب میری زندگی ہے، وہ برابر مجھے یاد آتی رہیں گی، اور میں ان کے غم میں روتا رہوں گا،

اگر اللہ نے چاہا تو ڈیڑھ دو مہینے کے بعد میں سفر کے قابل ہو جاؤں گا، اور فوراً ہی اعظم گڈھ پہنچکر ان کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گا، اور آپ لوگوں سے ان کا ذکر خیر کرکے اپنے آپ کو تسکین دونگا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اور ان کے اعزہ واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور آپ کے دست و بازو کو تقویت دے کہ مرحوم کے انتقال سے جو بارگراں آپ پر آگیا ہے، اسکو خوش اسلوبی سے اب سنبھال سکیں،

والسلام

آپ لوگوں کا مخلص

ریاست علی ندوی

مجمع خوبیہا ! سلام مسنون

میں آجکل مکہ مکرمہ میں ہوں، کل برادر عزیز مولانا سید عبداللہ عباس ندوی سے جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر ملی، جس سے سخت صدمہ اور افسوس ہوا، دارالمصنفین میں وہی ایک پرانی شخصیت رہ گئی تھی، جس سے ادارہ کو تقویت تھی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور آپ کو اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین۔

شاہ صاحب مرحوم ہی نے ماہ شوال میں جبکہ میں سفر حج کی نیت سے بمبئی آرہا تھا، انصاری صاحب کو بمبئی خط لکھا تھا کہ امان اللہ حج کے لیے جا رہے ہیں، بمبئی میں ان کو آپ اپنے یہاں ٹھہرائیں،

اور ہر طرح کا خیال رکھیں، چنانچہ انصاری صاحب نے اپنے مکان میں ہمیں اور ہمارے رفقاء کو ٹھہرایا اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔

اب آپ پر دارالمصنفین کا بوجھ پڑ گیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے، اور دارالمصنفین کو قائم رکھے اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین

محمد امان اللہ قادری پھلواروی

۱۴ر ذی حجہ شنبہ ۱۳۹۴ھ از مکہ معظمہ

ٹونک، ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۴ء

محترم! سلام مسنون

دو روز ہوئے آل انڈیا ریڈیو سے یہ الم ناک خبر سننے میں آئی کہ مدیر رسالہ معارف حضرت مولانا شاہ معین الدین ندوی اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا شاہ صاحب یادگار سلف تھے، ان کی وفات علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، علمی دنیا ان کی رحلت پر جتنا بھی غم کرے وہ بجا و درست ہے، ایسے گوہر نایاب اور ایسے بحر العلوم اب کہاں پیدا ہو سکتے ہیں، علم کی اس کساد بازاری میں علم و ادب کے ایسے بحر بیکراں کا جو جامع علوم و فنون بھی ہو، اٹھ جانا ایک قیامت ہے، ایک ایسی مصیبت ہے بلکہ مصیبت کا ایک ایسا پہاڑ ہے جو اہل علم کے سروں پر گرا ہے، اور اس نے ان کی ہمتوں کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا ہے،

رسالہ معارف کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے علم و عرفان کی جو بارش کی اور جس طرح اس علمی رسالہ کو مرتب فرماتے رہے، اور اس کے قیمتی مضامین کے ذریعہ علمی دنیا کو جو رہنمائی دی، آج ان کی جدائی کے وقت ان کا احساس و اعتراف شدت سے ہو رہا ہے، اور انکی

کمی کو بری طرح محسوس کیا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات نے ایسا زبردست خلا پیدا کر دیا ہے جو صدیوں پر ہونا ممکن نہیں ہے،

وہ دارالمصنفین کے سکریٹری و رفیق و روح رواں تھے۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان کے دور کے دیکھنے والے تھے۔ انکی علمی مجلسوں کے رفیق و شریک تھے، اور بزرگوں کی صالح روایات کے امین و محافظ تھے، خود بھی ایک صاحب طرز انشاء پرداز، مورخ اور ادیب و عالم تھے،

بے شمار خوبیوں اور صدہا صفات حسنہ کے وہ منبع و مرکز تھے، ان کی ذات خوبیوں ہی خوبیوں اور محاسن و محامد کا مجموعہ تھی، ایسی خوبیوں کے انسان کی وفات انسانیت کیلیے ایک بڑا حادثہ ہے۔

مرحوم سے مجھے غائبانہ تعارف حاصل تھا اور خط و کتابت کا شرف بھی، وہ بڑی محبت اور خلوص کا اظہار فرمایا کرتے تھے،

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ہماری طرف سے تعزیت مسنونہ پیش ہے۔

"دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک" میں جو راجستھان کی ایک قدیم درسگاہ ہے اور حضرت علامہ حکیم سید برکات احمد کی علمی یادگار ہے، شاہ صاحب کی وفات پر جلسۂ تعزیت ہوا اور مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا۔

مرحوم کے پسماندگان تک ہماری تعزیت پہنچا دیجئے۔ فقط والسلام

شریک غم منظور برکاتی و قاضی الاسلام

مدرسین دارالعلوم خلیلیہ ٹونک

رضا لائبریری رامپور، ۱۸ دسمبر ۱۹۷۴ء

برادر مکرم! سلام مسنون

اخبار دعوت دہلی سے معلوم ہوا کہ شاہ معین الدین صاحب کا انتقال ہو گیا، اس قحط الرجال میں ان

جیسے عالم، صوفی اور خوش اخلاق مسلمان کی جدائی ملت کا بڑا نقصان ہے، کثر اللہ فینا امثالہ، میں آپ اور ان کے دوسرے رفقا کے لیے دست بدعا ہوں کہ آپ کے اس غم کا اچھا اجر عطا ہو، اور ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے آپ سب مل کر بھر دیں، آمین ثم آمین۔

تمام احباب کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسلام مع الاکرام

مخلص عرشی

نیو دہلی، ۱۴ر دسمبر ۷۴ء

محب مکرم آداب و تسلیمات

ابھی ابھی ریڈیو سے شاہ معین الدین احمد مرحوم کی رحلت کی افسوسناک خبر سنی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کو اس ناگہانی حادثہ سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے، عمر بھر کا ساتھی چھوٹ گیا، آپ اس پر جتنا ماتم کریں کم ہے، اتنا لمبا عرصہ آپ ایک دوسرے کے دن رات کے رفیق رہے کہ یہ جدائی بہت شاق گذرتی ہوگی، دارالمصنفین کا نیا انتظام کرنا پڑیگا، آپ تن تنہا اتنا بوجھ کہاں اٹھا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل ارزانی فرمائے، آمین۔

میری طرف سے مرحوم کے خاندان میں تعزیت کیجئے گا۔

دعا ہے کہ خدائے برتر ان سے عفو و کرم کا سلوک کرتے ہوئے اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

سری نگر۔ ۹ر جنوری ۷۵ء

برادر محترم!

شاہ معین الدین صاحب کے انتقال کی اطلاع مجھے ۱۸ر دسمبر کو حیدرآباد سے دہلی پہنچتے ہی مل گئی تھی

ایک محفل میں رشید حسن خاں نے یہ اطلاع دی، کیا بتاؤں کس قدر صدمہ ہوا لفظوں میں نہیں آسکتا ہے

فروغ شمع جواب ہو، رہیگا رہتی دنیا تک مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

میں آپ کے غم کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں، آپ کا زندگی بھر کا تعلق تھا، ہر روز کا، بلکہ ہر لمحے کا تعلق تھا، لیکن تعلق کتنا ہی گہرا اور ریختہ کیوں نہ ہو، موت اس تعلق کو توڑ دیتی ہے۔ آپ ان باتوں کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں، اس قدر شدید صدمہ پر میں کیا حرفِ تسلی آپ کو لکھوں، میں خود اپنے آپ کو پرسے کا مستحق سمجھتا ہوں۔ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جگن ناتھ آزاد

یو۔پی، اسٹیٹ آرکائیوز لکھنؤ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۴ء

ڈیر رحمان صاحب!

مجھکو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی غمناک وفات سے انتہائی صدمہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ان کی روح کو شانتی بخشے۔ میں آپ کے اور ان کے رشتہ داروں کے غم میں شریک ہوں، ان کے خاندان کے سوگوار پس ماندگان تک میرا تعزیتی پیغام پہنچا دیں، ہم سے ایک بڑا اسکالر جدا ہو گیا علم کے لیے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

آپ کا مخلص کے۔پی سری واستوا

کلکتہ۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۴ء

مکرمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب!

آج صبح "آزاد ہند" میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی اچانک غمناک موت کی خبر پڑھکر بہت ہی مغموم ہوں، اس صدمہ سے اتنا ملول ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے

جذبات کا اظہار کن الفاظ میں کروں، ہندوستان کے مسلمان بلکہ اسلام کا ایک بہت ہی شریف اور اعلیٰ اوصاف کی شخصیت سے محروم ہوگیا، ان کی خدمات جو انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور کلچر کے سلسلہ میں کیں وہ اپنی جگہ پر لاجواب ہیں، پرانے کلچر کی اعلیٰ شخصیتیں رفتہ رفتہ ہم سے جدا ہو رہی ہیں، اور ان کی جدائی سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے وہ پر نہیں کیا جا سکتا، دارالمصنفین اور خصوصاً آپ کے لیے تو یہ بیحد المناک حادثہ ہے، میری تعزیت ان کے خاندان کے سوگوار افراد تک پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کا مخلص خواجہ محمد یوسف

کلکتہ مدرسہ، کلکتہ۔ ۷ جنوری ۱۹۷۵ء

مکرم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

سلام مسنون۔ مولانا شاہ معین الدین صاحب کے حادثہ کی اطلاع یہاں کے اخبارات نے کافی تاخیر سے شائع کی، جبکہ یو۔ پی میں بر وقت اور بہت تیزی سے پھیل گئی تھی، کلکتہ سے خود آپکے بھی کافی تعلقات ہیں۔ پھر بھی یہاں اتنی تاخیر ہوئی۔ اور شاید اسی وجہ سے مجھے خط لکھنے میں بھی کافی دیر ہوگئی۔

شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ تو دینی، علمی اور دانشوروں کے طبقے ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے جس کو ناچار برداشت تو کر لیا گیا مگر اس کا اثر مدتوں تک قائم رہے گا، بلکہ اس سے بڑھکر بیرون ہند بھی شاہ صاحب کی علمی ادبی شخصیت کو مدتوں یاد رکھا جائے گا، لیکن آپ کے لیے اور آپ پر اس حادثہ کا جو اثر ہوا ہے وہ بالکل فطری امر تھا، میں نے جو کچھ سنا اگر اس کے خلاف کوئی بات ہوتی تو میرے لیے حیرت

استعجاب کا سبب بنتی۔ اس کو ایسے ہی سمجھ لیجئے کہ پنڈت نہرو پر رفیع احمد قدوائی کے انتقال کی خبر سے چین میں جو اثر ہوا تھا بس کچھ اسی قسم کا آپ پر بھی اثر ہوا ہے، میرے اندازے میں حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم کے واقعہ کو اگر یاد دلاؤں تو بیجا نہ ہوگا، اس وقت آپ کی کیا کیفیت تھی، اور یقیناً آپ دارالمصنفین سے مایوس ہو گئے ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ادارہ کو باقی رکھا اور اچھی حالت میں رکھا بس اسی کو یاد کرکے آپ اپنے اس غم کو بھی برداشت کیجئے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے کسی مرد خدا کو ظاہر کریں گے، جو اس روشن چراغ کے لیے تیل کا کام دے گا۔ ذمہ داری کا جو بوجھ آپ پر ہے، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اس فکر میں آپ تنہا نہیں ہیں، دوسرے بھی کم وبیش آپ کے شریک غم وفکر ہیں۔ آپ اپنے ارد گرد سوگواروں اور فکرمند دلوں کا گروہ پائیں گے، کیا آپ کی تسلی اور صبر کے لیے یہ کافی نہیں ہیں، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرنا رسماً اور عادۃً تو ہے ہی، مگر اس سے بڑھ کر ان کے طفیل میں خود اپنے لیے دعائے مغفرت ہوتی ہے، اسلیے دل سے ہر فرد دعا کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول فرمانے والے ہیں،

فقط والسلام شریک غم سوگوار محبوب الرحمن

اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۴ء

مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

شاہ صاحب کے اچانک انتقال پر ملال سے دل و دماغ کا جو عالم ہے، اس کا احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے، اور خود آپ کا کیا حال ہوگا، اس کا تصور بھی دشوار ہے، مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارۂ کار ہی کیا ہے، اور "کل من علیہا فان" کے ازلی قانون سے کسے مفر ہے، اس لیے خود صبر سے کام لیکر دوسروں کو صبر کی تلقین کیجئے، حالانکہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کلمات تعزیت آپ تک پہنچاؤں۔

عجیب اتفاق ہے کہ ۱۳؍دسمبر کو میں دریاباد مولانا دریابادی کی خدمت میں ان کے کتب خانے کے یونیورسٹی کے لیے خریداری کے سلسلہ میں حاضر ہوا اور اسٹیشن پہنچنے پر وہ منظر یاد آیا جب وہاں سے مولانا موتمر علوم اسلامیہ کے اجلاس ششم میں شرکت کی غرض سے ساتھ ہو گئے تھے اور پھر اسی اجلاس کا پورا منظر اور اس کے جلسوں اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں شاہ صاحب اور آپ کا انہماک یاد آگیا، جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد مولانا سے خود اس اجلاس کا ذکر آیا اور اس وقت بے اختیار دل اعظم گڈھ پہنچکر شاہ صاحب سے ملنے کا چاہا، اس لیے کہ آپ سے کچھ عرصہ قبل ملاقات ہو گئی تھی مگر شاہ صاحب سے عرصہ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، مگر کیا خبر تھی کہ اس وقت قضا و قدر اس ملاقات سے ابدی محرومی کا فیصلہ کر رہی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آج یہاں پہنچا، تو شعبہ کے اساتذہ و طلبہ سے اس حادثہ کا ذکر ہوا، اور اسی کے بعد ان کا ایک مشترکہ جلسۂ تعزیت ہوا جس کی تجویز منسلک ہے۔ اور میں اپنی اور اپنے رفقاء و طلبہ کی طرف سے بھی کلمات تعزیت پیش کر کے بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور مرحوم کے پس ماندگان و جملہ رفقائے دار المصنفین کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

شریک غم زدہ اقبال انصاری

نئی سڑک، دہلی۔ ۲۱؍دسمبر ۱۹۷۴ء

محترم و مکرم! سلام مسنون

گرامی نامہ اور معارف کے اپریل و اکتوبر کے شمارے ملے، شکریہ کا خط لکھنے ہی والا تھا کہ اخبارات کے ذریعہ مشفق و محترم حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب مرحوم کے انتقال کی افسوسناک خبر بہار بنکر گری، ابھی معارف میں ان کے سفر حرمین شریفین کی روداد سے لطف اندوز ہو رہا تھا

کہ انکی جدائی کی خبر نے بجلی گرادی، ابھی اس اندوہناک خبر سننے کے لیے دل تیار نہ تھا، مگر حکم ربی.... انا للہ۔
فوری طور پر انجمن تعمیر اردو کی طرف سے غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی میں تعزیتی جلسہ کیا گیا، جسکی
صدارت عالیجناب کرنل بشیر حسن زیدی نے فرمائی، نیز ڈاکٹر یوسف حسین خاں، علی جواد زیدی، گلزار
دہلوی، صالحہ عابد حسین، جسٹس دیاس دیو مصرا، ایس، ایچ۔ لے جعفری، ظفر مرادآبادی، عزیز وارثی،
ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ذہین نقوی۔ نیز بہت سے شعراء، ادباء، صحافی اور
دانشور حضرات نے شرکت فرماکر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور دعائے مغفرت کی۔

میری جانب سے مولانا مرحوم کے اہل خاندان کی خدمات میں بعد سلام کے تعزیت پیش فرمادیں
خداوند قدوس مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، اور جوار خاص میں جگہ دے، آمین

والسلام قمر سنبھلی

مومن پورہ، ناگپور۔ ۱۸ دسمبر ۷۵ء

مکرم! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، کل کے روزنامہ دعوت دہلی میں یہ خبر دیکھی کہ شاہ معین الدین صاحب ندوی
اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر کو پڑھ کر میرے دل پر جو کچھ گذری وہ بیان
نہیں کرسکتا، اور آج جبکہ یہ خط لکھ رہا ہوں تو میری آنکھیں اشکبار ہیں، گذشتہ پانچ سالوں میں
مرحوم کے بہت ہی قریب ہوگیا تھا، اور معارف میں میرے کلام کی اشاعت ان ہی کی مرہون منت
اور محبت کا نتیجہ بھی، موصوف سراپا اخلاق وکردار اور مجسم خلیق انسان تھے، انکی ذات مجمع الفنون
تھی، لہذا اگر یہ کہا جائے کہ شاہ صاحب کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، تو بے جا نہ ہوگا، دلی دعا ہے
کہ اللہ تعالیٰ ان سے عفو وکرم کا سلوک کرے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائے، نیز
انکے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بخت ... کا ... کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی ... گ

فرنگی محل - ۱۶ دسمبر ۱۹۷۴ء

محب محترم و کرم زاد مجدکم، السلام علیکم - حضرت مولانا الحاج شاہ معین الدین اللہ کے یہاں تشریف لے گئے، ہم سب اپنے وقت پر وہیں جائیں گے، مبارکباد کے مستحق وہ بندے ہیں جو وہاں جانے کی تیاری کر لیا کرتے ہیں، شاہ صاحب ان ہی میں سے تھے،

اس دنیا کا کام کس نے پورا کیا ہو کہ شاہ صاحب کر لیتے، ان کے کاموں کی تکمیل انشاء اللہ آپ کے ہاتھوں ہوگی، آپ شاہ صاحب کے پرانے رفیق ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ آپ رفاقت کا حق ادا کریں گے۔ مسند علم سونی ہوگئی اور خالی بھی ہوگئی، اس کے پہلے بھی بارہا ایسا ہوا ہے، مگر اللہ نے ہمیشہ کسی نہ کسی کو منتخب فرمایا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشریف لیجانے کے بعد لوگوں نے دار المصنفین کا فاتحہ پڑھ لیا تھا، مگر اللہ نے دکھا دیا کہ یہ ادارہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ نہ معلوم کتنوں کو زندۂ جاوید کرنے والا ہے،

شاہ صاحب تو اچھے تھے، انشاء اللہ جنت میں اچھوں کے ساتھ ہوں گے،

میں نے چودھری اویس احمد سلمہ سے تعزیت کی ہے، وہ میری طرف سے اپنی والدہ اور عزیزی داود احمد سلمہ سے تعزیت کر لیں گے۔

دار المصنفین سے بھی تعزیت لازم ہے، تو آپ کا یہ نیازمند آپ کے ذریعہ یہ فرض پورا کر رہا ہے، مجھے خوب معلوم ہے کہ شاہ صاحب مرحوم آپ کے ساتھ بہت محبت فرماتے تھے، اور ہمیشہ آپ پر اعتماد کرتے تھے، براہ کرم میری دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ اللہ کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ والسلام

ہاشم

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۵ر دسمبر ۵۴ء

محترمی ! السلام علیکم

رات سوا نو بجے کی اردو خبروں میں ریڈیو نے جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی وفات کی خبر سنائی، انا للہ۔ شاہ صاحب کی علالت کی اطلاع پہلے سے کوئی نہیں تھی، اس لیے اس خبر سے سخت تعجب ہوا، اس حادثہ کی وجہ سے آپ پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ بڑی حد تک ہے، ذرا مطلع کر کے ممنون فرمائیے کہ کب بیمار ہوئے، کیا بیمار ہوئے، کس وقت انتقال ہوا، مجھے تلبہ معلوم کرنے کی بےچینی ہے، اگر آپ اس وقت خود نہ لکھ سکیں تو براہ کرم مولوی ضیاء الدین صاحب سے کہہ دیجئے وہ لکھ دیں۔

شاہ صاحب کی وفات پر دار المصنفین کے مستقبل کے بارہ میں فکرمند ہونا لازمی ہے، مگر اس سے زیادہ اس وقت آپ کی فکر ہے، دار المصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر آپ کی رقت قلبی کا جو مشاہدہ ہوا تھا، اس کی وجہ سے بار بار خیال آتا ہے کہ نہ جانے آپ پر کیا گذری ہوگی، آپ کا کیا حال ہوگا، مگر جس طرح آپ نے دوسرے رفقائے دار المصنفین کے غم برداشت کیے ہیں اور ان کی جدائی کے بعد ذمہ داریوں میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھایا ہے، اسی طرح اس موقع پر بھی صبر و ضبط کا ثبوت دیں گے، اور اب جبکہ دار المصنفین کی تمام ذمہ داریاں تنہا آپ کے کاندھے پر آپڑی ہیں، مجھے امید ہے کہ اس سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرینگے، مجھ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں آپ پر، آپ کی صلاحیتوں اور آپکے خلوص پر پورا بھروسہ اور دار المصنفین سے محبت اور لگاؤ ہے، خدا سے دعا ہے کہ آپ میں صبر و ضبط اور اس اہم ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دینے کی طاقت اور ہمت پیدا کرے، آمین۔

آپ کا نیازمند: عبد اللطیف اعظمی

(باقی)

ادبیات

شاہ صاحب کی وفات پر بہت سی تعزیتی نظمیں بھی موصول ہوئیں جن میں کچھ تو شائع کیجا رہی ہیں اور جگہ کی قلت کی وجہ سے کچھ کے صرف چند اشعار لیے گئے ہیں۔ (ص - ع)

آہ مولانا شاہ معین الدین احمدؒ

از جناب پروفیسر نکہت شبلی جہانپوری

کرمفرمائے نکہت شاہ مولانا معین الدین　　　بجبیل آمد بہ جنت شاہ مولانا معین الدین

ہماں ناز سلیمانؒ، فخرِ شبلیؒ جان محبوبی　　　ادب آموز ملت شاہ مولانا معین الدین

معارف ہا ازو گلشن، فضائل ہا ازو روشن　　　مثیلِ ابر رحمت شاہ مولانا معین الدین

تجلیاتِ احمدؐ با احد در سیرتش پنہاں　　　سراپا نور وحدت شاہ مولانا معین الدین

چہ خوش اسمے کہ دارو با مسمیٰ ہم نوائی ہا　　　زہے حسنِ سعادت شاہ مولانا معین الدین

بہ کردارو بہ گفتارو بہ علم و فضل دل آرا　　　مجسم حسن سیرت شاہ مولانا معین الدین

چرا نازو نہ ہندوستاں بذات و کمال او　　　خوشا سرکار عظمت شاہ مولانا معین الدین

ہمہ گلہائے فن و علم بینی از کہ خندہ زن؟　　　ز فردوسی بصیرت شاہ مولانا معین الدین

بہ خلوت انجمن آرا بہ جلوت نازش دلہا　　　ز سرتاپا محبت شاہ مولانا معین الدین

بصیرت کارو دور اندیش صلح و آشتی پرور　　　زہے نباض فطرت شاہ مولانا معین الدین

ہمہ عمرش ہمہ آزادا ز نمود و زعم عمامہ — شرف بخش فضیلت شاہ مولانا معین الدین
یکایک چشم بربستہ زاعظم گڈھ کہ جانش بود — چرا این جور[1] عجلت شاہ مولانا معین الدین
تو نی تسکین قلب ما تو ئی تزئین بزم ما — بیا دیگر براُفت شاہ مولانا معین الدین
بہ بین گریاں، تپاں، از دردِ ہجرت اشکباری ہا — کجائی جانِ ملت شاہ مولانا معین الدین
بفرما از کجا جوئیم حلّ عقدۂ مشکل — کہ دارد حسن نظمت شاہ مولانا معین الدین
خدا حافظ "بہ شکر و صبر" و امید بہ شیریں — سلام صد تحیت شاہ مولانا معین الدین
ممات "مرد مومن" ہم حیات نو بنو دارد — زہے آغوش رحمت شاہ مولانا معین الدین
بہ احساس جزائے شکر و احسان فاتحہ برخواں — بہ روح پاک حضرت شاہ مولانا معین الدین
سرآہم، دہد سر سال وفات مخلصم نکہت — "ظہیر بحر رحمت" شاہ مولانا معین الدین

۱۹۷۵ = ۱ + ۱۹۷۴ء

تاریخ وفات

از جناب قمر سنبھلی دہلی

وہ معینِ حق آگاہ صاحب نظر — ذات تھی جنکی سب کے لیے محترم
وہ جہانِ صحافت کے بدرِ منیر — فخرِ علم و ہنر آبروئے قلم
پاک طینت، فرشتہ صفت، نیک خو — ہیچ تھے سامنے جنکے جاہ و حشم
صاحبِ علم و دانش، حلیم و ذکی — ان کے اوصاف کیا ہو سکینگے رقم
اپنے احباب سے آہ منہ موڑ کر — یک بیک چلدیے سوئے ملکِ عدم
ہر طرف آج ہے شورِ ماتم بپا — ہے مدیر معارف کا سب کو الم
قلب خوں بن کے آنکھوں سے بہنے لگا — دل پہ ایسی پڑی حیف مضراب غم
مصرعِ سال رحلت قمرؔ نے کہا — "ہائے وہ چلدیے سوئے باغِ ارم"

۱۳۹۴ ھج

[1] جور در فارسی حد مد کارے طور است و ہم بمعنی ظلم اینجا مراد دوم است

مرثیہ شاہ صاحب

از
جناب ساحل صاحب بمبئی

پختہ کار و نکتہ سنج و قدرداں جاتا رہا
قافلے والو! امیر کارواں جاتا رہا

اب معارف کے ورق پر نور برسائیگا کون؟
معتبر فنِ صحافت کا نشاں جاتا رہا

اب حرم کا نغمۂ انسانیت چھیڑیگا کون
دینِ رحمت کے متن کا ترجماں جاتا رہا

جس نے لکھی تھی سلیماں کی حیاتِ جاوداں
مکتبِ شبلی کا وہ رُوحِ رواں جاتا رہا

وہ کریم النفس، فخرِ آدمیت اب کہاں
وہ خلیق و دلنواز و مہرباں جاتا رہا

ہے دعا ساحل کی اس پر رحمتِ باری رہے
اس کے فیضِ علم کا اک سلسلہ جاری رہے

قطعاتِ تاریخ وفات

از جناب حاذق ضیائی سہرامی

روحِ حاذق آج تو بیچین ہے
باغِ رضواں میں ملی تم کو پناہ

"آہ" میں پوشیدہ ہے تاریخِ وفات
عاقل و فاضل معین الدین آہ

۱۳۹۴ھ

دیگر

وہ معین الدین جو تھا اک مدیرِ بیمثال
دے گیا اپنی جدائی کا ہزاروں دل پہ داغ

بزمِ شبلی میں تھی حاذق نور سی جسکی ضیا
تیرہ سو چورانوے میں بجھ گیا وہ بھی چراغ

۱۳۹۴ھ

نذرانۂ عقیدت

از جناب احمد مکرم عارف بنارس

اے آفتاب مغرب! اے ماہتاب فانی　　اُف، رحلتِ معین پر تری مٹ گئی جوانی
دار المصنفین سے رحلت کیا ارم کو　　فردوس میں مکاں ہے، ہیں خلد آشیانی
عالم تھے باعمل وہ، سالک بھی بے بدل تھے　　تاریخ اور ادب میں کوئی نہیں تھا ثانی
دار المصنفین کیا، دار المعلمین کی　　دار المورخیں کی کرتے تھے پاسبانی
آنکھوں سے اشک غائب گم ہو گیا ہے موتی　　خوں رو رہا ہے عالم، زہرا ہوا ہے پانی
سارا زمانہ غمگیں، ساری زمین غمگیں　　احمر شفق افق پر غم سے ہے آسمانی
ہے آئینۂ معارف شستہ نگاری دیکھو　　شاہ معین کی دنیا اور دیں کی کامرانی
لب پہ درود، دل میں تقویٰ کی شان ساری　　چہرہ قمر تھا جس سے روشن تھی شادمانی
ہاتف نے دی صدا اے تاریخ سال رحلت　　عارفؔ معین مکیں ہیں اب خلد آشیانی

۱۳۹۴ ھ

ماتم شاہ صاحب

از جناب یحییٰ حنفی

رُدولی میں کبھی چمکی جو عبدالحق کے چہرے پر　　وہی تھی عارضِ روشن میں اسکے روشنی کل تک
عطا کی تھی جسے معصوم فطرت دست قدرت نے　　معارف کے لیے تھی وقف جسکی آگہی کل تک
ہے برپا شورِ ماتم آج میت دیکھکر اسکی　　وہ جس کی زندگی اخلاص کی تصویر تھی کل تک
جہانِ علم و دانش میں یہ ماتم کا مقام آیا
اٹھی میراث سید بزم شبلی میں جو تھی کل تک

قطعۂ تاریخ

از

جناب رحمتِ الٰہی برقؔ صاحب صدیقی اعظمی

فخرِ ہندوستاں معین الدینؒ		فاضلِ کامل و وسیع نظر
نازشِ دودمانِ عبدالحقؒ		صلحِ کل، نیک خو، بلند اختر
روحِ دار المصنفین شہیر		مردِ عالی وقار و دانشور
تنگ آمد چو از غمِ ہستی		سوئے دار السلام کرد سفر
مرغِ جانش بجنتِ الفردوس		کرد پرواز چوں نسیمِ سحر
جملہ احبابِ شبلی منزل حیف		در فراقش شدند خستہ جگر
خامۂ برقؔ زد رقم تاریخ		از جہاں رفت عالمِ اشہر
۸ ۵۹ ۶۸۰ ۱۴۱ ۵۰۶
۱۳۹۴ھ

نالۂ غم

از جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری

تصنیف کا امامؔ قلم کا وہ شہسوار		صد حیف جانشینِ سلیمانؒ چلا گیا
دانش کدے میں نور تھا اسکے وجود سے		فہم و خرد کا مہرِ درخشاں چلا گیا
وہ دین کا معین وہ ملت کا پاسباں		علم و ادب کا نیرِ تاباں چلا گیا
باغ کے لوگ جھوم رہے ہیں سرور میں		یہ کون سوئے گورِ غریباں چلا گیا

عثمانؔ سب کو چھوڑ کے مغموم و غمزدہ
گلشن سے کون جانِ بہاراں چلا گیا

مطبوعاتِ جدیدہ

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمدؒ مرتبہ جناب مولوی مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۴ مجلد، قیمت ۱۵ روپئے۔

پتے: (۱) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈویژن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) فرنگی محل کتاب گھر، ۹۔ فرنگی محل لکھنؤ (۳) صدق بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔

تقریباً ڈھائی سو سال سے ہندوستان میں ملا نظام الدین، اور ان کے درس نظامیہ کا غلغلہ بلند ہے، ان کی اہمیت وعظمت کی بنا پر علامہ شبلی مرحوم نے ان پر اور درس نظامیہ پر دو بیش قیمت مقالے تحریر فرمائے تھے لیکن ابھی تک ملا صاحب کی ایک مبسوط سوانحعمری کی ضرورت باقی تھی، زیر نظر کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، اس کا زیادہ حصہ چند سال پہلے معارف میں چھپ چکا ہے، اب آخر میں مزید اضافہ کرکے اسے کتابی صورت میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں پہلے ملا نظام الدین کے والد بزرگوار ملا قطب الدین سہالوی کی شہادت اور اس کے بعد انکے پسماندگان کے ترک وطن کرکے لکھنؤ میں آباد ہونے کی روداد اور اسی ضمن میں ان کے خاندان اور تعلیم وغیرہ کا ذکر ہے، پھر ملا نظام الدین کی سیرت وسوانح اور فضل وکمال کی تفصیل کے علاوہ ان کے درس وتدریس، تصنیفات، وفات، مزار، قیام گاہ، درسگاہ، اولاد، اور تلامذہ کے بارہ میں مفصل معلومات فراہم کیے گئے ہیں، ایک باب میں ان کے پیر ومرشد شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کا بھی مؤثر تذکرہ ہے، آخر میں درس نظامی کی خصوصیات اور اس کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے،

لکھنؤ اور فرنگی محل کی وجہ تسمیہ پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے۔

لائق مصنف نے اپنے خاندان کی محفوظ دستاویزوں، قدیم یادداشتوں اور مخطوطات کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے یہ کتاب سلیقہ سے مرتب کی ہے، واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے کہیں کہیں تکرار اور بیجا طوالت ہوگئی ہے، ملا صاحب کے صاحبزادے ملا عبد العلی بحر العلوم کا ذکر تلامذہ اور اولاد دونوں میں کیا گیا ہے بعض جگہ بحث و مناظرہ کا رنگ بھی آگیا ہے، درس نظامی میں علوم شرعیہ کی جانب قلت اعتنا اور معقولات کی جانب شدت اعتنا کی شکایت صرف حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ہی کو نہیں ہے بلکہ یہ تو اس پر ایک عام اعتراض ہے، جیسا کہ خود مصنف نے بھی ص ۲۵۹ پر لکھا ہے، مگر انھوں نے اس کا الزامی جواب ہی دینے پر زیادہ اکتفا کیا ہے، صحاح ستہ کے دورہ کے مفید نہ ہونے سے حدیث کو نظر انداز کرنے کی گنجائش تو نہیں نکلتی، عام انسانی کوششوں کی طرح اگر درس نظامیہ میں بھی کچھ خامیاں ہوں تو ان کی تاویل کی کیا ضرورت؟ ان سے اس کی شہرت اور خوبیاں کم نہیں ہوسکتیں، مصنف نے تفسیر اور حدیث کے سلسلہ میں علمائے فرنگی محل کے جو خدمات گنائے ہیں ان کا ذکر خود سید صاحب کے مقالہ میں بھی موجود ہے، ص ۱۷۰ کے حاشیہ میں لکھا گیا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ "یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ" کے ورد کے جواز کے قائل تھے، مگر ان بزرگوں کی تحریروں کے اقتباسات نہیں دیے گئے ہیں، مصنف کا خود جو خیال بھی ہو لیکن ارباب ظاہر کے نزدیک تو شائبۂ شرک سے بھی پرہیز لازم ہے، ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب محنت و جانفشانی سے لکھی گئی ہے، لائق مصنف ملا صاحب ہی کے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، اسلیے انھوں نے انکی سوانحعمری کا حق ادا کردیا ہے، اور اس کے لیے وہ مشرقی علوم کے قدر دانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، کتاب کے آخر میں اسماء و اعلام کے مفصل اشاریے اور مآخذ کی فہرست اور جابجا شاہی فرامین اور ملا صاحب کے بعض خطوط کی اصل اور بعض کی نقل کے عکس بھی دیے گئے ہیں، اس سے اسکی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

(۱) النفط او البترول والشرق } مرتبہ سید ابو النصر احمد الحسینی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
(۲) فلسفۃ غاندی الاقتصادیۃ } وطباعت عمدہ صفحات (۱) ۸۴ و (۲) ۸۴۔ قیمت

بالترتیب ۱۵ او ۱۰ اشلنگ۔ پتہ: مصنف سے بشارع الازہر رقم ۳۔ دار محمد بک ابی الذہب القاہرہ (مصر)

اس وقت پٹرول اکثر صنعتی ملکوں کی اہم ضرورت بنگیا ہے، پہلی کتاب میں عرب ملکوں کی اس خاص و بیش قیمت پیداوار کے متعلق اس غلط فہمی کی تردید کی گئی ہے کہ مشرقی اور عربی ممالک اسکی قدر وقیمت اور طریقۂ استعمال سے ناواقف تھے، اور اس کے بارہ میں یہ انکشافات مغربی ملکوں نے کیا، اس میں بعض دلائل اور تاریخی حوالوں سے یہ دکھایا گیا ہو کہ عرب ممالک ایندھن، مجرمین کو سزا دینے، لڑائی کے اسلحہ اور دواؤں وغیرہ میں اسکو استعمال کرتے اور اسکے چشموں سے تجارتی اور مادی فائدے حاصل کرتے تھے، اس سلسلہ میں عربی شعر وادب میں پٹرول کے ہم معنی لفظ "نفط" اور اسکے قریب المعنی دوسرے الفاظ بھی تحریر کیے گئے ہیں، مصنف کے خیال میں پانچ صدی قبل مسیح سے یہ لفظ مروج ہے، آخر میں مشرق بعید کے ملکوں، ہندوستان، انڈونیشیا اور چین کے پٹرول سے فائدہ اٹھانے کا ذکر کیا گیا ہو، لائق مصنف نے پٹرول کی طرح بارود کے انکشاف میں بھی مغرب کے بجائے ایک مشرقی ملک چین کی اولیت کو دکھانے کی کوشش کی ہو، گو یہ صحیح ہو کہ اہل مشرق پٹرول کی منفعت اور استعمال سے یک گونہ واقف تھے، تاہم معاشرتی و تمدنی ضرورتوں اور وسائل کی کمی کی بنا پر اسکا استعمال محدود تھا، یورپ نے صنعت و حرفت میں اسکے استعمال کو فروغ دیکر جس قدر ناگزیر بنادیا ہو اور اس کے معدنی چشموں کی دریافت اور ان سے اسکی برآمد کو جتنا آسان کردیا ہے، اس سے انکار مشکل ہے۔

دوسری کتاب، مصریوں کو گاندھی جی کے معاشی اصول سے واقف کرانے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ وہ اصلاً ایک اخلاقی و روحانی شخص تھے، اسلیے انکے دوسرے افکار کی طرح معاشی تصورات میں بھی اخلاقی عنصر نمایاں ہے، اس ضمن میں مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت سے گاندھی جی کے معاشی

نظریے کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے، شروع میں گاندھی جی کے حالات و سوانح اور قومی و سیاسی جد و جہد کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔

نغمۂ شب ۔ از جناب اختر بستوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ۔ پتہ: شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد۔

جناب اختر بستوی ایک نوجوان شاعر ہیں، زیر نظر مجموعہ انکی ایک طویل موثر نظم ہے، اس میں انھوں نے رات کے سناٹے میں اس سے اپنے ہمکلام ہو کر اس کے نغمے سننے کا ذکر کیا ہے، اسکے تین حصوں میں زندگی کے صدمات اور تلخیوں، موت کی بے رحمی اور موجودہ حالات کی داستان، زندگی کے کرب و بیچینی اور سماج کی ناہمواریوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے، بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین یہ نظم اقبال کی "خضر راہ" کی یاد دلاتی ہے، مگر اختر صاحب ابھی نوجوان ہیں، انکو شاعرانہ لطافت و رنگینی، تخیل کی بلندی، سلاست و روانی اور طرز ادا کی دلکشی وغیرہ کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کلام میں مزید پختگی اور نکھار پیدا ہو۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین
نام پبلشر	
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دیگئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

مطبوعات

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر صحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

دینِ رحمت

بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵ ؍ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکت و خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ :- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور تمدد دانانِ دارالمصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ وانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی علمی وادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات تحریکِ جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیام دارالمصنفین سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا ثنی ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپئے

مؤلفہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰   مارچ ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن   عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ

۳۔ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی لکھنؤ

۴۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ⁂ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء وفضلاء کی علمی وادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے علم ادب وزبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُس کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، وفضلاء، وشعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد ومعلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق مارچ ۱۹۷۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مقالات

ہندستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۱۶۵-۱۸۸

شرح السنۃ امام بغوی — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۸۹-۲۰۱

جامع مسجد برہانپور کے کتبات (فتح اسیرگڈھ کا کتبہ) — جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیوا سدن کالج برہانپور — ۲۰۲-۲۱۲

ڈاکٹر سید محمود کا مقدمۂ دیوان غالب نظامی اڈیشن — جناب بشیر علی صدیقی ایم اے علیگ بدایوں — ۲۱۳-۲۱۹

وفیات

جناب مولانا ظفر احمد عثمانیؒ — "ض" — ۲۲۰-۲۲۱

جناب حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم — "ص - ع" — ۲۲۲

تعزیتی خطوط — ۲۲۳-۲۳۶

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۲۳۷-۲۴۰

تصحیح

معارف ماہ فروری ۷۵ء کے مضمون ہندستان کی مذہبی رواداری میں ص ۹۰ سطر ۱۹ میں لفظ "شودر" غلط چھپ گیا ہے، صحیح سوار ہے۔

"ص، ع"

شذرات

دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں لکھنؤ کے رہنے والے ایک مسلمان سرکاری عہدیدار ٹھہرے تو انھوں نے اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ اُن کا لڑکا اچھی غزل کہتا ہے مگر اس کو ہندی رسم الخط میں قلمبند کرتا ہے کیونکہ وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا :- ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک مشہور درسگاہ کے ایک استاد نے بتایا کہ وہاں کے کافی طلبہ درود شریف اور تشہد کو ہندی میں لکھ کر یاد کرتے ہیں۔ یو۔ پی کے بہت سے والدین کی زبانی سننے میں آتا ہے کہ اُنکی لڑکیاں بھی ہندی ہی میں خط و کتابت کرنے لگی ہیں، یو۔ پی ہی کے ایک وکیل صاحب کہنے لگے کہ اُردو میں لکھا ہوا کوئی خط گاؤں پہنچ جاتا ہے تو مکتوب الیہ اس کو رکھے رہتا ہے کہ کوئی اردو داں کہیں ملے تو اُس سے پڑھایا جائے،

اگر کوئی قوم یا فرقہ یا نسل اپنی مادری زبان کھو بیٹھتی ہے تو وہ جیتے جی ہلاک ہو جاتی ہے، اُردو بولنے والے طلبہ کے لئے اپنی مادری زبان نہ پڑھنا، اور اُس کے پڑھانے کی سہولتیں فراہم نہ کرنا نسل کشی ہے، طلبہ اردو اسلئے نہیں پڑھتے کہ سرکاری ملازمتوں میں یہ کام نہیں آتی، اگر زندگی کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہو تو مادری زبان چھوڑی جاسکتی ہے، پھر کسی پیٹ کی خاطر دین بھی چھوڑنے میں تامل نہ ہوگا جس کے بعد تہذیبی، تمدنی اور مذہبی روایات کا وارث بن کر زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا، " اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی "

یو۔ پی میں عام شکایت یہ ہے کہ درسگاہوں میں اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام نہیں، اسی لئے طلبہ اردو پڑھ نہیں پاتے، سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اس ریاست میں اردو پر جو آفت آئی اس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں، گذشتہ مہر برسوں میں اس کو نیم جاں کر دیا گیا، اور جب یہ جاں بلب ہونے لگی تو اس کی تعلیم کی سہولتوں کا اعلان کیا گیا، مگر اردو کی زبان پر اس رحمت کے پیام پر یہ فریاد ہے،

آئی تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن … ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ باز پسیں ہے

مرکزی حکومت اور اتر پردیش کے موجودہ فراخدل اور اردو نواز وزیر اعلیٰ تو اردو کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں مگر حکومت اور عہدیداراخصوصاً دفتری ملازمین اپنے دلوں کو ٹٹول کر خود فیصلہ کریں کہ وہ ان اعلان کی خانہ پری اردو والوں کا محض منہ بند کرنے یا واقعی اس زبان کو اپنے سنگھاسن پر بٹھانے کی خاطر کرتے ہیں کچھ دن پہلے ملک کے ایک مشہور رہنما جو حکومت ہند کا اعلیٰ ترین عہدہ پانے کی بھی تمنا رکھتے ہیں دارالمصنفین تشریف لائے یہاں کے علمی کاموں کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سارا کام اردو کے بجائے ہندی میں ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا کیونکہ آیندہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد ہی کتنی رہ جائیگی اس سے ہندی کے حامیوں کے اندرونی جذبات اور اصلی خواہشات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ع : تقدیر کو تدبیر کے شاطر نے کیا مات،

اگر کوئی لسانی اقلیت اپنی زبان کو محفوظ رکھنے کا عزم بالجزم نہیں رکھتی تو حکومت کی چوکھٹ کی دریوزہ گری سے زندہ نہیں رکھی جا سکتی ہے وہ گل نغمہ یا پردہ ساز اپنے بل بوتے ہی پر بن سکتی ہے، ورنہ اس کو اپنی شکست کی آواز ہی کر رہنا پڑیگا ہر ملک کی اکثریت اقلیت سے اپنی ہر چیز کو تسلیم کرانے کے حق کو استعمال کرنے میں گریز نہیں کرتی یہ اس کا فطری تقاضا ہوتا ہے اس کیلئے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر جارحانہ رنگ بھی اختیار کرتی رہتی ہے مگر اقلیت کا بھی یہ فطری حق ہو کہ وہ اپنی ہر چیز کو برقرار رکھنے کے لئے پوری مدافعت کرے جو مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے اس جارحیت اور مدافعت کے ٹکراؤ میں اگر مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے تو جارحیت غالب آجاتی ہے اور اگر مدافعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے تو جارحیت کو مدافعت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے جھکنے اور جھکانے کا کھیل ہر زمانے میں رہا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو ہندی کے سامنے جھک کر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے یا اپنی فطری قوت نمو سے باقی رہتی ہے اس کے حامیوں کو حکومت پر نکتہ چینی اور الزام تراشی کرنیکے بجائے اپنی کوتاہ اندیشی، سہل پسندی، حیلہ جوئی، اور بے عملی کا بھی جائزہ لینا ہے شکست خوردگی اور گریز پائی کی ریت کے اندر سر چھپا کر آندھی کے گزر جانے کا انتظار کرنا زندگی کی حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے منہ موڑنا ہے، زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے، ع : اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی،

مگر خود اردو اپنے سے زیادہ مایوس نہیں ہے ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک ہندوستان میں اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ہندی کے علاوہ کسی اور علاقائی زبان میں شاید ہی ہوئی ہوں، مہاراشٹر، بہار، آندھرا اور

کہ ملک میں اردو بولنے والے طلبہ اسی زبان میں ثانوی تعلیم پا رہے ہیں تیج، ملاپ، پرتاب اور شیر پنجاب وغیرہ جیسے اخبارات کی اشاعت سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ ابھی تک غیر مسلموں میں بھی مقبول ہے، پاکستان میں اردو اخبارات کی تعداد و اشاعت وہاں کے انگریزی اخباروں سے زیادہ ہے، اب تو لندن سے بھی ایک اردو اخبار شائع ہونے لگا ہے، دنیا کے تمام اہم ملکوں کے ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو کے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے بھی کھولے گئے ہیں، بیرونی ممالک میں اس کی قدر و منزلت اترپردیش کے ان اردو بولنے والوں کے لئے باعث عبرت و غیرت ہے جو غزل کو اردو رسم الخط میں نہیں لکھ پاتے، دکھ اس کا بھی ہے کہ غزل اب گگل ہو رہی ہے، اس کا عاشق آسک اور معشوق ماسوک ہو رہا ہے، عاشق کا سوز دل سوج دل، اور معشوق کا ظلم جولم اور اس کی زلف جلیبہ بنتی جا رہی ہے، یہ انقلاب انیس، دبیر، ناسخ، آتش، نسیم، سرشار، چکبست اور شبلی کی سرزمین میں آرہا ہے ع :- محل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی لیلا بھی گئی

گزشتہ مہینہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا انتقال حرکت قلب بند ہوجانے سے مظفر پور میں ہوگیا، جہاں وہ ممتحن بنکر گئے ہوئے تھے، اُن کی میت الہ آباد لائی گئی، اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا تھا، اہم اور مفید کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مختصر تاریخ ادب اردو اور نئے ادبی رجحانات وغیرہ زیادہ مقبول ہوئیں، اپنے شاگردوں میں بہت مقبول رہے، اُن کی وفات سے اردو ادب ایک بہت ہی لائق مصنف اور خدمت گذار سے محروم ہوگیا، ان سے کچھ ہی روز پہلے ڈاکٹر مسیح الزماں ریڈر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی بھی وفات اچانک ہوگئی، اردو کی مرثیہ نگاری اُن کا خاص موضوع تھا، اُن کی عمر وفا کرتی تو اس صنف میں ان کا ادبی کارنامہ بڑا قابل قدر ہوتا، وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے داماد تھے، جن کے لئے اس کبرسنی میں یہ سانحہ بڑا ہی جانکاہ ہوگا،

دعا ہو کہ خدا اُردو ادب کے ان دونوں خدمت گذاروں کو غریق رحمت کرے۔ آمین ثم آمین،

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

لڑائی کے موقع پر اسلام کی تعلیمات سندھ میں حجاج اور محمد بن قاسم کی فوجی اور انتظامی رواداری ایک مثالی رواداری تھی، جنگ کے موقع پر بھی اسلام کی یہی روادارانہ تعلیمات رہی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مہم پر فوج بھیجتے تو سردار فوج کو حکم دیتے کہ کسی بوڑھے کو بچہ کو کمسن کو اور عورت کو قتل نہ کیا جائے، آپ کا یہ بھی حکم تھا کہ میدان جنگ میں کسی کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیران بدر کو آپ نے جب صحابہ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، غزوۂ حنین میں چھ ہزار قیدی تھے، سب چھوڑ دیے گئے آپ نے ان کے پہننے کیلئے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے عنایت فرمائے، حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی عزت سے اس کو مسجد کے ایک گوشے میں ٹھہرایا، اور چند روز کے بعد سفر کا ساز و سامان کر کے ایک شخص کے ہمراہ یمن بھجوا دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے، غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، رسول اللہ صلعم کو خبر ہوئی، آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا، ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۴۰ - ۴۴۳ - ۴۴۴)

حضرت ابوبکرؓ جب شام روانہ ہو رہے تھے تو رخصت کرتے وقت یزید سے فرمایا کہ تم ایسی قوم کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا وغیرہ وغیرہ (تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۶۵ بحوالہ خلفائے راشدین دار المصنفین ص ۵۰)

ہندوستان کے مسلمان فاتحین کی تلوار اسلام پر ایک تبصرہ

اگر ان تعلیمات پر ہندوستان کے مسلمان فاتحین پورے طور پر عمل کرتے تو اسلام کی طرح ان کی فاتحانہ تلوار بھی پیام امن بن جاتی لیکن اگر انھوں نے ان پر عمل نہیں کیا تو وہ مورد الزام قرار دیے جا سکتے ہیں، اسلام یا اسلامی تعلیمات سے ان کی کسی بربریت کو منسلک نہیں کیا جا سکتا، مثلاً اگر کوئی مسلمان رہزن یا چور ہو جائے تو اس کی رہزنی اور چوری کا الزام اسلام پر نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام میں رہزن اور چور گھس آئے، اسی طرح مسلمان فاتحوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف جہاں کہیں ظالم اور سفاک بنکر لشکر کشی کی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلامی لشکر میں ظالم اور سفاک فوجی سردار گھس آئے تھے لیکن یہ کہنا بھی سراسر تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ وہ ان تعلیمات کو بالکل ہی نظر انداز کر کے جنگ و جدل کرتے رہے، وہ محمد بن قاسم کا مثالی نمونہ تو پیش نہ کر سکے لیکن ان کی تلواریں ان کے اور معاصر فاتحین کے برخلاف فتح و تسخیر کے بعد ان کے نیام میں رہیں، حکومت کے نظم و نسق کو قائم رکھنے میں تو یہ تلواریں ان کے نیام سے باہر ضرور نکلتی رہیں لیکن اشاعت اسلام کے سلسلہ میں یہ استعمال نہیں ہوئیں، اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی حکومت اور قوت کا مرکز آگرہ، دہلی، اودھ، بہار اور دکن رہا، مگر یہاں آج بھی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے، اور جہاں ان کا اقتدار حکومت زیادہ مضبوط نہ تھا، جیسے بنگال، کشمیر اور سندھ جیسے دور دراز علاقوں میں

ن کی قبا اداریا دیا تھا تو پلی گئی۔ اس حقیقت کا اعتراف انصاف پسند ہندو مورخین بھی کرتے ہیں مثلاً کے۔ ام پنیکر ہندوستان کے بڑے ودوان مورخ گذرے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

فتح و تسخیر کے زمانے میں تو ہندوؤں کی صعوبتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، وہ یکایک بڑے علاقے سے اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیے گئے۔ ان کے مذہب کو بھی تحقیر سے دیکھا گیا اور انکی عبادت گاہیں بھی برباد کی گئیں لیکن جونہی فتح و کامرانی کا جوش ختم ہوتا، ملک کی اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آیا تو بڑے سے بڑے پرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ کاشتکار نہیں لائے تھے، دہلی پر فوج کے ذریعہ قبضہ ہی ہوا تھا، اور فوج ہی نے گنگا کی وادی کے راجاؤں کو شکست دی تھی، مسلمان سلاطین کیلئے لشکریوں کے ذریعہ زمین کی کاشت کرانا ممکن نہ تھا، زمین امراء میں جاگیر کے طور پر ضرور تقسیم کر دی گئی تھی لیکن کاشتکار ہندو ہی رہے، اسکی کبھی فکر نہیں کی گئی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا لیا جائے۔ اور نہ اشاعتِ اسلام کی کبھی کوشش کی گئی، کیونکہ دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی لیکن یہاں اب بھی ہندوؤں ہی کی غیر معمولی اکثریت ہے، نظام اراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لیے گاؤں میں ہندوؤں کی زندگی ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلے تھی۔ (اے سروے آف انڈیا ص ۱۳۲)

ہندوستان سے عرب انشاء پردازوں، مورخوں اور سیاحوں کی محبت

محمد بن قاسم ہی کی طرح عرب انشاء پردازوں، مورخوں جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کا دل ہندوستان کی طرف سے نرمی، محبت اور ہمدردی سے بھرا رہا، کیونکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں ہندوستان کے فضائل اور یہاں کے باشندوں کے کمالات کا ذکر تو بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کو اس ملک جو چیز پسند آجاتی اس کی تعریف دل کھول کر کرتے، مثلاً عربی زبان کے مشہور ادیب جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ)

لکھتا ہے کہ ہندوستان [illegible] کا مرتبہ ہے [illegible] سلیمان تاجر
رقمطراز ہے کہ اہل ہند لہو و لعب کو معیوب سمجھتے ہیں، اور آلات لہو کا استعمال نہیں کرتے (سلسلۃ
التواریخ ص ۵۲)، یعقوبی (المتوفی ۲۹۵ھ) نے لکھا ہے کہ ہندوستانی صاحب حکمت و بصیرت
ہیں، ہر قسم کی حکمت میں سب لوگوں سے فائق اور برتر ہیں، جوتش اور نجوم میں ان کے اقوال
سب سے زیادہ صحیح اور درست ہوتے ہیں (تاریخ یعقوبی جلد اول ص ۱۰۵)، احمد بن عمر بن رستہ
تو ہندوستان کے گندمی رنگ اور یہاں کے دل فریب حسن و جمال کا فریفتہ رہا، وہ تو اپنے
زمانے کے ہندو راجہ کے عدل و انصاف کا بھی بیحد معترف تھا، لکھتا ہے کہ تاجروں کے ساتھ
راجہ کا بہت ہی عمدہ برتاؤ رہتا (الاعلاق النفیسہ ص ۱۳۵)، اس نے ہندو مذہب کا بھی مطالعہ
کیا اور ملتان کے ایک بت کی بہت ہی عمدہ تصویر کھینچی ہے اور اس کی پرستش کی بڑی اچھی مرقع آرائی
کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ لوگ ان بتوں کے حضور میں جاتے ہیں تو گھٹنوں کے بل جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر
عرض کرتے ہیں کہ ہماری طرف نظر کرم ہو، ہم پر رحم کیجیے، روتے ہیں اور انتہائی عاجزی سے دعا کرتے
ہیں (ایضاً ص ۱۳۶)، مسعودی لکھتا ہے کہ حضرت آدمؑ اپنی ستر پوشی کے لیے جنت سے پتیاں
لائے، اور جب وہ خشک ہو گئیں تو ہواؤں نے ان کو اڑا کر پورے ہندوستان میں پھیلا دیا،
اسی لیے ہندوستان میں خوشبو اور عطر مثلاً عود، لونگ اور مشک وغیرہ زیادہ پائے جاتے ہیں
(مروج الذہب ج ۱ ص ۶۱-۶۰)، مقدسی نے تو ہندوستان کے بہت مذہبی فرقوں مثلاً بہافریدیہ،
دانانیہ، دادینہ، رشتیہ، مصفدہ، جہاکلیہ، جلنکنیہ وغیرہ کے عقائد و مراسم کا ذکر تفصیل سے
کیا ہے، وہ بعض برہمنوں کو موحد قرار دیتا ہے، بہوذیہ کے متعلق لکھتا ہے، اس کے پیغمبر بہافرید
نے اللہ کی پرستش کے لیے اس کا بت بنا کر اس کی پوجا کرنے کی تعلیم دی ہے، تاکہ یہ بت عبادت الٰہی
میں ان کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بن سکیں (البدء والتاریخ جلد چہارم ص [illegible])

رامانیہ اور رواتیہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ توحید کی طرح رسالت کو بھی مانتے ہیں (ایضاً)
رشتیہ کے ذکر میں کہتا ہے کہ یہ لوگ طویل مراقبہ اور دھیان کر کے اپنے ظاہری حواس کو بے کار
کر دیتے ہیں، تاکہ وہ دنیاوی آلودگیوں سے الگ رہیں، اور ان پر ملائکہ کے انوار والطاف
اور تجلیات کا فیضان ہو (ایضاً) اصطخری کو بھی ملتان کی مورتیوں سے بڑی دلچسپی رہی، انکے
متعلق اپنی کتاب مسالک الممالک میں بڑی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

عربوں کے اچھے اثرات | جنوبی ہند میں عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ہی آنے لگے
تھے اور انھوں نے جنوبی ہند کے ساحلوں خصوصاً ملیبار میں اپنے اخلاق کی بلندی اور میل جول
کی رواداری سے ان کے علاقوں کے لوگوں پر اپنے خوشگوار اثرات پیدا کیے کہ ہندو راجاؤں کی
نظروں میں بھی کافی عزت، توقیر اور حیثیت حاصل کر لی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنی
مذہبی تبلیغ کرتے تو ان کی تبلیغی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کیجاتی، علاءالدین خلجی
کی فوج پہنچنے سے پہلے تامل اور جنوبی ساحل کے علاقوں میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہوگئی تھی،
ان کی تجارتی منڈیاں قائم تھیں، ان کا میل جول وہاں کے باشندوں سے بڑھتا جا رہا تھا چنانچہ
ہندوؤں اور عربوں سے مل کر کئی مخلوط نسلیں مثلاً راوتن اور لبی پیدا ہوئیں، دسویں صدی
میں عرب مشرقی ساحل پر پہنچے، پہنچنے کے بعد ہی اپنی رواداری اور اخلاق سے پورے ساحل پر
چھا گئے، قلیل مدت میں سیاست اور معاشرت میں اہم حیثیت پیدا کر لی، ایک طرف تو وزراء،
امیر البحر، سفراء کے عہدوں پر مامور ہوئے، دوسری طرف وہاں کے لوگوں کو مشرف باسلام
بھی کرتے رہے، اپنے مذہب کی تبلیغ کی، مسجدیں بنوائیں، مقبرے تعمیر کیے، جو ان کے مبلغوں
اور صوفیوں کے لیے تبلیغی مرکز بن گئے، اور بقول ڈاکٹر تاراچند ساتویں صدی کے بعد سے
جنوبی ہند میں ہندو مت میں جو کچھ نئے انقلابات آئے ہیں تو یہ اسلام ہی کے اثرات کے

ساتھ ہی (آثار) آت اسلام (ص ۵۸) کاٹھیاواڑ، گجرات اور کوکن میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی، ہر جگہ ان کی ایک ایک مسجد تھی، ہندو راجہ ان مسلمانوں سے فراخدلی اور لطف کے ساتھ پیش آتے، سلیمان، مسعودی، ابن حوقل اور ابو زید گجرات کے دیسی راجہ بلہرا کی مسلمان دوستی کی تعریف کرتے ہیں، سلیمان لکھتا ہے کہ گجرات کے بادشاہوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں بعض بادشاہ پچاس سال تک حکومت کرتے ہیں، ان کے اہل ملک سمجھتے ہیں کہ ان کے بادشاہوں کے عہد حکومت اور انکی عمروں کے طویل ہونے کا سبب عربوں سے محبت ہے، کوئی راجہ اور اسکی رعایا بلہرا اور اس کی رعایا سے زیادہ عربوں سے محبت نہیں کرتی (سلسلۃ التواریخ از سلیمان تاجر) مسعودی کا سنہ ۹۱۶ء میں ہندوستان آیا تو وہ لکھتا ہے کہ سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی کی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے، اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنجگانہ کی مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں جو آباد ہیں، یہاں کے راجہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک راج کرتے ہیں، اس سلطنت کے باشندوں کا خیال ہے کہ ان کی عمریں عدل وانصاف اور مسلمانوں کی عزت وتوقیر کرنے کی وجہ سے لمبی ہوتی ہیں، اس راجہ کے یہاں فوجوں کو شاہی خزانہ سے مسلمانوں کے بیت المال کی طرح تنخواہیں ملتی ہیں (مروج الذہب ج ۱ ص ۳۸۳) مسعودی آگے چل کر لکھتا ہے "میں ۳۰۴ھ میں ہندوستان کے شہر صیمور میں جو راجہ ولبھ رائے کی مملکت لار کا علاقہ ہے، موجود تھا، اس میں جو راجہ تھا اس کا نام جانج تھا، اس وقت تقریباً دس ہزار مسلمان وہاں آباد تھے، جو اصل میں بیاسرہ، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے لیکن ان علاقوں میں بود وباش اختیار کر لی ہے، ان میں سے بہت سے معزز اور بڑے تاجر ہیں، جیسے موسیٰ بن اسحاق صندا پوری اور ہزمنہ [illegible] کے عہدہ پر ان دنوں ابوسعید

روف ہوگیا جو بیہز تھا، بیزر بیہ سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے۔ اسکی شکل یہ تھی کہ راجہ کا فرمان
تھا کہ وہ کسی مسلمان ہی کو جس کو ان کا سردار بناتا تھا، اور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد
ہوتے تھے، پہلی صورت وہ مسلمان ہوا جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، اس نام سے دو شہر ہیں
ن کا واحد بیسر ہے (ایضاً جلد دوم ص ۵۰)۔ استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے
کہ بیسر غالباً گجراتی لفظ ہے، جس کی اصل بے سرا ہے، جس کے معنی دو سر والا ہے، یعنی وہ شخص جو عربی
ور ہندی کا مخلوط نسل سے پیدا ہوا (عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۵۱)

اصطخری (۹۵۱ء) لکھتا ہے کہ کھنبایت سے راجہ بلہرا کے شہر جیمور تک سب ہندوؤں کے شہر
ہیں مگر ان میں کچھ مسلمانوں کی بھی آبادی ہے اور راجہ بلہرا کی طرف سے کوئی مسلمان ہی انکے معاملات
کا نگراں ہوتا ہے، ان شہروں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں بھی ہیں جن میں نماز جمعہ ادا کیجاتی ہے،
(مسالک الممالک ص ۱۰۳)۔ ادریسی گیارہویں صدی میں لکھتا ہے کہ نہرواڑہ میں کثرت سے مسلمان تاجر
آتے رہتے ہیں، حکومت کی طرف سے مسافروں کا بڑا اعزاز و اکرام ہوتا ہے، ان کے مال و متاع
کی حفاظت کیجاتی ہے، (نزہۃ المشتاق جزو ۸)۔ اور یہ معلوم کرکے شاید تعجب ہوگا کہ سومناتھ کے
راجہ کے یہاں مسلمان عہدہ دار بھی تھے (انفلوئنس آف اسلام آن انڈیا ص ۴۶)۔ جنوبی ہند
میں جو قوم موپلا کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل عراق سے اس علاقہ میں آئے اور یہاں آباد ہوگئے،
وہ گرم مسالے، ہاتھی دانت اور جواہرات کے تاجر بن کر آئے۔ ان میں اور ہندو راجاؤں میں
آشتی پیدا ہوگئی تھی، ہندو راجہ اپنے علاقہ میں تجارت کا بازار گرم رکھنے اور ترقی دینے کے خیال
سے ان مسلمان تاجروں کو اپنی حفاظت اور سرپرستی میں لے لیا اور ان کی وجہ سے اس علاقہ
میں تجارتی فروغ ہوا، خوشحالی بھی پیدا ہوئی، اسی لیے جب انھوں نے دعوتِ اسلام کے لیے
سرگرمی دکھائی تو انکی مزاحمت نہیں کی گئی (دعوتِ اسلام آر، ٹی، ڈبلو آرنلڈ اردو ترجمہ باب نہم)

محمود غزنوی میں رواداری بھی تھی | [illegible]

سے پوچھتے ہیں لیکن ایسے واقعات کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن سے ان کی صاف دیانت کا درس مل سکتا ہے، محمود غزنوی نے سومنات کو جس طرح برباد کیا، اس کی کہانی تو بہت دہرائی جاتی ہے لیکن اس کے حالات زندگی میں یہ بھی ہے کہ جب اس نے متھرا کا مندر دیکھا تو اس کی شوکت و حشمت دیکھ کر ششدر رہ گیا، اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عمارت بنانا چاہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کر کے بھی نہیں بنا سکتا ہے، اور شاید دو سو برس میں بھی ایسی عمارت نہ بن سکے (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۴۴)۔ یہاں وہ نہ بت شکن بنا نہ بت فروش بلکہ اس مندر کے حسن و شوکت سے متاثر رہا، اس کی کوئی مثال نہیں کہ اس نے امن کی حالت میں کسی مندر کو منہدم کیا یا اس نے کسی ہندو کو ترک مذہب کرنے پر مجبور کیا، بلکہ غزنہ میں تو اس نے ہندوؤں کی بود و باش کے لیے ایک محلہ بھی آباد کر دیا تھا (رسالہ الفرقان معری بحوالہ دی لائف اینڈ ٹائمس آف سلطان محمود غزنہ از محمد ناظم ص ۱۶۳) جوامع الحکایات ولوامع الروایات میں ہے کہ امیر نصر جو خراسان کا امیر تھا، اور محمود کا چہیتا بھائی تھا، ایک بار وہ سلطان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا، اس کے زین خانے سے ایک جڑاؤ لگام چوری گئی، چوری پکڑی گئی تو چور ایک ادنیٰ درجہ کا ملازم تھا جو ہندو تھا، امیر نے حکم دیا کہ اس کو باندھ کر بیس کوڑے لگائے جائیں، سلطان کو یہ معلوم ہوا تو اس کو بہت دکھ ہوا، اس نے امیر نصر کو کہلا بھیجا کہ ہماری موجودگی میں ہمارے غلاموں کو تازیانے سے پٹواتے ہو اور ہماری ناراضگی کی پروا نہیں کرتے، اس کے بعد ایک ماہ تک اس کو اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہیں دی (اردو ترجمہ از اختر شیرانی ص ۸۶-۸۷)، کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی تحقیق ہے کہ محمود کے سکوں پر سنسکرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اس کے سکوں پر ایک طرف تو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور دوسری طرف سنسکرت میں

اس کا ترجمہ اوتاری اکثر ایم محمد اوتار ہے، یہ صحیح ترجمہ تو نہیں، اس لیے کہ مسلمان محمدؐ کو اوتار نہیں مانتے، وہ آپ کو انسان ہی سمجھتے ہیں، پروفیسر سنتی کمار چٹرجی اس سلسلہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کا اپنے سکوں پر سنسکرت لکھوانا اس کی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت ہے، جب پنجاب اسکی سلطنت کا جزو ہو گیا تو اس نے یہاں کی ہندو آبادی کو اپنی طرف اس طرح مائل کرنا چاہا، یہ اس کی عالی دماغی اور فراخدلی کی دلیل تھی (البیرونی یادگار جلد ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۸۰)، سلطان محمود کا ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کرنا کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیونکہ نہ صرف اس کے غزنہ اور پنجاب کے علاقے میں ہندو آباد تھے بلکہ اس کی فوج میں ہندو سردار اور لشکری بھی تھے، وہ طخرستان سے بڑھ کر بلخ۔ ایلک خاں سے برسرپیکار ہونے کے لیے گیا تو اس کے لشکر میں ترکوں، خلجیوں اور غزنویوں کے ساتھ ہندو لشکری بھی تھے، (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۳۲)

موجودہ دور کے بعض وسیع النظر اور فراخ دل ہندو مورخوں نے ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کی رواداری کا اعتراف اچھی طرح کیا ہے، مثلاً ایشور ٹوپا نے لکھا ہے کہ موجودہ دور کے ایک مورخ کا خیال ہے، جو محمود غزنوی کا ناقد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغ اسلام نہیں تھا، غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا، الفنسٹن نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصۂ دراز تک رہا، لاہور میں بھی اس کا قیام رہا، لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر ہی نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی، اس نے

لڑائی یا محاصرے کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا گیا لیکن کبھی اور موقع پر انکے ہندو ہونے کی وجہ سے ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقرر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلہ میں کیا جاتا بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کیے جاتے۔ ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا جس طرح فوج میں عرب، افغان، دیلمی، خراسانی اور غوری ہوتے، وہ بھی ہوتے، ہندو لشکری اپنے آقا کی خاطر کرمان، خوارزم اور مرو میں جاکر لڑے، غزنویوں کی فوجی مہموں کی تاریخ میں ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سوندی رائے اور بیج رائے کے نام نمایاں ہیں، غزنویوں کی حکومت میں ان ہندو فوجی سرداروں کو اعلیٰ حیثیت حاصل رہی، وہ بڑے قابلِ اعتماد سردار سمجھے جاتے، غزنویوں کے ساتھ انکی وفاداری اور خدمت گذاری مثال کے طور پر پیش کیجاتی (پالٹکس ان پری موغل ٹائمس از ڈاکٹر ایشور ٹوپا ص ۴۶ - ۴۵)

سلطان محمود کی وفات کے پندرہ روز کے بعد ہی اسکے بیٹے سلطان مسعود نے ایک ہندو فوجی سردار سیوند رائے کو ہندو سواروں کی معیت میں اُن امراء کے خلاف بھیجا جو اسکے بھائی کے حامی تھے، پانچ سال کے بعد مسعود ہی کے حکم سے تلک نے ہندو سپاہیوں کے ساتھ نیالتگین کے خلاف لشکر کشی کی اور اس کو شکست دیکر ہلاک کر دیا، اس کے پانچ سال کے بعد سلطان مسعود سلجوقی ترکوں سے مغلوب ہو کر غزنی سے ہندوستان چلا آیا تو اس نے یہاں ایک بڑی فوج اکھٹا کی جس میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی (تاریخ سبکتگین بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۶۰)

بیہقی نے اپنی تاریخ میں غزنوی دور کے ہندو فوجی سردار تلک کا ذکر جس طرح کیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندو اس دورِ حکومت میں تحقیر کے بجائے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

تلک ایک حجام کا لڑکا تھا، بصورت شکل اچھی پائی تھی، زبان بھی اچھی بولتا تھا،

ہندی اور فارسی دونوں خطابت ہی اچھا لکھتا تھا، کچھ دنوں کشمیر میں رہا، جہاں اس نے عشق بازی اور جادوگری وغیرہ کے فن میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی، وہاں سے قاضی شیراز ابوالحسن کے یہاں آیا۔ جو اس پر فریفتہ ہوگیا، قاضی نے اس کی نقل وحرکت پر پابندی عائد کردی تو اس نے اس کی شکایت خواجہ احمد حسن سے کی، خواجہ اور قاضی میں تعلقات اچھے نہ تھے، خواجہ نے تین آدمیوں کی معرفت شاہی فرمان بھیجکر تلک کو اپنے پاس طلب کیا۔ قاضی کی ناخوشگواری کے باوجود تلک دربار میں پیش کیا گیا، خواجۂ احمد حسن نے تلک کی شکایت سنی، پھر اس نے امیر محمود کی توجہ بڑی خوش سلیقگی سے اس معاملہ کی طرف دلائی، امیر مسعود نے خواجہ کو تلک کی شکایت سماعت کرنے کیلئے کہا جسکے بعد قاضی پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا، اسکے بعد تلک خواجہ کا بڑا معتمد علیہ ہوگیا، وہ دبیر بنایا گیا ہندوؤں سے جو بات ہوتی اسکا ترجمان ہوگیا، اس طرح اس نے وزیر کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کرلیا، وہ خواجہ کے حضور میں برابر رہتا، اس کے پیغامات کو پہنچاتا اور مشکل معاملات کو حل کرتا۔

امیر مسعود کو جب خبر ملی کہ احمد نیالتگین نے لاہور میں باغیانہ روش اختیار کر رکھی ہے تو اس نے اپنے سپہ سالار اور فوجی سرداروں کو بلا کر ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ان سے مشورے طلب کیے، سپہ سالار نے اس بغاوت کو لاہور جاکر فرد کرنے کیلئے اپنی خدمت پیش کی، مگر امیر مسعود نے اس کو وہاں جانے سے یہ کہہ کر روکا کہ ابھی تو خراسان، ختلان، طخارستان کی بغاوتوں کو بھی فرو کرنا ہے، سندھ میں کسی اور فوجی سردار کو جانا چاہیے، تلک بھی اس مجلس میں موجود تھا، وہ بول اٹھا کہ میرے شاہی آقا کی عمر دراز ہو، اگر حکم ہو تو یہ خدمت اس سے لیجائے تاکہ وہ ان عنایات واحسانات کا بدلہ ادا کرسکے جنسے وہ ابتک سرفراز کیا جا چکا ہے، وہ ہندوستان کا باشندہ ہے، وہاں کا موسم گرم ہے، وہ آسانی سے وہاں کا سفر کرسکتا ہے، اگر وہ اس مہم کے لائق قرار دیا گیا تو وہ اپنا پورا فرض انجام دیگا، اسکی بات سنکر امیر

خوش ہوا اور جو لوگ وہاں موجود تھے ان سب کی رائے معلوم کی، انھوں نے کہا کہ وہ ایک مشہور آدمی ہے، اس غرض کو انجام دینے کے لیے بالکل موزوں ہے، اس کے پاس خزانہ ہے، ساز و سامان ہے، آدمی بھی ہیں، اور شاہی عنایات بھی حاصل ہیں، یہ کام تکمیل کو پہنچا سکتا ہے، امیر نے اپنے مشیروں کو جانے کے لیے کہا تاکہ اس معاملہ پر وہ خود غور کر سکے، وہ مجلس سے چلے گئے،

امیر نے اپنے مخصوص مشیروں سے کہا کہ میرے حکام نے اس معاملہ میں زیادہ دلچسپی نہیں لی، اور نہ انھوں نے خاطر خواہ وفاداری کا اظہار کیا، اس لیے تلک محجوب ہوا اور آگے بڑھکر اپنی خدمت پیش کی، اس کے بعد امیر نے تلک کے پاس ایک ایرانی دبیر پوشیدہ طور پر عنایات سے بھرے پیام کے ساتھ بھیجا کہ میں تمھاری ان باتوں کی قدر کرتا ہوں جو تم نے کہیں یا جو وعدہ کیا ہے لیکن میرے ارد گرد کے لوگوں نے اس کو پسند نہیں کیا، تم نے ان سب کو شرمندہ کیا، مگر تمھاری باتوں کو سچ ثابت کیا جائے گا، کل تم اس خدمت کیلئے نامزد کیے جاؤ گے، میں تمھارے لیے ہر ممکن بات کرونگا، میں تم کو کثیر سرمایہ دوں گا، ایک مضبوط فوج اور تمام ضروری سامان ساتھ کرونگا، تاکہ تمھارے ہی ذریعہ یہ کام انجام پائے اور یہ بغاوت کسی دوسرے کے احسان کے بغیر فرو ہو جائے، تم اعلیٰ تر عہدہ پر فائز کیے جاؤ گے، یہ لوگ تو پسند نہیں کرتے کہ میں کسی آدمی کو ترقی دوں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مرضی کے مطابق چلوں، گو وہ خود کچھ نہ کریں، تمھاری ترقی پر وہ رنجیدہ ہیں، اب تم اس کام کو انجام دینے کے لیے پورا عزم کر لو، انکی طرف سے قصور تو ہو چکا جیسا کہ ان کے قول و فعل سے ظاہر ہے، جو ہوا سو ہوا، تلک نے زمین بوسی کر کے کہا کہ اگر یہ کام اس غلام کے بس سے باہر ہوتا تو اسکی زبان سے ایسی جرأت مندانہ باتیں اس مجلس میں آپ کے سامنے نہ نکلتیں، جب اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے تو اس کو تکمیل تک پہنچائے گا، وہ کام کا نقشہ منظوری کے لیے پیش کرے گا، پھر وہ جلد سے جلد روانہ ہو جائے گا، تاکہ اس بغاوت کو فرو کر سکے، اس ایرانی دبیر نے آکر یہ ساری باتیں دہرائیں، امیر نے ان کو پسند کیا، اور ان کو قلمبند کرنے کا حکم دیا، دبیر پوری محنت سے اس

مہم کے نقشہ کو تحریر میں لے آیا جو تلک نے تیار کیا تھا، اس نے تلک کو سارے اختیارات دیدیے تا کہ وہ بازغور کو پکڑنے کے بعد ہندوؤں کو اطاعت گذار بنا سکے۔

جب تلک لاہور پہنچا تو اس نے بہت سے ان مسلمانوں کو قیدی بنا لیا جو احمد نیالتگین کے دوست تھے اور ان کے دائیں ہاتھ کٹوا دیئے بقیہ اور لوگ جو احمد کے ساتھ تھے اس کے اختیارات سے خوفزدہ ہو کر رحم کے طالب ہوئے اور احمد کا ساتھ چھوڑ دیا، اسکے بعد حکومت کے مالی اور انتظامی امور کا مناسب نظم و نسق کیا گیا، تلک نے پورے اعتماد اور اختیارات کے ساتھ احمد کا تعاقب کیا، اسکے ساتھ بہت سے ہندو تھے جو زیادہ تر جاٹ تھے، اس تعاقب میں کچھ لڑائیاں اور جھڑپیں بھی ہوئیں، احمد ہر طرف بھاگتا پھرا، ایک سخت لڑائی بھی ہوئی جس میں احمد کو شکست ہوئی، اور وہ پھر فرار ہوا ترکمانوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور تلک سے امان مانگی جو دی گئی، احمد تین سو سواروں اور ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلا، تلک نے اس کے تعاقب میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اور جاٹ باغیوں کو خطوط لکھے کہ وہ احمد کا ساتھ چھوڑ دیں، اور اگر وہ احمد کو گرفتار کر لیں یا اس کو قتل کر کے اس کا سر لائیں تو ان کو پانچ لاکھ درہم انعام میں دیئے جائیں گے، احمد کا عرصۂ حیات تنگ ہو گیا، اسکے سارے آدمیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اور جاٹ بھی اس کا تعاقب کرنے لگے، اور جب احمد ایک ندی پار کرنے والا تھا تو دو تین ہزار جاٹ اسکے پاس پہنچ گئے، اس کے ساتھ دو سو سوار تھے، وہ خود تو ندی میں کود پڑا لیکن جاٹ اسکے مال و اسباب کو لوٹنے کیلیے ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور جب وہ اسکے پاس پہنچے تو اس نے اپنے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالنا چاہا لیکن جاٹوں نے ویسا کرنے نہیں دیا، اور اس کے لڑکے کو لے بھاگے جو ایک ہاتھی پر سوار تھا، اس کے بعد وہ احمد پر تیروں، نیزوں اور تلواروں سے ٹوٹ پڑے، احمد نے بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر میں مارا گیا، اور اس کا سر کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا، جاٹوں نے اس کے مال و اسباب لوٹ کر اس کے ساتھیوں کو یا تو تہ تیغ کر دیا یا ان کو قیدی بنا لیا، ان کے سرداروں نے تلک کے پاس ان واقعات کی خبر دی،

تلک آس پاس ہی میں تھا، تلک کو انتہائی خوشی ہوئی، اس نے پیامبر بھیجکر احمد کا سر اور اسکے لڑکے کو طلب کیا، جاٹوں نے پانچ لاکھ درہم کا مطالبہ کیا، تلک نے جواب دیا کہ جب وہ احمد کی کثیر دولت لوٹ چکے ہیں تو پھر اس مطالبہ سے باز آجائیں، دو بار پیامبر آئے گئے، آخر میں اس پر سمجھوتہ ہوا کہ جاٹ ایک لاکھ درہم لیکر راضی ہو جائیں، جب یہ رقم بھیجی گئی تو احمد کا سر اور اسکا لڑکا تلک کے سامنے پیش کیا گیا، تلک کا جب مقصد پورا ہو گیا تو وہ لاہور واپس ہو کر اس علاقہ کے نظم و نسق کی طرف رجوع ہوا، پھر دربار منعقد ہوا، امیر نے تلک کو مبارکباد کے خطوط لکھوائے، تلک اور اس کے ساتھیوں کے احسانات کا شکریہ ادا کر کے ان کی تعریف کی۔ (الیٹ ج ۲ ص ۱۳۴ - ۱۲۵)

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ غزنویوں نے ہندوؤں کو بری نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے ساتھ پورے احترام اور ہمدردی سے پیش آتے رہے، یہ روایت محمود غزنوی ہی نے اپنے دور میں قائم کی تھی، جو اسکے جانشینوں نے برقرار رکھی، محمود غزنوی نے سومناتھ کے مندر کو جن اسباب کی بنا پر منہدم کیا، اس کے اسباب پر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن اس کے تمام اوصاف و محاسن کو نظر انداز کر کے اس کو محض اس لیے بہت برا سمجھا جائے کہ اس نے سومناتھ کو منہدم کیا، تو یہ خود بہت بڑی مذہبی غیر رواداری کا ثبوت ہے، مگر ہندوؤں میں کچھ ایسے مورخین بھی ہیں جو اس کو بہت برا سمجھنے کے لیے تیار نہیں، مثلاً سی، وی، ویدیہ نے اپنی کتاب ہسٹری آف میڈیول ہندو انڈیا جلد سوم میں اسکے متعلق جو اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں:-

محمود ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اس نے محض اپنی قوت بازو سے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقہ کو ایک وسیع اور خوشحال سلطنت میں تبدیل کر دیا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا...... میرا خیال ہے کہ محمود ان افراد میں سے ہے جو قدرت کی طرف سے ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں، اور جن میں غیر معمولی قسم کی خوبیاں اور عدیم المثال صلاحیتیں ہوتی ہیں اور جو دنیا کی تاریخ اور قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں، ایک انسان

کی حیثیت سے وہ ایک سخت جنبہ دار نظم و رعایا کرد ار کا حامل تھا۔ اس کے حملوں میں اس کی مثالیں تو ملتی ہیں کہ شہر لوٹے گئے، مندر منہدم ہوئے، خونریزی ہوئی، قیدی غلام بنائے گئے، لیکن عورتوں کی عصمت ریزی یا بچوں کے قتل و خون کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ عدل پسند تھا۔ اس نے ظلم سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ اگر اسکا لڑکا بھی زنا کا مرتکب ہو جاتا تو اس کو قتل کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا، وہ ایک اچھا حکمران بھی تھا اور اچھا منتظم سلطنت بھی، عوام کو خوشحال بنانے کی کوشش میں برابر لگا رہا۔ اس نے قزاقوں کی سرکوبی کر کے تجارت کو فروغ دیا۔ اپنے دور دراز علاقوں کی شاہراہوں کو ہر طرح کے خطرے سے پاک کر دیا، لاہور اور خراسان کے درمیان تجارتی قافلے آزادی سے آتے جاتے رہے۔ اس نے صوبوں میں اچھے حاکم مقرر کیے، ان پر نگرانی رکھتا کہ وہ لوگوں پر ظلم نہ کرنے پائیں ...... وہ سالانہ ایک لاکھ دینار عدل و انصاف اور عوام کی مرفہ الحالی اور خیرات و مبرات میں خرچ کیا کرتا تھا۔ اور یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شہروں اور صوبوں میں عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ان تمام فرائض کو انجام دیتا رہا جو ایک حکمراں کو دینا چاہیئے۔"

الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ایشوری پرشاد اپنی کتاب میڈیول انڈیا میں لکھتے ہیں :۔

محمود نے تاریخ میں جو جگہ بنائی ہے اسکا تعین کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے، اپنے عہد کے مسلمانوں کی نظر میں تو وہ ایک غازی اور مذہب اسلام کا علمبردار تھا جس نے کفر کا خاتمہ کر دینا چاہا، ہندوؤں کی نظر میں آج بھی ایک سنگدل اور ظالم لٹیرا ہے جس نے انکی مقدس عبادت گاہوں کو ملیامیٹ کر کے انکے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا، لیکن ایک غیر متعصب محقق اور مورخ اسکے زمانہ کی صورت حال کو پیش نظر رکھکر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما، ایک انصاف پسند اور دیانتدار حکمراں، ایک باکمال اور پرجوش سپاہی، عدل و انصاف کا شیدائی، علوم و فنون کا مربی تھا، وہ بلاشک و شبہہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔" (مزید تفصیل کیلئے دیکھو میری کتاب ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک (ص ۳۰۔ ۵۹)

البیرونی [illegible] کے لئے اور اگر بالفرض محمود غزنوی کی تلوار سے دہشت پھیلی تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے، غزنوی کے دربار کے ایک اہل علم یعنی ابوریحان بیرونی کے قلم سے محبت کے نغمے آج بھی ہندوستان کی فضا میں گونج رہے ہیں، اور اس کے پیار اور محبت کا قلم چلا جا رہا ہے، باہمی و علمی بیگانگی پیدا ہوتی ہے، بیگانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے، جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی خودبینی پیدا ہوتی ہے، اسکے بعد دل آزاری، مردم بیزاری، آبروریزی اور خونریزی شروع ہو جاتی ہے، اسی لاعلمی، بیگانگی اور بے تعلقی اور دوری کو دور کرنے کی خاطر البیرونی نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے ان ارباب علم و فن میں کیا جاتا ہے جن پر خود علوم و فنون کو فخر ہے، اس کی وفات کو ۹۲۰ سال گذر گئے، لیکن اس طویل مدت کے باوجود اسکی اہمیت اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے، مختلف ممالک کی مختلف زبانوں میں اسکے علمی کارناموں کا احاطہ کیا جا رہا ہے، اس کی علمی رواداری، مذہبی فراخدلی اور تحقیقی دیدہ وری کی داد ابتک دیجا رہی ہے، اس کی علمی کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ گوشت پوست کے بجائے علم و فن کا پیکر تھا، اس کے ذوق کی رنگارنگی کو دیکھئے تو اس کے ذہن کی تشکیل اور دماغ کی ساخت پر حیرت ہوتی ہے، وہ ہیئت، نجوم، علم کیمیا، تاریخ، ادب، طب، لغت میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ہی دنیا کے تمام مذاہب کے عقائد، آثار، مراسم حتی کہ توہمات اور خرافات پر گہری نظر رکھتا تھا، وہ عربی و فارسی کے علاوہ عبرانی اور سریانی سے بھی واقف تھا، سنسکرت بڑی ریاضت سے سیکھی اور اس زبان کی اہم تصانیف پر اس کو کامل عبور ہو گیا تھا،

البیرونی کا علم و فن وہ بحر العلوم ہو کر سینہ کی امانت سفینہ میں منتقل کرنے کی فکر میں لگا رہا، اس نے ٥، سال کی عمر پائی، اسکی ساری عمر علم و فن کی خدمت میں گذری، شروع میں تو اس نے تنگدستی اور عسرت میں زندگی گذاری لیکن جب اپنی علمی شہرت کی بنا پر شاہی درباروں سے وابستہ ہوا تو اسکے دن اچھے گذرنے لگے، پہلے د

شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار سے منسلک ہوا، پھر خوارزم شاہ نے اس کو اپنے دربار میں بلا کر بڑی عزت و احترام سے رکھا، جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ وہ ایک بار البیرونی کے مکان سے گھوڑے پر سوار ہو کر گذر رہا تھا، تو اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی، جب البیرونی اپنے حجرے سے اس کے پاس آیا تو اس نے گھوڑے سے اترنا چاہا، بیرونی نے قسم دیکر اس سے گھوڑے سے اترنے سے منع کیا لیکن اس نے ایک عربی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ علم سب سے زیادہ معزز ملک ہے کہ تمام لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور وہ خود نہیں آتا۔ (معجم البلدان ج ۶ ص ۲۱۰ - ۲۰۹)۔ خوارزم شاہیوں کی تباہی کے بعد البیرونی سلطان محمود غزنوی (وفات ۴۲۱ھ) کی علم نوازی سے مستفیض ہونے لگا، پھر اسکے بیٹے سلطان مسعود کے سایۂ عاطفت میں آگیا جس کے نام پر اس نے متعدد کتابیں لکھیں، ان میں زیادہ مشہور قانون مسعودی ہوئی، سلطان مسعود کے لڑکے شہاب الدین ابو الفتح مودود کے دربار سے بھی وابستہ ہوا، اس کے نام پر کتاب الدستور لکھی (شہرزوری قلمی نسخہ ص ۹۳)۔ شاہی درباروں سے وابستگی کے باوجود وہ دربار داری سے بے نیاز ہو کر اپنے علمی کاموں میں لگا رہا، شہرزوری نے لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتا تھا، اس کا ہاتھ قلم کو، اس کی آنکھ مطالعہ کو اور اس کا دل غور و فکر کو صرف کھانے کے اوقات میں چھوڑتا تھا، اس کی تصنیفات ایک اونٹ کے بار سے زیادہ ہیں (شہرزوری قلمی نسخہ ص ۹۳) خود البیرونی نے اپنی کتاب آثار الباقیہ میں اپنی تصانیف کی تعداد ۱۱۳ بتائی ہے لیکن آثار الباقیہ اس کی وفات سے تیرہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس کے بعد بھی اس نے تصنیفی شغل کو جاری رکھا، وہ نزع کے عالم میں بھی علمی مسئلہ حل کرتا رہا، معجم البلدان میں یاقوت نے لکھا ہے کہ فقیہ ابو الحسن علی بن عیسیٰ الوالجی کا بیان ہے کہ میں ابوریحان کے پاس ایسی حالت میں گیا، کہ وہ دم توڑ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس نے کہا کہ تم نے جدات فاسدہ کے حساب کے متعلق مجھ سے ایک دن کیا کہا تھا، مجھ کو اس پر رحم آیا، اور میں نے کہا کہ اس حالت میں؟

ابوریحان نے کہا کیا اس مسئلہ کا علم اس سے بہتر نہیں ہو کہ میں دنیا کو اس حالت میں چھوڑوں کہ اس سے جاہل رہوں، چنانچہ میں نے اس مسئلہ کو دوبارہ بیان کیا اور اس نے اس کو یاد کر لیا۔ اس کے بعد میں اسکے پاس سے نکلا تو راستہ ہی میں تھا کہ رونے پیٹنے کی آواز سنی (معجم الادباء ج ۱۷ ص ۳۹ - ۴۰ نیز حکمائے اسلام از مولانا عبد السلام ندوی جلد اول ص ۹۷ - ۳۶۶)

البیرونی کی کتاب الہند رواداری کا ایک شاہکار البیرونی کی تمام تصانیف میں ہندوستان اور اس سے باہر بھی کتاب الہند کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو عربی زبان میں لکھی گئی، اس کا پورا نام کتاب ابی الریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ ہے، اس میں ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات مثلاً ارواح کی حالت، تناسخ، معاد اور مقامات جزا، منصوبات یعنی خاص خاص بت جو خاص خاص مقامات میں نصب کئے گئے، رگ بید، جز بید، سام بید، اتھربن بید، پران ہندوؤں کی دوسری دینی کتابیں، ان کے علم نحو، علم عروض، اوزان، ماتر، تنائی، سدّاسی، خماسی، بحرین، پد، نجوم، تول ناپ، پیمائش کے طریقے، رسم الخط، رسوم، عادات، جادو، رساین، جھاڑ پھونک، پھر ہندوستان کے شہروں، دریاؤں، سمندروں، جزیروں، یہاں کے ملکوں کے فاصلے اور حدود، پھر ستاروں، بروج، مہتاب، سبعہ سیارہ، ہفتے کے دنوں، برہمانڈ، زمین، سمندر کی وسعت، آسمان، قطب کی پیدائش کے افسانے، برہما، کلپ، چترجگ، منترات، نارائن، باسدیو، بھارت، ادھی ماسہ، اونراتر، نیات النفس، اہرگن، سال کی تحلیل سے متعلق ہندوؤں کے تخیلات، ان کے معاشرتی رسوم، مقدس مقامات اور تالاب وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔

ہندوؤں کے علم نجوم کے مطابق ستاروں کی ترتیب، ماہتاب کی منزلیں، آفتاب کے گرہن، سمندر کے پانی پر پے در پے مد و جزر وغیرہ کا ذکر ہے، پھر ہندوؤں کے مختلف طبقات کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی مرقع کشی کی ہے، آخر میں ہندوؤں کے نجومی احکام کے اصول، مدخلہ اور اسکے متعلق انکے طریقۂ عمل کا مختصر بیان ہے۔

ان تمام موضوعات سے متعلق البیرونی کو معلومات فراہم کرنے میں جو ریاضت کرنی پڑی وہ خود اپنی جگہ پر ایک دلچسپ موضوع ہے، اس کا بیان ہے کہ جب اس نے ہندوؤں کے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، تو اسکو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں، اس کیلئے سنسکرت زبان کا سیکھنا بہت ضروری تھا، مگر یہ بہت مشکل کام تھا، کیونکہ بقول اسکے ہماری زبان و حلق میں ان کے اصلی مخارج سے نکالنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے اور نہ ہمارے کان ان کو سنکر مماثل و مشابہ حروف میں تمیز کرتے ہیں، اور نہ ہمارے ہاتھ کتابت میں ان کی نقل کرسکتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی زبان کی کسی چیز کو ہمارے رسم خط میں قلمبند کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ اس کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے ہندو جو کچھ جانتے تھے، اس کو بتلانے میں بخل کرتے، غیر قوم والے درکنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے (کتاب الہند ص ۱۲) مگر وہ ان مشکلات سے مطلق نہیں گھبرایا، اس نے بڑی محنت سے سنسکرت زبان سیکھی، پھر اپنی بے تعصبی اور آزاد خیالی کی وجہ سے پنڈتوں اور برہمنوں سے مل کر، ان کے علوم سے واقفیت حاصل کرتا رہا، اور جب وہ ان سے واقف ہوکر خود ہندوؤں کو، ان اصولوں کو جن پر انکے احکام و مسائل کی بنیاد تھی، بتلانا، ان کے بعض دلائل کی طرف اشارہ کرنا اور ان کے حسابات صحیح طریقہ پر سمجھنا شروع کیا، تو وہ تعجب کرتے ہوئے اسکی طرف لپکے اور خود اس سے کچھ سیکھنے کے لیے پروانہ وار گرتے اور اس ہندو عالم کو دریافت کرتے تھے جس سے اس نے علم حاصل کیا، وہ اس کو جادوگر کہنے لگے اور اپنے بڑے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اپنی زبان میں سوائے لفظ بحر یعنی سمندر کے اور ایسے پانی کے جو اسقدر ترش ہو جائے کہ سرکہ سے بھی بڑھ جائے، دوسرے لفظ سے نہیں کرتے تھے، (کتاب الہند عربی ص ۱۲، اردو ترجمہ ج اول ص ۲۱-۲۰) اس نے ہندوؤں کی کتابیں جمع کرنے میں بے دریغ روپیے خرچ کیے، اور جن جن گمنام اور مخفی مقامات میں ہندو پنڈت رہا کرتے تھے، وہاں پہنچکر ان کی صحبتوں میں رہا، اس طرح بقول اسی کے ٹھکریوں میں ملے ہوئے سیب، گوبر میں لپٹے ہوئے موتی اور سنگریزوں میں پڑے ہوئے نگینوں کو علیحدہ کرکے اپنی تصنیف کتاب الہند تیار کی جس کے متعلق ایڈورڈ سخاؤ

کا بیان ہے کہ اگر مسلمان مصنف پر فخر کر سکتے ہیں کہ یہ ان کے فن پر ایک بہت ہی اہم شاہکار ہے تو
ہندوؤں کو بھی اپنی خوش نصیبی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ایک صداقت پسند اور اعلیٰ قسم کے اہل علم نے
آباء و اجداد کے تمدن کی ایک تصویر بنا کر چھوڑی ہے، اس نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس کے بعض حصوں
سے ہندوؤں کو اتفاق نہ ہو، اس کی بعض تنقیدوں سے ان کو الجھن بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ
وہ اعتراف کریں گے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اہم صداقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی، اور اس بات کو ہندو
بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کہ اس نے جابجا ان کے تمدن کی تعریف و تحسین غیر مشروط طریقہ پر کی ہے (کتاب
ابی الریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحقیق ما للہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ دیباچہ انگریزی)
پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی (کلکتہ یونیورسٹی) نے لکھا ہے کہ البیرونی بیرونی لوگوں میں پہلا شخص ہے جس نے
ہندوستان کے علوم و فنون کو سیکھ کر نمایاں شہرت حاصل کی اور اب بھی اس کا شمار ہندی علوم و فنون
کے جاننے کی صف اول میں کیے جانے کے لائق ہے، اس کے علم میں بڑی وسعت اور صداقت تھی،
پھر رواداری اور حقیقت پسندی بھی تھی، اس لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کے ان رہنماؤں میں سے
ہے جو ذہن و فکر پر اثر انداز ہوئے (البیرونی یادگار جلد انگریزی شائع کردہ ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۸۳)

علامہ شبلی رقم طراز ہیں کہ یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے
مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرۂ معلومات مہیا کیا ہے،
(مقالات شبلی ج ۶ ص ۱۰۴) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب ابو ریحان بیرونی نے ہندوستان کا سفر کر کے
وہاں کے علوم و فنون اور رسم و عادت پر کتاب لکھی تو تمام پچھلی تصنیفیں بازیچۂ اطفال بن گئیں (ایضاً ص ۲۵)

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود کے حملوں
سے زیر و زبر ہو رہی تھی، عین اسی وقت علم و فن کا دوسرا سلطان تن تنہا نہایت اطمینان اور چپکے سے
ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا، اس سیاسی لڑائی بھڑائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں

جل رہا تھا، اس نے کتاب الہند لکھ کر جیسا کہ ڈاکٹر زخاؤ نے کہا ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ فخر تھا کہ انکے ایک فرد نے ایک ایسی کتاب لکھی جس نے یونانی سفیروں اور چینی سیاحوں کے ہندوستان کے متعلق بیانات کو تقویم پارینہ بنا دیا تو دوسری طرف ہندوستان پر یہ احسان کیا کہ اس کے پرانے تمدن، پرانے علوم اور پرانے خیالات کو دنیا میں باقی رکھا (عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۷۶-۱۷۵)

اس کتاب کا ہر باب پر از معلومات بھی ہے اور دلچسپ بھی، اور جو کچھ البیرونی لکھتا ہے، اسکی سند میں حوالے بھی دیتا ہے، پاتنجلی، گیتا، بشن دھرم، پران، اوت پران، بشن پران، مہابھارت، برہما سدہانت وغیرہ جیسی کتابوں کے حوالے بار بار آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس زمانہ کے ہندوؤں کے مذہبی، علمی اور معاشرتی حالات کے ساتھ جا بجا اس ملک سے متعلق اس نے جو جغرافیائی معلومات دیے ہیں وہ سب کے سب لطف و لذت کے ساتھ مطالعہ کے لائق ہیں، اس مضمون میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اسلیے ہم اس کی خاص خاص باتوں کا ذکر کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں،

خدا کی ذات و صفات سے متعلق ہندوؤں کے عقائد کا مطالعہ

ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات مثلاً ہند پران، مہابھارت، ہندوؤں کی دوسری دینی کتابیں، انکے علم نحو، عروض، اوزان، ثنائی، ثلاثی، سداسی، خماسی، پد، نجوم، رسوم، عادات، جادو، جھاڑ پھونک، برہما، کلپ، نارائن، باسدیو اور انکے مقدس مقامات اور تالاب وغیرہ پر اپنی کتاب میں ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن سے آج بھی بڑے بڑے پنڈت استفادہ کر سکتے ہیں، ان تمام چیزوں کا مطالعہ مخالفانہ یا متعصبانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ، محققانہ اور حقیقت پسندانہ ہے، وہ پاتنجلی گیتا اور دوسری کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ خدا کی ذات اور صفات کے متعلق ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ رہنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رہنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں یگانہ ہے، جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں، نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے، اور نہ کوئی چیز اسکے ساتھ مشابہت رکھتی ہے (عربی متن اردو ترجمہ ج اول ص ۲۲)

وہ لکھتا ہے کہ کتاب گیتا میں جو باسدیو اور ارجن کے باہمی مکالمے کی کتاب مہابھارت کا ایک حصہ ہے، باسدیو نے کہا ہے "بلا شبہہ میں وہ کل ہوں جس کی نہ ولادت سے ابتدا ہے نہ موت سے انتہا، میرا مقصود اپنے فعل سے مکافات نہیں اور نہ میں محبت یا عداوت کی بنا پر ایک طبقہ کے مقابلہ میں دوسرے طبقہ کی کوئی خصوصیت رکھتا ہوں، میں نے اپنی ہر ایک مخلوق کو وہ چیز جس کی وہ اپنے فعل میں حاجت رکھتا ہو دے رکھی ہو، پس جو شخص مجھکو اس صفت کے ساتھ پہچانتا ہو اور خواہشات کو عمل سے دور رکھنے میں میری مشابہت اختیار کرتا ہے اس کی بندش کھل جاتی ہو، اور اسکی نجات اور آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

(عربی ص ۱۴ - اردو ترجمہ ص ۲۸)

ایشور کے متعلق ہندوؤں کا جو عقیدہ ہو اس کے متعلق البیرونی نے یہ لکھ کر وضاحت کی ہے، ان کے نزدیک وہ مستغنی ہی، جواد ہو، دیتا ہے مگر لیتا نہیں، اسی کی وحدت کو خالص وحدت سمجھتے ہیں، اس لیے کہ اس کے ماسوا کی وحدت کسی نہ کسی حیثیت سے کثرت رکھتی ہے، اس کے وجود کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے موجودات کے وجود کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے موجودات کے وجود کا سبب اور سہارا وہ ہے، یہ توہم کہ سب موجودات معدوم ہیں، اور وہ موجود ہو محال نہیں ہو، اور یہ توہم کہ وہ موجود نہیں ہے اور سب موجودات موجود ہیں، محال ہے (عربی ص ۱۳ - ۱۵ - اردو ترجمہ ص ۲۶) وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا تھا کہ ہندوؤں کے خواص اور عوام کے مذہبی اعتقادات میں اختلاف ہے لیکن ہندو عوام کے بھونڈے اعتقادات کو تحقیر سے دیکھنے کے بجائے ان پر یہ لکھ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس قسم کے اعتقادات دوسرے دینوں میں بھی ہیں، بلکہ اسلام میں بھی تشبیہ، جبر اور کسی شے میں غور و فکر وغیرہ کے اقوال موجود ہیں، جن کی اصلاح واجب ہے۔ (عربی ص ۱۵ - اردو ترجمہ ص ۲۹)

بت پرستی کا تجزیہ | اس نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بت پرستی ہندو عوام کا طریقہ ہے، خواص ہندو اس سے بری ہیں، وہ لکھتا ہے کہ جو شخص نجات کی راہ کا طالب ہو یا جس نے مناظرہ و کلام

کا مطالعہ کیا اور حقیقت کو جاننا چاہا ہے، جس کو یہ لوگ سار کہتے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا ہر دوسری چیز کی عبادت سے پاک دامن ہے، بنائی ہوئی صورت کی عبادت کیا کرے گا۔ اس کی تائید میں گیتا کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ بہت سے لوگ اپنی اغراض کے لیے میرے غیر کے ذریعہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور میرے ماسوا کے لیے اس کا وسیلہ بناتے ہیں، ہم ان لوگوں کو قوت اور توفیق دیتے ہیں اور ان کی مراد تک پہنچا دیتے ہیں، اس لیے کہ ہم ان سے مستغنی ہیں۔ (عربی ص ۵۴ باب ۱۱۔ اردو ترجمہ ص ۱۴۴، ۱۵۰ حصہ اول)۔ اپنے ان خیالات کے باوجود اس نے عام معلومات کے لیے بت پرستی کی تاریخ، ملتان، تھانیسر، کشمیر کے بتوں، چھر رام، کشن، بلدیو، برہما، اندر، مہادیو، بدھ، ریونت آفتاب، امہات سبعہ وغیرہ کی مورتیوں کا حال بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھا ہے جس کے قلمبند کرنے میں تحقیر کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔

شودروں کے ساتھ ناروا سلوک پر البیرونی کی تکلیف

البیرونی کا دل تو ہندوستان کے اس طبقہ کے لیے بھی بڑا نرم اور گداز رہا جس کو شودر کہا جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ برہمن اور کشتر کے سوا دوسروں کو جن کے لیے بید سیکھنا تک ممکن نہیں ہے، نجات نہیں مل سکتی، ان کے محققین کا قول ہے کہ نجات ان طبقوں اور کل نوع انسانی کے لیے مشترک ہے، بشرطیکہ ان لوگوں میں نجات کے حاصل کرنے کا کامل ارادہ پیدا ہو جائے، اس کی دلیل بیاس کا یہ قول ہے کہ پچیس باتوں کو تحقیق کے ساتھ جان لو پھر جو دین چاہو اختیار کرو، یقیناً نجات پاؤ گے، اور اس دلیل سے بھی کہ باسدیو شودر کی نسل سے آیا تھا، اور باسدیو نے ارجن سے کہا تھا کہ اللہ بغیر اس کے کسی پر ظلم کرے، یا کسی سے محبت رکھے، مکافات دیتا ہے، اگر آدمی نیک کام میں اللہ کو بھول جائے تو وہ اس کام کو برا بنا دیتا ہے، اور برے کام میں وہ یاد رہے اور بھولا نہ جائے تو اس کے نیک بنا دیتا ہے، اگرچہ کرنے والا بیش یا شودر یا عورت ہو، چہ جائیکہ برہمن یا کشتر ہو (عربی ص ۱۵۰۔ اردو ترجمہ ص ۱۴۳، حصہ اول)

ذات پات کی تفریق سے شودر کو جو نچا درجہ دیا گیا ہے، اس سے بھی البیرونی کو تکلیف رہی جس کو اس نے یہ لکھکر دور کیا ہے کہ یہ سارا تفرقہ درجات کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے، جس میں ایک شخص دوسرے کو مسخر یا محکوم بنا لیتا ہے، ورنہ باسدیو نے خالب بنجانکے حق میں کہا کہ عقلمند کے نزدیک برہمن اور چنڈال دوست اور دشمن، امانت دار اور خائن، سانپ اور نیولا برابر ہیں، اور اگر عقل سب کو مساوی ٹھہراتی ہے تو فرق تو پوری جہالت کی پیدا کی ہوئی ہے۔

(عربی ص ۲۷۱ - اردو ترجمہ جلد دوم ص ۲۱۳)

البیرونی کا عالمانہ اور منصفانہ انداز بیان

البیرونی نے ہندو مذہب کے کسی پہلو کو بری نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، اسی لیے اس کو اس مذہب کی کسی بات سے اختلاف کہیں کہیں ہوا ہے، تو اس سے نہ خود برگشتہ ہوتا ہے، اور نہ اپنے ناظرین کو برگشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ اپنا اختلاف عالمانہ اور منصفانہ طور پر ظاہر کرتا ہے، جس میں مناظرانہ رنگ نہیں پیدا ہونے پایا ہے، وہ ہندوؤں کے اعلیٰ پایہ کے فلسفی، ریاضی داں اور ماہر ہیئت ہونے کا قائل ہے، اس کو ہندوستان کے فلسفہ سے بھی دلچسپی رہی، وہ ہندوؤں کے فلسفہ کو یونانیوں، مجوسیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صوفیوں کے فلسفہ سے مقابلہ اور موازنہ کرتا ہے، اور کہیں کہیں تو ہندوؤں کی عقل و دانش کا مداح ہو کر اپنے خیالات کو بڑی عرق ریزی اور دقت نظر سے تطبیق دینے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہندوؤں کے نجوم و ہیئت کے ساتھ ان کی صنعت و دستکاری کا بھی معترف رہا، پھر ہندوؤں کے نہانے کے تالابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس فن میں ہندوؤں کو کمال چابکدستی ہے، مسلمان جب ان کے تالابوں کو دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں، اور ایسے تالاب بنانا تو درکنار ان کے بیان سے بھی عاجز رہ جاتے ہیں۔

(باقی)

شرح السنۃ امام بغوی

از

ضیاء الدین اصلاحی،

(۴)

لغت و عربیت | غریب الفاظ و لغات کا حل اس شرح کی اہم خصوصیت ہے، اس لئے اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں تاکہ عربیت میں مصنف کے کمال اور الفاظ و لغات کی تحقیق میں اُن کی دیدہ ریزی و کاوش کا اندازہ ہو سکے،

ایک جگہ قنوت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس کے چار معانی ہیں، (۱) نماز جیسا کہ اللہ نے فرمایا :-

امن هو قانت اناء الليل ساجداً وقائماً (زمر - ۱۹)	بھلا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں سجدہ ریز ہو کر اور قیام کرکے نماز پڑھتا ہے،

(۲) طول، قیام (دیر تک کھڑا رہنا) جیسے ایک حدیث میں ہے،

افضل الصلوٰة طولُ القنوت ...	بہترین نماز وہ ہے جس میں طویل قیام کیا جائے،

(۳) اطاعت و فرمانبرداری، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں کہا گیا ہے

كان اُمة قانتاً لله، — وہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ (نحل: ۱۲۰)

(۴) سکوت، چنانچہ قرآن میں ہے :۔

قُومُوا اللهِ قَانِتِيْنَ ٥ — (نمازوں میں) خدا کے حضور خاموشی سے کھڑے رہو۔ (بقرہ ۲۳۸)

یہاں قانت کے معنی ذاکر (اللہ کو چپکے والا بھی بیا گیا ہے[۱]"

(جلد سوم ص ۳۲۲)

ایک حدیث میں لم یلغ (اُس نے لغو یعنی بیہودہ گوئی نہیں کی) کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اس کے معنی (لم یتکلم اُس نے بات چیت نہیں کی) ہے خطبہ کے وقت میں بات چیت کرنے کو لغو کہا گیا ہے حدیث میں ہے،

اذا قلت لاخیک انصت و الامام یخطب فقد لغوت، — اگر امام کے خطبہ دینے میں تم اپنے ساتھی سے "چپ رہو" کہو تو تم نے لغو (بات چیت) کیا،

ایک اور روایت میں ہے :۔

---

[۱] یہاں بھی مصنف کا بیان محل نظر ہے، درحقیقت قنوت کے معنی اطاعت و فرمانبرداری ہی کے ہیں، باقی سب تشریحی و توضیحی معانی ہیں، آیتوں کے ترجمہ میں مصنف کے خیال کی رعایت کی گئی ہے ورنہ پہلی آیت (امن هو قانت الخ) اور آخری آیت (قوموا لله الخ) میں قنوت کا مناسب ترجمہ فرمانبرداری و اطاعت ہی ہوگا۔

من مس الحصی فقد لغا — جس نے کنکری چھوئی تو اس نے لغو (بات چیت) کیا،

بعض اہل لغت نے اس کے معنی درست اور ٹھیک کام سے منحرف ہونے اور بعض نے خائب اور خاسر ہونے کے لئے ہیں، دراصل الغاء کے معنی اسقاط (ساقط کرنا، چھوڑ دینا) ہیں، اس لئے لغو ہر اس چیز کو کہیں گے، جو ساقط کرنے، چھوڑ دینے اور پھینک دینے کے لائق ہو، قرآن مجید میں ہے،

لا یسمعون فیھا لغواً (واقعہ - ۲۵) — (اہل جنت، جنت میں) کوئی لغو بات نہ سنیں گے،

دوسری جگہ ہے،

والغوا فیہ، (فصلت: ۲۶) — اور (قرآن پڑھا جائے تو) لغو گوئی کرو،

اسی لئے بلا نیتجہ اور بے فائدہ بات چیت کو لغو کہتے ہیں، کہا گیا ہے کہ

ایاکم وملغاۃ اول اللیل، (جلد ۴ ص ۲۳۸) — اوائل شب میں باطل اور بے سود بات چیت سے بچو،

بعض لفظوں کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں، جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

" منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر کو پوشیدہ اور مخفی رکھتا ہے اس لئے وہ اس شخص کے مانند ہے جو نفق (سرنگ) میں داخل ہو کر چھپ جاتا ہے، بعض لغت کا بیان ہے کہ یہ نافقاء الیربوع (چوہے کے مخفی سوراخ) سے بنا ہے کیونکہ چوہے کے ایک سوراخ کو نافقا اور دوسرے کو قاصعاء کہتے ہیں، وہ قاصعاء سے

داخل ہو کر نفقا رسے نکلتا ہے، اسی طرح منافق جس راستہ سے ایمان میں آیا تھا اس کے بجائے دوسرے راستہ سے نکلتا ہے،

(جلد اوّل ص ۱۲۷،۱۲۶)

فرض نمازوں کے آخر میں پڑھی جانے والی تسبیحات کو معقبات کہے جانے کی وجہ یہ تحریر کی ہے:۔

"تسبیحات یکے بعد دیگرے پڑھی جاتی ہیں، اس لئے ان کو معقبات کہا گیا ہے"

تعقیب کسی کام کو یکے بعد دیگرے کرنے کو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ولّی مدبرا ولم یعقب، (نمل - ۱۰) (موسیٰؑ نے) پیٹھ پھیری اور دوبارہ نہ مڑے،

یہاں "لم یعقب" کے معنی لم یرجع لئے گئے ہیں، یعنی سانپ کے ڈر کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے جب پیٹھ پھیری تو دوبارہ لوٹ کر پھر اس کے سامنے نہیں آئے۔

دوسری جگہ ہے:۔

له معقبات، (رعد - ۱۱) انسان کے لئے باری باری آنے والے (فرشتے) ہیں،

یعنی انسان کے ساتھ ایسے فرشتے ہوتے ہیں، جو یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں، ایک حدیث میں ہے:۔

ملائکۃ اللیل تعقب ملائکۃ النھار[1] رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے بعد (باری باری) آتے ہیں،

---

[1] جلد سوم ص ۲۳۱ و ۲۳۲،

امام بغوی نے مترادف اور قریب المعنی الفاظ کے دقیق فرق کی بھی نشاندہی کی ہے جیسے :-

" خشوع وخضوع کے معنی قریب قریب یکساں ہیں لیکن خضوع کا تعلق صرف بدن سے ہے، مگر خشوع کا بدن، نگاہ اور آواز سے بھی ہے۔ قرآن مجید میں ہے :-

وخشعت الاصوات للرحمٰن	اور خدائے رحمٰن کے حضور آوازیں پست ہو جائیں گی۔
(طٰہٰ - ۱۰۸)	

غم اور حزن کے متعلق لکھتے ہیں :-

" بعض لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ حزن (غم) گذشتہ چیز پر ہوتا ہے اور ہم (اندیشہ) آئندہ اور متوقع چیز کے بارہ میں ہوتا ہے "

(جلد پنجم ص ۱۵۶)

مردوں کے نوحہ کی ممانعت سے متعلق حدیث میں تین مترادف الفاظ آئے ہیں صالقہ[1] حالقہ[2] اور شاقہ[3]، ان تینوں کا فرق ملاحظہ ہو :-

" صالقہ اس عورت کو کہیں گے جو چیخ چیخ کر روئے، اور نوحہ کرے، یہ لفظ سین سے بھی آتا ہے :-

سلقوکم بالسنۃ حداد	وہ (منافقین) تم سے دلخراش باتیں کرتے ہیں،
(احزاب - ۱۹)	

یعنی تمہاری دلآزاری کی باتیں کھلم کھلا اور علی الاعلان کہتے ہیں صلق اصل میں تیز اور بلند آواز کو کہتے ہیں، صالقہ سے وہ عورت بھی مراد ہو سکتی ہے، جو رونے دھونے میں اپنے گالوں پر طمانچے مارتی ہو۔

---

[1] شرح السنۃ جلد سوم، ص۴۹۵

"حالقہ وہ عورت جو اظہارِ غم کیلئے اپنے بال منڈا دے، اور شاقہ، کپڑے، اور جیب و گریبان چاک کرنے والی عورت کو کہتے ہیں"۔

(جلد پنجم ص ۴۳۸)

طبع کے معنی تحریر کرتے ہوئے اس کے بعض ہم معنی الفاظ کا فرق واضح کرتے ہیں:-

"طَبَع، ختم (مہر لگانا) کو کہتے ہیں، اسی سے طابع کا لفظ بنا ہے، جو خاتم (انگوٹھی) کے معنی میں ہے، اور طَبَعْ، اس زنگ اور میل کو بھی کہتے ہیں، جو تلوار میں لگ جاتی ہے، یہیں سے گناہ اور قبیح کے معنی میں بھی یہ بولا جاتا ہے، مجاہدؒ کا قول ہے کہ رَین، طبع سے اور طبع، اقفال سے کمتر درجہ کی چیز ہے، یعنی اقفال کے لفظ میں سب سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ ذیل آیتوں پر غور کرنے سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ کلّا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون، — ہرگز نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر اُن کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے،

(مطففین-۱۴)

۲۔ وطبع اللّٰہ علیٰ قلوبھم، — اور اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے،

(توبہ-۹۳)

۳۔ ام علیٰ قلوبٍ اقفالھا[۱] — یا اُن کے دلوں پر تالے چڑھے ہیں

(محمد-۲۴)

محاورے اور اسالیبِ کلام اسی ضمن میں محاوروں اور اسالیبِ کلام سے متعلق بعض بحثیں بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:-

---

[۱] شرح السنۃ ج ۴ ص ۲۱۴،

فاخذ فی ما قرب وما بعد، (مجھکو قریب بعید نے دھر لیا)

کے متعلق لکھتے ہیں :۔

یہ محاورہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کسی شخص کو کسی چیز نے تشویش و اضطراب اور غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا ہو، ما قرب و ما بعد کی جگہ ما قدم و ما حدث کی بھی روایت ہے، اور بعض اہل عرب ایسے موقع پر فاخذ فی المقیم والمقعد بولتے ہیں، ان سب کا ایک ہی مفہوم ہے، کہ اس نئے حادثہ نے جو اس وقت پیش آیا ہے، میرے گذشتہ غموں کو تازہ اور پچھلے ترددات کو لوٹا دیا، امام خطابی اس کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ میرے سارے قدیم غم عود کر آئے ہیں اور وہ اس نئے اور تازہ غم سے متصل ہو گئے۔" (ج ۳ ص ۲۳۵)

ایک حدیث میں تلاوت قرآن کرنے والے کے ساتھ قیامت کے روز اعزاز و اکرام کا معاملہ کئے جانے کا ذکر ہے، اسی ضمن میں ہے کہ

فیعطی الملک بیمینہ والخلد بشمالہ، اس قاری کے دائیں ہاتھ میں ملک اور بائیں میں خلد عطا کیا جائے گا'

امام بغوی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں :۔

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعۃً اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز رکھی جائے گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قاری کو یہ سب عطا کیا جائے گا، اور وہ اس کے قبضہ و تصرف میں کر دی جائیں گی، یہ دراصل ایک اسلوب بیان ہے، کہ اگر کسی شخص کو کوئی چیز دی جاتی ہے، اور وہ اس کی ملکیت اور تصرف میں آجاتی ہے تو گویا وہ اس کے ہاتھ میں ہو جاتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں ھُوَ فی یدک وکفک (وہ تمہارے

ہاتھ اور مٹھی میں ہے"، یعنی وہ تمھارے قبضہ و اختیار میں ہے اور تم اس کے مالک ہو"۔

(شرح السنۃ جلد ۴ ص ۱۵۵)

قبرستان میں جانے والے کو رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ کہنے کی تلقین کی ہے:

السّلام علیکم اھل الدّیار	اے قبروں کے رہنے والے مومنو! اور مسلمانو!
من المومنین والمسلمین و	تم پر سلامتی ہو، اور ہم بھی انشاء
انا ان شاء اللہ بکم لاحقون	اللہ تم لوگوں سے ضرور ملنے والے ہیں

اس میں زبان کے دو خاص استعمالات ہیں، ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

• مردوں پر سلامتی بھیجنے کے وقت پہلے دعائیہ کلمہ لایا جاتا ہے، اور اس شخص کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے جس کے لئے سلامتی کی دعا کی جاتی ہے، یہ زبان کا عام قاعدہ ہے، کہ دعائے خیر کے موقع پر پہلے دعا کو لایا جاتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:۔

رحمۃ اللہ و برکاتہ علیکم	اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمت
اھل البیت، (ھود-۷۳)	اور برکت ہو،

دوسری جگہ ہے:۔

سلام علی آل یاسین۔	الیاس پر سلامتی ہو،

(صافات-۱۳۰)

لیکن بد دعا کے موقع پر بد دعا کا لفظ موخر کر دیا جاتا ہے، اور پہلے اس شخص کا ذکر کیا جاتا ہے جس کے لئے بد دعا کی جاتی ہے:۔

شیطان کے متعلق کہا گیا ہے:۔

وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (ص۔ ۷۸) | اور بے شک روزِ جزا تک تجھ پر میری پھٹکار رہیگی،

انشاء اللہ میں استثناء سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں شک کا مفہوم پایا جاتا ہے، بلکہ متکلم عادتاً اپنے کلام کی تحسین و تزئین کے لئے ایسا کہتا ہے، جیسے ایک شخص اپنے ساتھی سے کہتا ہے:۔

آملك ان احسنت الى شكوتك انشاء الله وان ائتمنتنى لم اخنك ان شاء الله، | بے شک اگر تم مجھ پر احسان کروگے تو انشاء اللہ میں تمہارا شکر گذار ہوں گا، اور اگر تم نے مجھکو امین بنایا تو انشاء اللہ میں تمہارے ساتھ خیانت نہ کروں گا۔

روایت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ انشاء اللہ کا استعمال ہر موقع پر مستحب ہے، خواہ معاملہ مشتبہ اور مشکوک نہ بھی ہو، حضرت اسماعیلؑ کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے،

سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ، (صافات۔ ۱۰۲) | انشاء اللہ آپ مجھ کو ثابت قدموں میں پائیں گے،

حضرت یوسفؑ کے قصہ میں ہے،

ادخلوا مصر انشاء الله آمنين، (یوسف۔ ۹۹) | مصر میں انشاء اللہ اطمینان سے داخل ہو جاؤ،

خود اللہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ | انشاء اللہ تم لوگ اطمینان سے

انشاء اللہ آمنین ، (فتح - ۲۷)	مسجد حرام میں داخل ہوگے ،

ایک جگہ اللہ نے آپ کو تلقین کی ہے کہ :-

ولا تقولن لشیٔ انی فاعل ذلک غداً الا ان یشاء اللہ (کہف - ۲۳ و ۲۴)	اور تم کسی چیز کے بارہ میں یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو کردوں گا مگر با یں طور کہ اگر اللہ نے چاہا (انشا اللہ) کروں گا ،

بعض شارحین کا خیال ہے کہ حدیث میں انشاء اللہ کا تعلق لاحقون (ملنے) سے نہیں ہے ، بلکہ ایمان سے ہے ، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ "ہم بھی انشاء اللہ ایمان سے وابستگی کی حالت میں تم لوگوں سے ملیں گے" (جلد ۵ ص ۴۶۸تا ۴۷۱)

بعض جگہ کلام میں حذف اور تقدیم و تاخیر اور بلاغت و بیان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے ، اور اس سلسلہ میں کلام عرب سے شواہد بھی پیش کئے ہیں ، مگر طوالت کے خوف سے بحث نہیں ختم کی جاتی ہے ،

نحوی و صرفی مسائل | شرح السنۃ میں نحوی و صرفی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے ، اُن کی مثالیں ملاحظہ ہوں ،

آمین سے متعلق ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ ،	جب امام آمین کہے تو تم لوگ بھی آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے موافق ہوتا ہے اس کے سابقہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں

امام بغوی اس حدیث کے ضمن میں ایک نحوی نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں جو یہ ہے کہ "فانّہ من وافق الخ" کا عطف ایک محذوف پر ہے، جو ملائکہ کے آمین کی خبر ہے، اس کی صراحت ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اذا امن القاری فامنوا فانّ	جب نماز پڑھانے والا آمین کہے
الملائکۃ تومن فمن وافق	تو تم لوگ بھی آمین کہو، کیونکہ ملائکہ
تامینہ تامین الملائکۃ غفرلہ	بھی آمین کہتے ہیں، سو جس کا آمین
ما تقدم من ذنبہ،	کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے موافق
	ہوتا ہے اس کے سابقہ گناہ معاف
	کر دیئے جاتے ہیں۔

صلاۃ وسطی کے بیان میں مندرجہ ذیل آیت نقل کرکے لکھتے ہیں:۔

حَافِظُوا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلوٰۃِ	نمازوں کی نگہداشت رکھو خاص طور
الوسطیٰ، (بقرہ۔ ۲۳۸)	پر بیچ کی نماز کی،

والصلاۃ الوسطی میں واو تخصیص و تفضیل کے لئے لایا گیا ہے، یہ واو عاطفہ نہیں ہے دوسری جگہ ہے:

من کان عدواللہ وملائکتہ	جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے
ورُسلہ وجبریل ومیکٰئل،	رسولوں اور جبریل ومیکائیل کے دشمن
(بقرہ۔ ۹۸)	ہوئے،

جبریل ومیکائیل بھی ملائکہ میں شامل ہیں لیکن خصوصیت کی بنا پر ان کا پھر علیحدہ اور مستقل ذکر کیا گیا ہے، ایک اور جگہ ہے:۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ، ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجور اور انار ہوں گے، (جلد ۲ ص ۲۳۲)

صرفی بحثوں میں الفاظ کے مشتقات وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، مثال کے طور پر ایک بحث کا خلاصہ دیا جاتا ہے، وہ لفظ اسم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"بعض لوگوں نے اس کو وسم اور سمۃ سے مشتق بتایا ہے، جس کے معنی علامت کے ہیں، گویا اسماء اپنے مسمیات کی علامتیں اور نشانات ہوتے ہیں، اور ان کے ذریعہ ایک چیز دوسری چیز سے ممیز اور ممتاز ہو کر جان پہچان لی جاتی ہے، مگر اکثر علمائے نحو نے اس کو سمو سے مشتق مانا ہے، جو علو (بلند ہونا) کے معنی میں ہے، اس صورت میں بات یوں ہی کہ گویا اسم اپنے معنی پر بلند و بالا اور غالب ہو گیا، اور اس کا معنی اس کے نیچے ہو گیا، یہی قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اسم کی تصغیر سُمَیّ آتی ہے اور اگر یہ سِمَۃٌ اور وسم سے مشتق ہوتا تو تصغیر وُسَیْم آتی جیسا کہ اس کے ہم وزن وَعْدٌ وَعِدَۃٌ کی تصغیر وعید آتی ہے، اور اس کا صیغہ سمیت وغیرہ آتا ہے، حالانکہ اگر یہ وسم سے بنا ہوتا تو وسمت کہا جاتا، اس کی جمع اسماء ہے۔" (جلد ۵ ص ۲۹ و ۳۰)

مصنف نے حدیث کی جو فنی بحثیں کی ہیں وہ بڑی محققانہ ہیں، ان میں اصولِ حدیث کے مباحث، رواۃ اور روایت کی قوت وصحت یا ضعف ووہن، اور جرح و تعدیل کے متعلق اقوال نقل کرکے روایت کے درجہ و مرتبہ کو متعین کیا گیا ہے، مگر اس قسم کی خالص فنی بحثوں سے اردو خواں طبقہ کو دلچسپی نہ ہوگی، اس لئے انھیں قلم انداز کیا جاتا ہے،

شرح السنۃ سے امام بغوی کی وسعتِ علم و نظر کا پورا اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنے زمانہ کی متداول اور مروج کتابوں پر مکمل نظر رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے لغات کے حل میں بلند پایہ

اہل لغت اور عربیت کے ماہرین کے اقوال، کلام مجید اور عربی زبان کے شواہد و اسالیب نقل کئے ہیں، حدیث کی اہم شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے، و مشہور شارحین کے اقوال اکثر ذکر کئے ہیں، فقہ و خلاف کے مباحث میں صحابہ و تابعین کے مسالک اور ائمہ فقہ و اجتہاد کی رائیں تحریر کی ہیں، اور تفسیری اقوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو کبار ائمہ تفسیر کے تفسیری اقوال بیان کرتے ہیں،

مقدمہ و حواشی | فاضل مرتبین شعیب ارناؤوط اور زہیر الشاویش کے مقدمہ میں شرح کی اہمیت و خصوصیت، تصنیف کا مقصد اور اس کے چھ قلمی نسخوں کے بارہ میں ضروری مفید معلومات، امام بغوی کے مختصر حالات و کمالات ...... اور مخطوطہ نسخوں کا عکس دیا گیا ہے، متن کی تصحیح میں مخطوطہ نسخوں کے علاوہ حدیث و سیر اور طبقات و رجال کی مختلف کتابوں سے مدد لی گئی ہے، اور حاشیہ میں نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح، رجال کے تراجم، احادیث کی قوت و ضعف، اسماء و لغات کی تحقیق اور آیتوں اور حدیثوں کی تخریج کر کے ان کے مفصل حوالے دیئے گئے ہیں، مصنف کی مختصر تشریحات اور مبہم بیانات کی تفصیل و توضیح، اور کہیں کہیں ان کی رایوں سے اختلاف بھی کیا گیا ہے،

تذکرۃ المحدثین

(جلد اول)

صحاح ستہ کے جلیل القدر مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی کے اوائل تک کے تمام مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک صاحب موطا، امام عبد الرزاق امام دارمی، امام ابن جارود، امام ابن حنبل، امام حمیدی، امام ابن خزیمہ وغیرہ کے حالات سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل، مع مقدمہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، مؤلفہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، قیمت: ۱۱ روپیہ، اس کی دوسری جلد زیر طبع ہے، "منیجر"

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

فتح اسیر گڈھ کا کتبہ

سلسلہ کے لیے دیکھئے معارف ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء

از جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیوا سدن کالج برہانپور

جامع مسجد برہانپور کا فاروقی دور کا دوسرا کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے جس کا ذکر انشاء اللہ آیندہ کسی اشاعت میں ہوگا، اس مسجد کا تیسرا کتبہ دور مغلیہ کا ہے جو جنوبی مینار کے زیریں حصہ پر ہے، اسکی زبان فارسی اور خط نستعلیق ہے، کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

(۱) "تاریخ الٰہی عبارت است از زمان جلوس حضرت شہنشاہ ظلِّ الٰہ اکبر، بادشاہ اکبر کہ نہ تا پُید جواں بخت

(۲) خبریش قلعۂ اسیر کشاد۔ گشت آباد اسیر ازاں نامی .:. سنہ بیش گفت ا لہ آباد

(۳) بتاریخ ۱۲ فروردین ماہ الٰہی سنہ ۴۵ موافق رمضان سنہ ۱۰۰۹ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ ظلّ اللہ برہانپور را

(۴) مقرِ رایات ظفر آیات ساختند و بہادر خاں آمدہ بپا بوس مشرف شد و اوبا اتباع جاں بخشی کردند و قلعۂ اسیر فتح شد۔

(۵) شاہِ غازی جلالِ دیں اکبر	آں بتائیدِ بختِ قلعۂ کشا
کرد فتحِ اسیر ازاں نامی	گفت بگرفت قلعۂ اعلا

(۶) قائلہ کاتبہ محمد معصوم المتخلص بنامی ابن سید صفائی الترمذی اصلاً والبکری مسکناً ومدفناً

(۷) والمنتسب اُمّاً الی سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال السبزواری مولداً والقندھاری موطناً ومقرّاً

(۸) بتاریخ دوازدہم اردی بہشت سنہ ۴۶ موافق دہم شوال سنہ ۱۰۱۰ بندگان حضرت عازم لاہور شدند

(۹) فتح خاندیس ودکن چون کرد شاہ ۔۔۔ عازم ہندوستان فی الفور شد

یک عدد نامی فزود آن گاہ گفت ۔۔۔ شاہِ والا عازمِ لاہور شد

ترجمہ:۔ (۱) تاریخ الٰہی سے مراد حضرت شہنشاہ، بزرگ ترین خدا کے سایہ، بادشاہ شاہ اکبر کا زمانۂ جلوس مراد ہے جنھوں نے

(۲) اپنی جوان قسمت کی حمایت سے قلعۂ اسیر فتح کیا۔ (شعر) اسیر آباد ہوگیا اس لیے نامی نے ایک عدد کا اضافہ کرکے (اس کا تاریخی مادہ) الہ آباد کہا۔

(۳) بتاریخ ۲۱ ماہِ فروردین سنہ ۴۵ الٰہی مطابق (۲۴) رمضان سنہ ۱۰۰۸ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ، سایۂ خدا نے برہانپور کو

(۴) اپنے ظفر نشان جھنڈوں کا مستقر بنایا (برہانپور کا بادشاہ) بہادر خاں آکر قدمبوسی سے مشرف ہوا، اسکی اور اس کے ماتحتوں کی جاں بخشی کی گئی اور قلعۂ اسیر فتح ہوگیا۔

(۵) شاہِ غازی جلال الدین اکبر نے قلعہ فتح کرنے والی اپنی قسمت کے زور سے اسیر کو فتح کرلیا، اس لیے نامی نے (اس کا تاریخی مادہ) بگرفت قلعۂ اعلیٰ (نہایت بلند قلعہ فتح کیا) کہا

(۶) اس کتبہ کا قائل وکاتب محمد معصوم المتخلص بہ نامی سید صفائی کا فرزند ہے جو دراصل شہر ترمذ کے باشندے تھے۔ اور جنھوں نے بھکر (علاقہ سندھ) میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں وہ دفن بھی ہوئے۔

(۷) اور والدہ کی طرف سے اس کا نسب سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال سے ہے۔

جن کا مولد سبزوار اور وطن قندھار تھا، اسی قندھار میں ان کا مزار بنا ہے۔

(۸) بتاریخ ۱۲ اردی بہشت ۱۰۴۲ھ (الٰہی) مطابق ۱۰ شوال ۱۰۰۸ھ (ہجری) بادشاہ سلامت نے لاہور کا قصد کیا۔

(۹) (قطعہ) جب بادشاہ نے خاندیس و دکن کو فتح کیا تو فوراً ہندوستان کا قصد کیا۔ نامی نے ایک عدد کا اضافہ کرکے (تاریخی مادہ) "شاہ والا عازم لاہور شد"۔ (شاہ والا عازم لاہور ہوئے) کہا

کتبہ پر تبصرہ اس کتبہ میں تین تاریخی مادے ہیں (۱) "الہ آباد" (۲) "بگرفت قلعۂ اعلا" (۳) "شاہ والا عازم لاہور شد"۔ پہلے دو مادے فتح اسیر کے ہیں اور تیسرے مادے میں اکبر کی تاریخ مراجعت ہے۔ فتح اسیر کے پہلے مادہ "الہ آباد" سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، چنانچہ آر۔ بی ہیرالال نے اس کا یہ مطلب لیا کہ شہنشاہ اکبر الہ آباد کے راستے برہان پور آیا تھا[1]، حالانکہ کتبہ میں الہ آباد سے کوئی مخصوص شہر مراد نہیں ہے بلکہ وہ اپنے لغوی معنے میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح مسٹر صبور نے اس کتبہ کے خلاصہ میں تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ اکبر برہان پور پر قبضہ کرنے کے لیے اکبرآباد (آگرہ) سے آیا تھا[2]، حالانکہ کتبہ میں اکبرآباد کا کہیں ذکر نہیں ہے، غالباً موصوف نے غلطی سے الہ آباد کو اکبرآباد پڑھکر یہ رائے قائم کی۔

محمد معصوم نے الہ آباد سے فتح اسیر کی تاریخ اکبر کے سنہ جلوس میں نکالی ہے۔ اسیر گڈھ ۴۵ سنہ جلوس میں فتح ہوا تھا، اور الہ آباد کے عدد ۴۴ ہوتے ہیں، اس لیے موصوف نے ایک عدد کا اضافہ کرکے ۴۴ کو ۴۵ بنا دیا اور "سنہ بیش گفت" کے الفاظ سے اس اضافہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ نامی نے فتح اسیر کے مادۂ تاریخ کے لیے "الہ آباد" کا انتخاب کیوں کیا، جبکہ اس سے فتح کا صحیح سنہ بھی نہیں نکلتا اور اس کے معنی بھی فتح اسیر پر دلالت کرنے کے

---

[1] Descriptive List of Inscriptions in C.P. & B. E.I.P.S. For 1961
Berar, Nagpur.

[2] E.I.P.S. For 1961

بجائے غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پُر تکلف انتخاب محض اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا گیا کیونکہ اکبر اپنے آپ کو شانِ الٰہی کا مظہر بلکہ ہندوانہ اصطلاح میں خدا کا اوتار سمجھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والی مخصوص اشیاء کا جزو خاص لفظ الٰہی تھا، مثلاً اس کا ایجاد کردہ مذہب دین الٰہی، رائج کردہ گز گزِ الٰہی، جاری کردہ سنہ سنہ الٰہی اور حاجیوں کو لانے لیجانے والا سرکاری جہاز جہاز الٰہی کہلاتا تھا، اکبر نے ایک مرتبہ اپنی اسی شانِ الوہیت کی تشہیر کے لیے حکم دیا تھا کہ میری مہر کا سجع "اللہ اکبر" کہیں، چونکہ اس جملہ سے اکبر میں شانِ الوہیت کا شبہ ہوتا تھا، اس لیے حاجی ابراہیم سرہندی نے مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس میں شبہ پڑتا ہے اس لیے "وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرُ" (اور البتہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے) کہیں تو بہتر ہے[1]، مگر حاجی صاحب موصوف کی ایک نہ چلی اور اکبر کی خواہش کے مطابق مہر پر "اللہ اکبر" کندہ ہو کر رہا، عہد اکبری کے منصب دار سلام کرتے وقت السلام علیکم کے بجائے اللہ اکبر اور وعلیکم السلام کے بجائے جل جلالہٗ کہا کرتے تھے، اللہ اکبر سے اللہ کی کبریائی اور جل جلالہ سے اس کی عظمت و جلال کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن ان جملوں میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اکبر شہنشاہ کا لقب اور جلال الدین اس کا نام تھا، اسی مناسبت سے عہد اکبری کے امراء اکبر میں شانِ الوہیت کا اعتراف کر کے اس کی عظمت و جلال کا اظہار کرتے تھے، بہرحال جب اسیر گڈھ فتح ہو کر اکبر کے زیر سایہ آیا، اور بقول نامی اکبر کے ذریعہ آباد ہو گیا تو اس کے لیے موزوں لفظ اکبرآباد تھا، لیکن چونکہ نامی اکبر کو شانِ الٰہی کا مظہر سمجھتا تھا، اس لیے اس نے الٰہ آباد کو اکبرآباد کا مرادف مان کر اس سے فتح اسیر کی تاریخ نکالی، اگرچہ اس میں ایک عدد کی کمی رہ گئی۔

فتح اسیر کا دوسرا تاریخی مادہ "بگرفت قلعۂ اعلیٰ" ہے، جس سے ۱۰۰۹ھ برآمد ہوتا ہے،

---

[1] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۹۲۔

اس مادہ میں اسیر گڈھ کو نہایت بلند قلعہ مانا گیا ہے، اس کی بلندی کا اندازہ ۸۶۶ھ کے اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب والی برہان پور عینا عادل خاں فاروقی کے عہد حکومت میں مالوہ کا بادشاہ محمود خلجی تسخیر اسیر گڈھ کے ارادہ سے لشکر سمیت دامن قلعہ میں فروکش تھا، اس نے ایک رات بیدار ہوکر قلعہ کی طرف نظر کی تو خادم کو آواز دے کر کہا کہ صبح کا ستارہ طلوع ہوگیا ہے، وضو کے لیے پانی لاؤ، خادم نے عرض کی کہ حضور! آپ جسے صبح کا ستارہ سمجھ رہے ہیں وہ اسیر گڈھ کے برج کا چراغ ہے، بادشاہ نے حیران ہوکر گردن جھکائی اور کچھ دیر سوچ کر کہا کہ جو پہاڑی قلعہ اتنی بلندی پر واقع ہے کہ اس کے برج کا چراغ آسمان کا ستارہ معلوم ہوتا ہے، اسے فتح کرنا ناممکن ہے، چنانچہ وہ "این الثریا من ید المتناول" (ثریا تک کس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے) کہکر لشکر سمیت واپس ہوگیا۔[1] سلطان محمود خلجی کی طرح نامی نے بھی قلعۂ اسیر کے نہایت بلند اور ناقابل تسخیر ہونے کا اعتراف اپنے اس کتبہ کے آغاز میں کیا ہے، جو اسیر گڈھ کی اس طویل و بلند چٹان پر کندہ ہے جس پر اس کے علاوہ اور بھی تین کتبے موجود ہیں۔ اس کتبہ کی عبارت یہ ہے:-

(۱) قلعۂ اسیر کہ با کرۂ اثیر ہمسر است و از زمانِ بنا تا امروز دستِ

(۲) تصرف از ان کوتاہ بود، بتاریخ ۱۰۰۹ھ موافق ۱۰۰۰ بدستِ

(۳) شہنشاہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ مفتوح شد

(۴) کرد از تائید لطفِ ایزدی فتح اسیر — شاہ ہفت اقلیم عالمگیر اکبر بادشاہ

(۵) نامیا داد الٰہی دادش ایں فتح عظیم — سالِ تاریخ الٰہی خواہ از داد الٰہ

(۶) قائلہ کاتبہ محمد معصوم بکری۔

اس کتبہ میں بھی قلعۂ اسیر کو بلندی میں کرۂ فلک کا ہمسر مان کر اس کے ناقابل تسخیر ہونے

---

[1] ظفر الوالہ جلد اول ص ۵۴۔ ذکر عینا عادل خاں فاروقی۔

اعتراف کیا گیا ہے، اور "واو والا" سے اکبر کے سنہ جلوس میں فتح اسیر کی تاریخ (۴۶ھ) نکالی گئی ہے۔

اس کتبہ کا تیسرا تاریخی مادہ "شاہ والا عازم لاہور شد" برہان پور سے اکبر کی روانگی کا سنہ ظاہر کرتا ہے۔ اکبر ۱۰۰۹ھ میں روانہ ہوا تھا لیکن مذکورہ عبارت کے عدد ۱۰۰۸ ہوتے ہیں، اس لیے نامی نے "یک عدد نامی فزود" کے الفاظ سے ایک عدد کے اضافہ کا اشارہ کرکے ۱۰۰۸ کو ۱۰۰۹ بنا دیا، اس کتبہ کے جس قطعہ میں اکبر کی مراجعت کا ذکر ہے وہ قطعہ نامی کے معمولی فرق کے ساتھ تین مختلف مقامات پر کندہ کیا ہے، جامع مسجد برہان پور کے جنوبی مینار پر، اسیر گڈھ کی اس چٹان پر جس پر نامی کا مذکورۂ بالا کتبہ بھی موجود ہے، اور اچھین کے قریب کالیادیہ گاؤں میں سپرا ندی کے کنارے کی ایک عمارت پر۔ جامع مسجد برہانپور کے مینار پر قطعۂ مذکور کی عبارت یہ ہے ؎

فتحِ خاندیس و دکن چوں کرد شاہ ۔۔۔ عازم ہندوستاں فی الفور شد

یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت ۔۔۔ شاہ والا عازم لاہور شد

یہی قطعہ اسیر گڈھ کی مذکورہ چٹان کے کتبہ میں اس فرق کے ساتھ موجود ہے کہ اس کے پہلے شعر کے مصرعِ اول میں خاندیس کے بجائے داندیس تحریر ہے، کیونکہ اکبر نے قلعۂ اسیر فتح کرنے کے بعد شہزادہ دانیال کو خاندیس کا صوبہ دار بنا کر اس کے نام پر خاندیس کا نام داندیس یعنی دانیال کا دیس رکھ دیا تھا۔[1] قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے اس کتبہ کی پوری عبارت درج ذیل ہے:۔

(۱) بندگانِ حضرت ظلِّ اللہ ملک دکن و

(۲) داندیس را بحضرت قدسی القاب

(۳) شاہزادۂ دانیال تفویض فرمودہ

---

[1] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۱۰۰

(۴) ۱۲ اردی بہشت ۱۰۰۹ھ موافق ۴۴

(۵) شوال ۱۰۰۹ھ عازم ہند شدند۔ مصرعہ

(۶) فتح خاندیس و دکن چوں کرد شاہ

(۷) عازم ہندوستان فی الفور شد

(۸) یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت

(۹) شاہِ والا عازم لاہور شد

کالیادیہ اُجّین سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے، جہاں برہانپور سے لاہور جاتے ہوئے شہنشاہ اکبر نے مقام کیا تھا، اسی گاؤں میں سپرا ندی کے کنارے ایک عمارت پر محمد معصوم نامی کا ایک کتبہ[1] نصب ہے، اس میں بھی وہی قطعہ موجود ہے، لیکن اس کے شعرِ اول کا مصرعِ دوم بالکل بدلا ہوا ہے، اس کتبہ کی پوری عبارت حسب ذیل ہے۔

(۱) بتاریخ ۴۵ھ الٰہی موافق ۱۰۰۹ھ حضرت خلافت پناہ

(۲) ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ملکِ دکن و خاندیس را

(۳) (بشاہزادۂ دانیال) تفویض نمودہ مراجعت نمودند۔ مصرعہ

(۴) فتح خاندیس و دکن چوں کرد شاہ   عازم نزہت گہِ معمور شد

(۵) یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت   شاہ والا عازم لاہور شد

اس کتبہ کی تیسری سطر کے ابتدائی الفاظ محو ہو گئے ہیں لیکن سیاقِ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں "بشاہزادۂ دانیال" کے سوا کوئی عبارت نہیں ہو سکتی، اسیر گڑھ کے اس مضمون کے کتبہ میں بھی اسی موقع پر یہی الفاظ آئے ہیں۔

---

[1] Epigraphia Indo Moslemica 1933-34

برہانپور و اسیرگڈھ کے کتبوں کے مذکورہ قطعہ کی عبارت "عازم ہندوستان فی الفور شد"

"فی الفور" کا لفظ معنی خیز ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا تشویشناک واقعہ پیش

آیا کہ اکبر فوری مراجعت کے لیے مجبور ہوگیا، وہ واقعہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی بغاوت کا تھا،

شہزادہ نے خیال کیا کہ شہنشاہ اکبر کئی ماہ سے سینکڑوں میل دور اسیرگڈھ کی مہم میں بری طرح

الجھا ہوا ہے، اور شہزادہ دانیال بھی کالے کوسوں دور احمد نگر کی جنگ میں مصروف ہے،

اس وقت شمالی ہند کا میدان بالکل خالی ہے، لہذا تخت سلطنت پر قبضہ کرنے کا یہی بہترین

موقع ہے، چنانچہ اس نے اودھ، بہار وغیرہ صوبوں پر قبضہ کرکے شاہی منصبداروں کو

معزول کیا، ان کی جاگیریں ضبط کیں، ہر جگہ اپنے حاکم مقرر کیے اور اپنے مصاحبوں کو منصب

خطاب اور جاگیریں دیکر اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا، اکبر کو جب برہان پور میں یہ خبر ملی تو وہ پریشانی

کے عالم میں فوراً روانہ ہوگیا، لیکن براہ راست آگرہ نہ جاکر لاہور گیا تاکہ شاہزادہ سے تصادم کا

موقع نہ آئے، اور وہ اسے جنگ کے بجائے حسن تدبیر سے راہ راست پر لاسکے، کتبہ کا لفظ "فی

الفور" اسی واقعہ کی غمازی کررہا ہے۔

برہان پور و اسیرگڈھ کے کتبوں کے مذکورہ قطعہ کے پہلے شعر سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے

کہ اگرچہ کشمیر سے راس کماری تک کا پورا ملک ہندوستان ہے لیکن اس زمانہ میں خاندیس و دکن کا

شمار ہندوستان میں نہیں ہوتا تھا، زمانۂ حال میں بھی اہل دکن ہندوستان سے شمالی ہند مراد لیتے

ہیں، فانی مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان تینوں کتبوں میں فتح دکن کا ذکر ہے، دکن ہمارے ملک کا بہت بڑا

حصہ ہے جس میں اس زمانہ میں کئی سلطنتیں موجود تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اکبر نے ان

سب کو فتح کر لیا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس کتبہ میں فتح دکن سے مراد صرف قلعۂ اسیر گڑھ ہے جس کی تصدیق نامی کے اس کتبہ سے ہوتی ہے، جو برہانپور کے شاہی قبرستان کے مشرقی روضہ کی مغربی دیوار پر کندہ ہے، یہ کتبہ دس سطروں پر مشتمل ہے جس کی ساتویں اور آٹھویں سطر میں قلعۂ اسیر و احمد نگر کی فتح کا ذکر ہے، ابتدائی چھ سطروں کا مضمون عبرت آموز ہے، کیونکہ کتبہ تحریر کرتے وقت نامی کے پیش نظر شاہی قبرستان کا وہی حسرتناک منظر تھا جس کی عکاسی شاعر ملت ڈاکٹر اقبال کے مندرجۂ ذیل اشعار[1] میں کی گئی ہے،

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا — دیدۂ عبرت خراج اشک گل گوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر — جنبش مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں — جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں
سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور — مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں کہ شان قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی

کتبہ کی پوری عبارت حسب ذیل ہے:-

۱۔ انظروا الی اہل القبور فاعتبروا یا اولی الابصار

۲۔ لما قیل غفلۃ الاحیاء الکرام حسرۃ الاموات

۳۔ قال عیسیٰ عم الدنیا قنطرۃ فاعبروہا ولا تعمروہا

---

[1] یہ اشعار اقبال کی نظم "گورستان" سے ماخوذ ہیں، جس میں گولکنڈہ کے شاہی قبرستان کا ذکر ہے۔

۴۔ فریاد رحیل از ہمہ کس می شنوی آواز درازپیش و پس می شنوی

۵۔ کروہ ہمہ شبگیر سر منزل دور توخفتہ بیرہ بانگ جرس می شنوی

۶۔ نامی ززمانہ بادبردار رو آر بآں جہاں سبکبار

توخفتہ براہ وکاروان تیز توسنگ خودی زراہ برخیز

۷۔ در حینے کہ حضرت ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ از فتح قلعۂ اسیر

۸۔ واحمدانگر واپرداختہ متوجہ لاہور شدند تحریر یافت ۱۰۰۹ھ

۹۔ العبد محمد معصوم بن سید صفائی ابآ والبکری مرقداً والترمذی اصلاً

۱۰۔ ابن سید شیر بن بابا حسن ابدال اُمّاً والقندھاری مشہداً والسبزواری موطناً۔

واضح رہے کہ اس کتبہ میں عوامی لہجہ کی پیروی کرتے ہوئے احمدنگر کو احمدانگر تحریر کیا گیا ہے، زمانۂ حال میں بھی جنوبی ہند کے عوام اسے امدانگر یا احمدانگر ہی کہتے ہیں، عبدالرحیم صاحب نے آر۔ بی وہائٹ ہیڈ کی کتاب[1] کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے جو سکے احمدنگر کی ٹکسال میں ڈھلے ہیں ان پر بھی "احمدانگر" درج ہے۔

آیئے اب کتبہ کے اس مضمون پر غور کریں جس میں اکبر کی آمد و مراجعت، بہادر خاں کی حاضری اور فتح اسیر گڈھ کا ذکر ہے۔ ابوالفضل نے اکبر کے ورود برہان پور کی تاریخ ۲۱ فروردین ۴۵ھ الٰہی تحریر کی ہے، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ۴۵ھ الٰہی ۴ رمضان المبارک ۱۰۰۸ھ سے شروع ہوا تھا[2]، چونکہ سنہ الٰہی کا آغاز یکم فروردین سے ہوتا ہے اس لیے ۲۱ فروردین ۴۵ھ الٰہی ۲۴ رمضان ۱۰۰۸ھ کے مطابق تھی، مینار کے اس کتبہ میں ۲۱ فروردین ۴۵ھ الٰہی[3] موجود ہے،

---

[1] Catalouge of Coins in Punjab mouseum Lahore (Oxford 1914 Page xxxvii)

[2] اکبرنامہ جلد ۳ طبع لکھنؤ ص ۷۳۰

لیکن اسلامی تاریخ رمضان ۱۰۰۸ھ" درج ہے۔ اس طرح اس میں دو فروگذاشتیں ہوگئی ہیں، یعنی کاتب رمضان کی تاریخ درج کرنا بھول گیا، اور ہجری سنہ ۱۰۰۸ کے بجائے ۱۰۰۹ تحریر کر دیا۔

اکبر کے ۱۰۰۸ھ میں وارد برہان پور ہونے کا ثبوت اکبرنامہ کے علاوہ نامی کے اس کتبہ سے[1] بھی ملتا ہے جو کالیادیہ میں سپرا ندی کے کنارے کی اسی عمارت پر نصب ہے جس پر موصوف کا وہ کتبہ بھی موجود ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ یہ کتبہ نامی نے اکبر کے حملہ آور لشکر کے ساتھ برہان پور آتے ہوئے کندہ کیا تھا۔ کتبہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے،

"بتاریخ ۴۴ھ سال الٰہی موافق ۱۰۰۸ھ کہ رایات ظفر آیات عازم تسخیر دکن بود اینجا جلوہ افتاد۔"

اس کے بعد ایک قطعہ اور آخر میں کاتب کا نام "محمد معصوم نامی البکری" مرقوم ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ جب شہنشاہ اکبر ۱۰۰۸ھ میں کالیادیہ سے روانہ ہوا تو ۴۴ھ الٰہی قریب الختم تھا، اس لیے برہان پور پہنچنے کے ۲۰ روز پہلے ہی ۴۵ھ الٰہی شروع ہو گیا، اور وہ ۲۱ فروردین ۴۵ھ الٰہی مطابق ۲۴ رمضان ۱۰۰۸ھ میں برہان پور پہنچا۔ بقول عبدالرحیم خان خاناں "برہانپور آگرہ سے ۲۷ منزل ہے۔[2]" اس لیے یہ مسافت ۲۷ روز میں طے ہوتی تھی، کالیادیہ اور برہانپور کی درمیانی فاصلہ اس سے کم ہے، اس لیے وہ تقریباً تین ہفتہ میں طے ہوا ہوگا، پھر چونکہ رمضان المبارک اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے، اس لیے اگر یہ مسافت پونے نو مہینے میں بھی طے ہوئی ہوگی تب بھی کالیادیہ سے روانگی کے وقت جو ہجری سنہ ۱۰۰۸ تھا وہ برہانپور پہنچنے کے بعد ۱۰۰۸ ہی رہا ہوگا نہ کہ ۱۰۰۹۔

(باقی)

---

[1] Epigraphia Indo Moslemica 1933-34

[2] دربار اکبری ص ۶۲۶

ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ دیوان غالب نظامی ایڈیشن

از جناب مبشر علی صدیقی ایم اے علیگ بدایوں

میری نظر سے ابھی حال میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی گرانقدر تصنیف "ڈاکٹر سید محمود" گذری، فاضل مصنف نے ۲۰۰ صفحات میں ڈاکٹر مرحوم کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے ہر ایک نقش سے ان کا خلوص، وابستگی اور عقیدت مندی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر سید محمود کے مستقبل کے سوانح نگاروں کو اس سے بہت مدد ملے گی۔ اس کتاب میں سید محمود کے معرکۃ الآرا مقدمہ کے متعلق جو انھوں نے دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن کے تیسرے ایڈیشن پر حسب فرمائش مولوی نظام الدین حسین نظامی مالک نظامی پریس بدایوں لکھا تھا، فاضل مصنف لکھتے ہیں:-

"ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں ایڈیشن میں بھی شامل ہے، اس پر اس مسعودؔ یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ اکرام وغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے، وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا، مگر وہ غالب کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی زیرِ تالیف کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے، اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالب کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے لیکن ان کے مجموعۂ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے یا ان کے خطوط میں وہاں سے محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے

یا ان کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں یا پھر ان کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی اور موقع بموقع جو اپنی وضعداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق ان کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کر کے مجھ سے سنا اور سن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی تم نے منتقل کرادی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح ہیں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا وہ صحیح تھا خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔"

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود کا یہ کوئی معمولی مضمون نہیں ہے، بلکہ اپنی جگہ پر ایک مستقل مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو دیوان غالب بدایوں ایڈیشن کے چالیس صفحات پر محیط ہے۔ بدایوں ایڈیشن اس لیے لکھنا پڑا ہے کیونکہ نظامی پریس لکھنؤ اور نظامی پریس کانپور نے بھی غالب کے متعدد ایڈیشن شائع کیے تھے، نظامی بدایونی نے یہ مقدمہ ڈاکٹر سید محمود سے بار بار تقاضے کر کے لکھوایا تھا، کیونکہ ڈاکٹر موصوف نے ان کے شائع کیے ہوئے دیوان غالب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، نیز اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے کہ پانچواں ایڈیشن شرح کلام غالب نہیں ہے، بلکہ مکمل اردو دیوان غالب ہے، جو مع متعدد دیباچوں اور ڈاکٹر سید محمود کے مقدمہ اور فٹ نوٹ میں مشکل اشعار کی شرح کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، نظامی پریس بدایوں نے دیوان غالب کے کل چھ ایڈیشن شائع کیے تھے، جن میں پاکٹ سائز ایڈیشن اور لائبریری ایڈیشن شامل ہیں، فاضل مصنف کے پیش نظر غالباً پانچواں ایڈیشن ہے، جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دیوان غالب کے علاوہ نظامی پریس بدایوں نے نکات غالب، مرثیۂ غالب،

از حالی اور روح کلام غالب مصنفہ مرزا عزیز بیگ مرزا جیسی معیاری کتابیں بھی شائع کی تھیں۔[1]
نظامی مرحوم اس مقدمہ کے متعلق دیوان غالب کے دیباچہ طبع ثالث (دیوان ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا
لیکن دیباچہ کی تاریخ تحریریہ ۸ دسمبر ۱۹۱۹ء ہے) میں لکھتے ہیں :-

"اس جدید الطبع نسخے میں ایک قابل قدر اضافہ ڈاکٹر سید محمود صاحب غازیپوری پی. ایچ. ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا وہ عالمانہ مقدمہ ہے جس کو انھوں نے خاکسار کی درخواست پر لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی.......... اس میں انھوں نے وہ نکات پیدا کیے ہیں جو آج تک مرزا غالب کے سوانح نگاروں یا ان کے کلام پر تنقید کرنے والوں کو نہ سوجھے تھے"

غالب کے اردو دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، اور ان کے اشعار کے ایک سے زیادہ معنی و مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمود کا مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مقدمہ کے بعد لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے :

لیکن اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنی میں پہچان لی تھی، اور جو غالب کے کلام کو ایسے حسن معنی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی شاعر اور سائنسداں سب ہی متحیر رہ جاتے ہیں، آہ عبدالرحمن، عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک و قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔" (مقدمہ از ڈاکٹر سید محمود۔ دیوان غالب نظامی ایڈیشن طبع سوم)

اس مقدمہ میں شعر و شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اور فارسی شعرا انوری، خاقانی، عرفی اور طالب کی غزلیات پر غالب کی فوقیت جتاتے ہوئے، انگریزی شعرا شیکسپیر اور شیلے کا ذکر کرتے ہوئے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کا نام بھی لیا گیا ہے، اور غالب کو اس کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے،

[1] راقم کا مضمون "دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن" مطبوعہ "جامعہ" بابت ماہ جون ۱۹۵۲ء ص ۳۱۶ تا ۳۲۴ ملاحظہ ہو

غالب کی فلسفیانہ شاعری پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے اور آخر میں غالب کو ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود کے اس نئے نظریہ پر راس مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر عبد اللطیف اور شیخ اکرام نے کافی نکتہ چینی کی کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مثال میں غالب کے جو اشعار پیش کیے ہیں، ان میں سے بیشتر ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے لکھے گئے تھے۔ لیکن ان کے خطوط اور دستنبو میں ان کی حب الوطنی اور انگریزوں کے جبر و استبداد کے متعلق واضح اشارات ملتے ہیں، وہ دہلی کی تباہی پر آنسو بہاتے ہیں، غدر کے بعد دہلی پر جو کچھ گذری اس کی موثر داستان انہی خطوط میں ملتی ہے۔ روزنامچہ کے علاوہ جو فارسی میں ہے، غالب نے اپنے اکثر خطوط میں دہلی کی حالت کا ذکر کیا ہے، میر مہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ نے دہلی کی حالت کے متعلق ان سے اکثر سوالات کیے اور جوابات ان کے خطوط کے مجموعہ میں درج ہیں۔ غالب دہلی کی بے رونقی کا ماتم کرتے ہیں اور شرفاء اور رئیسوں کی تباہی پر افسوس کرتے ہیں، لیکن یہ سارا ماتم شخصی ہے، اس میں قومی شان نہیں پائی جاتی، غالب دہلی کی بربادی کا ماتم اس لیے نہیں کرتے کہ مسلمان کی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا شہر، ان کے دوست، ان کے سرپرست تباہ و برباد ہو گئے، انھیں قوم پرست یا قومی شاعر کہنے سے پہلے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، اب دیکھیے خود ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمہ میں اس کے متعلق کیا لکھتے ہیں، اقتباس ذرا طویل ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے،

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے، اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا، میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب جو اس وقت اردو علم و ادب کی بہت کچھ خدمت انجام دے رہے ہیں، اور جن کی ادبی دلچسپیاں

کے باعث ان کی اعتراض کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "غالب کی اکثر تحریریات میرے پاس موجود ہیں جن میں انھوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرز حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرز حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے، اسی لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا کی عبارتیں ان کے مطبوعہ خطوط سے نقل کر دی ہیں، تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے، اور ان کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا، یہ سچ ہے کہ ہمارے شعراء کا طرز بیان شعرائے یورپ کے طرز بیان سے بالکل جداگانہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کے بیان سے ہماری شاعری پُر ہے، لیکن تصوف کے بڑے بڑے مسائل بھی بادہ و ساغر اور گل و بلبل ہی کے الفاظ میں حل کیے گئے ہیں، غالب نے کچھ تو اس زمانہ کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اردو شاعری کے خاص طرز بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو پھر یہ تعجب کا کیا مقام ہے، آج بھی جبکہ اردو شاعری کا طرز بیان بہت کچھ بدل چکا ہے، اقبال جیسا شہرۂ آفاق شاعر اپنے جذبات کو بہت کچھ الفاظ میں چھپاتا ہے، غالب کے فارسی دیوان میں بھی جا بجا ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔" (مقدمہ از ڈاکٹر محمود۔ دیوان غالب، نظامی اڈیشن طبع سوم ۱۹۲۰ء)

ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار میں حب الوطنی یا وطنیت کا جذبہ محسوس کیا، اس کا نمونہ بھی ملاحظہ کر لیجئے، اشعار مشہور ہی نہیں بلکہ ضرب المثل ہیں،

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۔۔۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۔۔۔ اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا ۔۔۔ جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج ۔۔۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔۔۔ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تاب لاتے ہی بنے گی غالب ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سلطنت دست بدست آئی ہے ۔۔۔ جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

لیکن اس قسم کے اشارے دوسرے شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں، مثلاً میر تقی میر کا مشہور شعر ہے:

دلی کے گلی کوچے اوراقِ مصور تھے ۔۔۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یا آتش محبوب کے مکان کی سرزمین کے متعلق کہتے ہیں:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے ۔۔۔ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

اس بحث سے قطع نظر، غالبیات میں ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ اپنا مقام رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے غالبیات کے ماہرین نے چونکہ دیوانِ غالب نظامی بدایونی اڈیشن کی طرف توجہ نہیں کی اس لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ مقدمہ بھی زیادہ مشہور نہ ہو سکا۔ اور جہاں تک اشعارِ غالب کے معنی و مطالب کا تعلق ہے، اس میں ہر شارح کو اپنے حسبِ مطلب و منشا معنی و مفہوم نظر آ جاتے ہیں۔ نظامی بدایونی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے جہاں جدید مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے دیوانِ غالب صحت و نفاست کے ساتھ اور اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ اپنے پریس سے شائع کیا وہاں ڈاکٹر سید محمود سے یہ معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھوا لیا۔ اور اس کے لیے اردو داں طبقہ

ن کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی زیر نظر کتاب بھی ڈاکٹر سید محمود کے سیاسی اور ...
ار نامے سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوگی، اور مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سید محمود
ن جولان گاہ سیاسی تھی نہ کہ ادبی، اس لیے غالب کے متعلق ان کی تمام رایوں سے اتفاق
نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا ادبی ذوق نہایت شستہ و پاکیزہ تھا، اور اس
کتاب کے فاضل مصنف میر کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ اور ہزاروں محققانہ علمی و ادبی و تنقیدی و تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، اس کے مضمون نگاروں میں ندوہ اور عربی تعلیم کے فضلاء کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے فضلاء و محققین بھی ہیں، جن کے تحقیقی مضامین، علمی مقالات و ادبی نگارشات سے اس کے صفحات مزین ہیں، یورپ کے مستشرقین نے ازراہ عناد اسلام و شارع اسلام و تاریخ اسلام پر جب جب بھی اعتراضات کیے تو سید صاحب اور دار المصنفین کے دوسرے رفقاء نے اسکے صفحات پر ان کے جوابات دیے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل ہیں:۔ سنہ ۱۹۳۰ء، سنہ ۱۹۳۵ء، سنہ ۱۹۳۶ء، سنہ ۱۹۳۷ء، سنہ ۳۸ء، سنہ ۳۹ء،
سنہ ۴۲ء، سنہ ۵۱ء، سنہ ۵۲ء، سنہ ۵۴ء، سنہ ۵۵ء، سنہ ۶۱ء، سنہ ۶۲ء، سنہ ۶۳ء۔

ان کی قیمتوں میں کافی رعایت کر دی گئی ہے، ان کے لیے دفتر سے خط و کتابت کریں۔ منیجر

وفیات

مولانا ظفر احمد عثمانی

۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو نامور عالم مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی نے ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حقیقی بھانجے اور ہم زلف تھے، اُن کی ولادت ۱۳۱۰ھ میں دیوبند میں ہوئی، اُن کے والد شیخ لطیف احمد عثمانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عزیز تھے، اُن کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، پھر حکیم الامت نے ان کو تھانہ بھون بلا لیا، یہاں فارسی کی تکمیل اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا تھانوی سے بھی مثنوی مولانا روم اور عربی کے چند اسباق پڑھے، یہاں سے مولانا نے اُن کو مدرسہ جامع العلوم کانپور بھیج دیا، پھر مظاہر العلوم سہارنپور جا کر تعلیم مکمل کی، ۱۳۲۸ھ میں یہیں مدرس مقرر ہوئے، وہ تھانہ بھون میں درس و افتا کی خدمت پر بھی مامور رہے، ۱۳۴۹ھ سے رنگون گئے، جہاں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد کا بھی مشغلہ جاری رکھا، مولانا ۱۳۵۴ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے استاذ دینیات مقرر ہوئے، یہاں ایک مدرسہ اشرف العلوم قائم کیا، اس میں بلا معاوضہ درس دیتے تھے، ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ٹنڈو الہ یار (سندھ) میں شیخ الحدیث ہوئے اور آخر تک اسی سے تعلق رہا،

درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، اردو عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے گہرے تعلقات تھے، معارف میں بھی ان کے عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے، حکیم الامت کے اکثر مواعظ قلمبند کیے، اُن کی تفسیر احکام القرآن کا خاص

لیا، ان کا سب سے اہم کارنامہ بیس جلدوں میں اعلاء السنن کی ترتیب و تالیف ہے، اس میں حنفی مذہب کی مؤید حدیثوں کو بالاستیعاب جمع کرکے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ حنفی مسالک کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، حواشی میں محدثین اور علمائے فن کی تحقیقات درج ہیں، اس کا مقدمہ مستقل کتاب کی صورت میں علیحدہ ایک جلد میں شائع ہوا ہے، یہ جلدیں حضرت تھانویؒ کی نگرانی میں دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق و تنقید سے مرتب کی گئی ہیں، حنفیہ نے جو مسائل قرآن سے مستنبط کئے ہیں، ان کو احکام القرآن کے نام سے جمع کرنا شروع کیا تھا، شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور کی فرمائش پر خود نوشت حالات نوادر النظر فی آثار الظفر کے نام سے لکھے، شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، اردو عربی دونوں میں داد سخن دیتے رہے،

وہ علوم ظاہر کی طرح علوم باطن سے بھی مالا مال تھے، حضرت مولانا تھانویؒ سے رشتۂ قرابت ہی کا نہیں بلکہ دینی و روحانی تعلق بھی تھا، انکی نماز جنازہ بھی پڑھائی تھی، کئی بار حج و زیارت کعبہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی،

مزاج میں تشدد و انتہا پسندی کے بجائے حق پسندی تھی، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، جائز اور حق بات کہنے میں جماعتی عصبیت مانع نہ ہوتی تھی، اس کا ثبوت ان کی معرکۃ الآرا تصنیف اعلاء السنن ہے، انکے بقول اس میں تقلید جامد کے بجائے تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی، وہاں صاف طور سے ضعف دلیل کا اعتراف کیا گیا ہے، اور دوسرے مذاہب کی قوت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے،

ان میں علم و سیاست دونوں کا اجتماع تھا، علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے تھے، تحریک پاکستان کے بڑے حامی تھے اور اس کے لئے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا، تحریک کے شباب کے زمانہ میں علیگڈھ بھی تشریف لائے تھے، یہاں ان کا بہت بڑا جلوس نکالا گیا تھا جس کی یاد یہاں کے لوگوں میں اب تک باقی ہے، مولینا علم و عمل اور اخلاق و عادات میں علمائے سلف کا نمونہ تھے، ایسے صاحب کمال اور بلند پایہ علماء مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ قوم و ملت اور علم و دین کے اس خادم کے درجات بلند کرے، اور اپنے دامن رحمت میں جگہ دے،

"ض"

حکیم محمد اسحاق مرحوم

اعظم گڈھ کے مشہور طبیب حاجی حافظ محمد اسحٰق گذشتہ مہینہ اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی عمر پچاسی سال سے زیادہ تھی، دہلی کے طبیہ کالج میں طب کی تعلیم پائی، حکیم محمد اجمل خاں کے شاگرد تھے، ان کے مطب میں ان کے نسخے لکھا کرتے تھے، دہلی سے آکر اعظم گڈھ میں طبابت شروع کی، اپنے فن میں بڑی مہارت حاصل کرلی تھی، مریضوں کا علاج دل سوزی سے کرتے، علاج اور نسخہ نویسی میں فن کی روایات اور وقار کا پورا لحاظ رکھتے، کسی مریض کو یہ شکایت نہیں ہوئی، کہ ان کی تشخیص غلط تھی، یا اُن کا نسخہ صحیح نہیں تھا، شہر کے ہندو مسلمان کے ہر طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، شروع سے عمر کے آخر لمحہ تک کانگریسی رہے، ہر زمانہ میں کھدّر پہننے کا اہتمام رکھا، ترک موالات، خلافت اور جمعیت العلماء کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت بھی ہوگئے تھے، دارالمصنفین سے بڑا قلبی لگاؤ رکھا، شروع میں یہاں ہفتہ میں تین روز آتے، اُن کی طبی مشغولیت بڑھی تو ہفتہ میں دو روز آنے لگے، آخر میں اپنی کبرسنی کے باوجود ہفتہ میں ایک روز ضرور آتے، اُن کا یہ معمول ساٹھ سال تک رہا، دارالمصنفین کی مسجد میں برسوں تراویح پڑھائی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، اور شاہ معین الدین احمد ندوی کو اُن کے طریقۂ علاج پر کامل اعتماد رہا، بولتے کم تھے، مگر اُن کی زبان سے جو کچھ نکلتا، اس میں وزن، وقار اور اخلاص ہوتا، ان کی وفات سے شہر ایک ممتاز طبیب، اور دارالمصنفین ایک بہت ہی مخلص، وضعدار اور کریم النفس قدرداں سے محروم ہوگیا، اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین،

ص - ع

تعزیتی خطوط

(۳)

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کی رحلت کے سلسلہ میں تعزیتی خطوط بکثرت موصول ہو رہے ہیں، ان میں سے کچھ اور یہاں پر درج کئے جاتے ہیں، اس غم میں شریک ہونے والوں کا شکریہ بھی معارف ادا کرتا ہے۔ (ض ۔ ع)

خطوط

بمبئی: برادر مکرم محب گرامی زید لطفہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ۲۰ جنوری کو لکھنؤ سے حجاز کے لئے روانہ ہوا۔۔۔۔۔۔ آخر فروری تک واپسی ہو سکے گی، آپ نے معارف میں شاہ صاحب پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے جس نے پڑھا، پسند کیا، آپ کی تحریروں میں آپ کا خاص مقام ہے، اور ہونا بھی چاہئے، کہ شاہ صاحب سے آپ کا تعلق ایسا ہی تھا، آپ کا ادبی اور انشائی خوبیاں، زور قلم اور جذبات کا وفور سب اس میں نمایاں ہیں، میں جہاں بھی رہوں گا، دار المصنفین میں دل لگا رہے گا۔ اور واپسی پر انشاء اللہ جو خدمت ہو سکے گی اس سے دریغ نہ کروں گا، اللہ تعالیٰ ہر طرح آپ کی مدد فرمائے، والسلام آپ کا

(ابو الحسن علی ندوی)

نئی دہلی: محبی! السلام علیکم

مجھے یہ معلوم کر کے بیحد افسوس ہوا کہ شاہ معین الدین احمد صاحب اب ہم میں نہیں رہے، شاہ صاحب

اپنے علم و تقویٰ کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت انجام دی، وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی، میں جب کبھی مرحوم سے ملا، ان کی شرافت، متانت، اور سنجیدگی سے متاثر ہوا، جب وہ علی گڑھ تشریف لاتے تھے، تو مجھے اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا، خدا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے، اُن کی وفات سے آپ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی، دعا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو دارالمصنفین کی خدمت کا حوصلہ عطا فرمائے، اور گذشتہ کی طرح آئندہ بھی آپ اس ادارہ کے استحکام و ترقی کے لئے کوشاں رہیں،

مخلص یوسف حسین خاں

حیدرآباد: ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ئ

مخدومی و محترمی: سلام مسنون

معارف میں حضرت شاہ معین الدین احمد ندوی کے رحلت کی خبر پڑھ کر جو صدمہ ہوا، وہ بیان سے باہر ہے، ایک عظیم عالم اور ایک عظیم ماہر فن ہم سے جدا ہوگیا، انا للہ و انا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے،

نیازمند: ہارون خاں شروانی

بمبئی برادرِ مکرم: سلام مسنون

آپ کے تاثرات معارف کے صفحات پر اس طرح اُبھر آئے ہیں، کہ ناممکن ہے کہ دارالمصنفین سے وابستگی رکھنے والے اور معارف کے قارئین اُسے پڑھ کر متاثر نہ ہوں، واقعی شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی اسی لائق تھی اور ماتم ان ہی الفاظ میں کیا جانا چاہئے تھا آپ نے حقِ رفاقت پوری طرح ادا کیا،

ایک خط میں آپ نے مولانا عبدالسلام قدوائی کے بارے میں لکھا ہے، عجب اتفاق کہ میرے

ذہن میں بھی پیدا ہوتا رہا تھا، میرا خیال ہے کہ مولانا دار المصنفین سے قریب ہو جائیں تو بہت اچھا ہو، آجکل کچھ تو حالات اور کچھ پرانی قدروں کے فقدان نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ اٹھتے جانے والوں کی جگہیں اس طرح پر نہیں ہو سکتی ہیں، جیسا کہ پہلے ممکن تھا، آپ لوگوں کو اس پر سوچنا چاہئے اور کچھ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینا چاہئے،

آپ نے ۲۴ر فروری کی تاریخ جلسے کے لئے مقرر کی ہے لیکن ۲۴ر سے ۲۷ر فروری تک کالی کٹ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، جس میں شرکت کا بہت پہلے وعدہ کر چکا تھا، اس لئے میرا تو اعظم گڈھ جانا نہ ہو سکے گا، منشی صاحب البتہ جا سکیں گے،

آپ کے سر پر جو بوجھ پڑا ہے، اس کا ہمیں اندازہ ہے لیکن اللہ پر بھروسا رکھیں، وہی ان دشواریوں کو آسان کرنے والا ہے،

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا، والسّلام۔

شہاب الدین دسنوی

ناظم آباد کراچی۔ مخلصی المحترم سید صاحب! سلام و تحیت مسنونہ،

ایک کارڈ پہلے لکھ چکا ہوں، پرسوں جنوری کا "معارف" ملا، بیحد و حساب شکریہ، شاہ صاحب کے سانحۂ ارتحال نے دو نیم کر دیا، ہمہ وقت شاہ صاحب کی معصوم اور دلآویز شخصیت سامنے رہتی ہے، آپ کے شذرات نے آنسوؤں کا سیلاب برپا کر دیا، ۳۲ء میں اعظم گڈھ بہ حیثیت صدر مدرس شبلی کالج پہنچا تو سیدی مولانا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سلام کی غرض سے حاضر ہوا، میرے عزیز و قریب پروفیسر نیاز احمد صدیقی صاحب اپنے کمرہ پر لے گئے، تو وہاں ایک فرشتہ صورت حسین و جمیل، سرخی مائل گورا رنگ، بھاری بھرکم، متوازن داڑھی، بیحد جاذب نظر شخصیت سے متعارف ہونے کی سعادت حاصل کی، یہ تھے شاہ معین الدین احمد ندوی

اعظم گڑھ یو پی کے مشرقی اضلاع میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، مگر بچہ مرحوم خیز علامہ شبلیؒ کے جانشین مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے اپنے دارالمصنفین کے قیام سے اعظم گڑھ کو سارے ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں روشناس کر دیا، کہنے کو تو شبلی منزل میں دارالمصنفین ایک مختصر سا ادارہ تھا، مگر بہت جلد اُس نے ہندوستان میں ایک امتیازی علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی، علامہ شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ۔ اقبال احمد خاں صاحب سہیل مرحوم ایڈوکیٹ، مرزا احسان احمد مرحوم ایڈوکیٹ سب کے سب عبقری و نابغۂ روزگار تھے، مگر سید صاحب نے اعظم گڑھ میں علم جس باب کا اضافہ کیا، وہ منفرد صفات کا حامل تھا، سید صاحبؒ نے دارالمصنفین کو جس درجۂ کمال تک پہنچایا اس کے اعتراف میں بخل کرنا یقیناً بے بہرہ ہونے کی دلیل ہے، سید صاحب اگرچہ حالات سے متاثر ہو کر بھوپال، پھر پاکستان آ گئے، تو دارالمصنفین کی طرف سے فکر دامنگیر ہوئی، لیکن دنیا نے دیکھ لیا، کہ سید صاحب کے تربیت یافتہ سید صباح الدین عبدالرحمن اور شاہ معین الدین ندوی نے جنھیں اب مرحوم کہتے ہوئے دل و دماغ جواب دینے لگتے ہیں، کس عمدگی سے اُن کے کام کو سنبھال لیا، دونوں نے بے مثال ایثار محنت اور اخلاص سے اس ادارہ کی شہرت کو نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔

شاہ صاحب حضرت شیخ عبدالحق نور اللہ مرقدہٗ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، اور اس خاندان کی خصوصیت سے مالا مال تھے، پیرزادہ بلکہ شہزادے تھے، متین و سنجیدہ اولوالعزم شگفتہ، دوستوں سے بے تکلف، بغیر تصنع کے فرق مراتب کا لحاظ کرنے والے، ادیب با تمیز نابغۂ روزگار، شہرت سے بے نیاز مجسم انکسار، سراپا اخلاص، نفاست پسند، غرضیکہ تمام انسانی صفات سے آراستہ، کیا لکھوں کہ کن کن خوبیوں سے اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو نوازا تھا،

میری اور ان کی رفاقت تقریباً اٹھارہ سال رہی، اور شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ ہم سب شام کی صحبت سے خوش وقت نہ ہوئے ہوں، اور رات کا کھانا ساتھ نہ کھایا ہو، اس طویل مدت میں کبھی ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا کہ ہم دونوں کسی مسئلہ میں اختلاف رائے بھی کرتے، یہ اُن کے اخلاق کی بلندی کی دلیل ہے،

دنیا کے کام بُرے بھلے چلتے رہیں گے، مگر شاہ صاحب اب اس دنیا میں نہ مل سکیں گے،

آپ نے جن تاثرات کی اپنے تذرات میں نشان دہی کی ہے، میں سمجھتا ہوں آپ اُس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں، جس کے اظہار کے لئے آپ میں مزید تاب وطاقت نہیں رہی، میں آپ کے اس کرب کو محسوس کرتا ہوں، کاش میں آپ کے پاس ہوتا، اور ہم دونوں رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال لیتے،

فی الوقت تو بس گریہ کناں ہوں، لیکن اس سے نہ آپ کو تسکین ہو سکتی ہے، اور نہ مجھ کو،

بس دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ آپ کی سب طرح مدد کرے، اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے، آمین،!

بہ سان حال سے سلام مسنون کہئے گا، والسّلام

اخلاص کیش آپ کا بشیر، ۴ر فروری ۷۵ء

کراچی ۱۷ر دسمبر ۷۴ء

برادر عزیز ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ خط ایک نہایت اندوہناک حادثہ کی خبر سُن کر لکھ رہا ہوں، آل انڈیا ریڈیو کے حوالہ سے یہاں کے اخبار میں شائع ہوا ہے کہ ۱۳ر دسمبر ۷۴ء کو شاہ معین الدین احمد صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا، اس خبر سے جتنا صدمہ ہوا بیان نہیں کر سکتا، آپ کا رنج وغم تو

مجھ سے کہیں زیادہ ہوگا، میں تو صرف ۹ سال مرحوم کے ساتھ رہا، آپ تو چالیس سال سے اُن کے رفیق رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے، اور آپ کو صبر جمیل کی توفیق دے، کیا بتاؤں یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، کہ شاہ صاحب نہیں رہے، اُن کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے، اب آپ اپنے کو تنہا محسوس کرتے ہوں گے، خداوند کریم آپ کی مدد فرمائے،

(۲)

کل معارف موصول ہوا شاہ صاحب مرحوم پر آپ کے شذرات پڑھ کر وہ صدمہ پھر تازہ ہوگیا، آپنے مرحوم کا تذکرہ ایسے جامع اور موثر انداز میں کیا ہے کہ اُن کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آگئی، اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس عطا فرمائے، اور آپ کو اس صدمہ کی برداشت کی طاقت بخشے، اب اُن کی جانشینی بھی آپ ہی کو کرنی ہوگی، اس دُہرے بار کو سنبھالنے میں خداوندکریم آپ کی مدد فرمائے، میں نے مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر ۱۷ر دسمبر کو ایک خط لکھا تھا، وہ خط آپ کو ملا کہ نہیں،

خاکسار محمد عزیر

جامعہ نگر، نئی دہلی (۹ر فروری ۷۵ء)

محترمی، سلام ورحمت

۱۴ر دسمبر کی صبح کو میں جرمنی کے لئے روانہ ہوا، اور وہاں سے حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا اب واپس ہوا ہوں،

یہاں آکر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی اندوہناک خبر سنی، کیا عرض کروں تھوڑی دیر کے لئے طبیعت پر کیا کچھ نہیں گذر گئی، میں کیسے اپنے رنج وغم کا اظہار کروں کہ

دل بیٹھنے لگتا ہے، شاہ صاحب کا مسکراتا ہوا نورانی چہرہ نگاہوں کے سامنے پھر پھر جاتا ہے، اور ان کے کمالات ذاتی ومشاغل کی یاد تازہ کر جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل سے اُن کے مراتب بلند فرمائیں، آمین،

ابھی ابھی نہ معلوم کتنوں کا ماتم کرنا اور سوگ منانا ہے، لیکن ان سب میں شاہ صاحب کی شخصیت ایسی نمایاں تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سانحہ ہی اب ایسا ہے جس میں وہ داخل تھی، شاہ صاحب کو دیکھتا تو جی چاہتا کہ دیکھا کروں کیسی جاذبیت تھی اُن کے ہر انداز میں کیسی کشش تھی اُن کی ہر ادا میں،

مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا، انھوں نے اپنی نگارشات سے جس طرح شبلی وسلیمان کی روایت کو زندہ اور دار المصنفین کی عظمت کو قائم رکھا وہ ہمارے علم وادب کی تاریخ کا ایک روشن باب بن گیا ہے،

احساسات وجذبات کے اس ہجوم میں آپ کی یاد مسلسل آرہی ہے، آپ اور ان کا کوئی چالیس برس کا ساتھ تھا، اتنی طویل رفاقت اور ایسی محبت، ایسا تعلق خاطر، یہ خود اپنی جگہ ایک روایت بن گئی ہے، اب جو ہر طرف افراتفری ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ لوگ اس رفاقت کو جو بے لوث تھی، بے غرض تھی، اور ایک نصب العین کی خاطر، بے سروسامانی اور نا آسودگی میں تھی، مثال دیں گے،

اس سانحۂ عظیم سے آپ پر جو گذری اور گذر رہی ہوگی، اس کا کچھ کچھ اندازہ کر سکتا ہوں معارف میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہی نہیں، بلکہ عظیم ہے، اور اس سے آپ کے اس رنج و اندوہ کی کسی قدر ترجمانی ہو جاتی ہے، جو آپ کے دل پر گذرا ہے، یہ رنج وہ رنج نہیں کہ تراوشِ قلم سے ہلکا ہو جائے، اس کی تلخی بڑھتی ہی رہتی ہے، اور زندگی کا جزو بن جاتی ہے لیکن صبرِ جمیل اور مشیتِ ایزدی پر رضا برضا رہنے کی توفیق رنج کی اس تلخی کو کسی اور

نشے میں بدل دیتی ہے اور یہ غم ایک مرحلے میں سرمایۂ حیات بن جاتا ہے، مجھ جیسے کم علم آدمی
حسن طبیعت کا کسی قدر شناسا ہوں، امید ہے کہ آپ اس سرمایۂ حیات سے محروم نہیں ہوں گے،

جی چاہتا ہے کہ جلد آپ سے ملاقات ہو، دیکھیں کب اور کہاں یہ ملاقات ہوتی ہے، معارف
کا جنوری کا شمارہ مجھے نہیں ملا، میں نے جامعہ لائبریری میں لے کر دیکھا ہے، میری عدم موجودگی میں [illegible] کرم
اُسے بھجوا دیجئے۔ ممنون ہوں گا اگر جامعہ میں تبصرہ کے بہانے حیات سلیمان کی ایک کاپی بھجوا دیا تو
پڑھ بھی لوں گا، اور تبصرہ بھی ہو جائے گا،

میں ایک گنہگار بندہ ہوں، پھر بھی آپ کی طمانیت قلب کے لئے دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ
آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں، دار المصنفین کے تمام کارکنوں کو، خاص طور سے اس مالی کو جس کا مجھے
نام نہیں یاد آرہا ہے، سلام عرض ہے، اور یہ بھی کہ میں بھی اُن کے غم میں شریک ہوں،

انشاء اللہ دار المصنفین زندہ اور اُس کی علمی روایات پائندہ رہیں گی،

آپ کا مخلص ضیاء الحسن فاروقی

باسمہ تعالیٰ - انعام نگر - نئی دہلی

مخلص مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج سامی بخیر۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر اخبارات
میں پڑھ چکے ہیں، اپنے قلب حزیں کے تاثرات، اخبار الجمعیۃ کے ذریعہ پیش کر دیئے تھے، مگر افسوس
ہے کہ بعض سخت خانگی مصروفیات کے سبب آپ کو اب تک تعزیتی خط نہ لکھ سکا،

بلاشبہ یہ حادثہ علمی و دینی دنیا کا المناک حادثہ ہے، شاہ صاحب کی ذات قدیم و
جدید اہل علم کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں
ملت کا درد اور قلم میں طاقت دی تھی اور دینی مسائل میں وہ بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار

۔۔ اندازہ کرتے تھے، کہ فلاں بھی اس کے وزن کو محسوس کرتے تھے، حضرت سید صاحب
۔۔ بسا وقات نے معاشرت کے معیار کو بڑی خوبی سے قائم رکھا،

ندوۃ العلماء کی کمیٹیوں میں اُن سے ملاقات ہوتی تھی، اور اُن کی محبت عنایت اور
خلاص و کرم سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا، گزشتہ سال حج کو جاتے ہوئے وہ جامعہ
یں اپنے دوست اور ہم وطن، جناب مولوی ارشاد حق مرحوم کے ساتھ ٹھہرے تھے، تو آخری
ملاقات کا موقع ملا تھا، احباب اور نیازمندوں کا ایک جم غفیر اُن کے گرد جمع تھا، افسوس نہ
ہماں رہے، نہ میزبان، ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

آپ کا اور اُن کا ہر وقت کا ساتھ تھا، وہ آپ کے رفیق بھی تھے، اور بزرگ بھی، میری
طرف سے اس حادثہ میں دلی تعزیت قبول فرمائیں،

اللہ تعالیٰ آپ صاحبان کو صبر و اجر سے نوازے، اور آں مرحوم کو اپنی آغوش رحمت
میں جگہ عطا فرمائے، والسّلام

نیازمند (قاضی) زین العابدین

ناظم دینیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی،

۲۰ر جمادی ۱۳۷۵ھ

درگاہ شریف رودولی ضلع بارہ بنکی، ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء

میرے کرم فرما، سلام علیک اور بہت سی دعائیں،

اللہ تعالیٰ دین و دنیا دونوں سے نوازے،

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں آپ سے تعزیت کروں، ان کی اچانک جدائی

سے دل کی ساری چولیں ہل گئی ہیں،

آپ کے دل کی کیفیت کا خوب اندازہ کر رہا ہوں۔ مگر سوا صبر کے چارہ ہی کیا ہے

ع : ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا،

بگیتی گر کسے پائندہ بودے

ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

مجھ گنہگار کے خاتمہ بالخیر ہونے کی دعائیں کرتے رہیے، (خدا حافظ)

آپ کا قدیم دعا گو و نیازمند،

فقیر حقیر۔ آفاق احمد عفی عنہٗ

کوٹھی سول لائن۔ علی گڑھ ۔ ۱۶ر دسمبر ۷۵ء

برادرم صباح الدین صاحب، سلام مسنون،

کن الفاظ میں شاہ صاحب کے بارہ میں آپ کو تعزیتی خط لکھوں اور کیسے ان کے لئے مرحوم کا لفظ استعمال کروں، قومی آواز نظر سے گزرا تو اس سانحۂ جانکاہ کی خبر ہوئی، ہاشم ہی نے آپ کو تسکین دینے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں، آپ پر جو گذری ہے اس کا حال بھی اخبار میں پڑھا، یہ سچ ہے کہ شاہ صاحب کی موت ایک المیہ ہے، دارالمصنفین کے لئے، علم و ادب کے لئے، شرافت و مروت کے لئے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی صداقت ہے کہ یہ سب سے بڑا المیہ آپ کی زندگی کا بھی ہے، ان کی موت سے آپ کی اور ڈاکٹر عبد الحفیظ انصاری صاحب کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا، شبلی منزل کے لئے آپ اور شاہ صاحب دونوں لازم و ملزوم تھے، یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ کسے کہے وہ ذہن میں کون اصل رہا تھا، ابھی تو سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کیسے صبر آئے گا، اور آپ کس طرح اس صدمۂ عظیم کو برداشت کر سکیں گے، یہ سانحہ کیسا اچانک اور

یکایک پیش آیا، بیمار ہوتے، صاحب فراش ہوتے تو ذہن آہستہ آہستہ اس سانحہ کے لئے تیار ہوجاتا، غم تو اس وقت بھی ہوتا، مگر اس میں یہ شدت نہ ہوتی، آج جبکہ شاہ صاحب ہمارے بیچ میں نہیں ہیں، اُن کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، ۱۹۴۹ء کی پہلی ملاقات سے لے کر ۱۹۷۲ء کی آخری ملاقات سے متعلق ایک ایک یاد ذہن پر مرتسم ہے، وہ کیسے بھلائے جاسکیں گے، خدا اُن کی مغفرت کرے، مگر اُن کے لئے دعاے مغفرت تو رسمی بات ہوئی، اُن کی زندگی کتنی پاک اور صاف تھی، اُن کی مغفرت نہ ہوگی تو کس کی ہوگی؟

مخلص: خلیل الرب

اخی الکریم فضیلۃ الشیخ عبدالسلام الندوی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپکے والا نامہ سے اخی الاکبر فضیلۃ الشیخ شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات کی اطلاع ملی،

اس خبر نے مجھے بہت غمگین اور بے چین کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون،

اللہ اُن کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اپنی وسیع جنت میں انھیں جگہ عطا فرمائے وہ بڑا سننے والا اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے،

اخی العزیز! اُن کی وفات پر میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیے، اور اُن کے فرزندوں خاندان والوں تمام دوستوں، بھائیوں، رفیقوں اور رشتہ داروں کو فرداً فرداً میری تعزیت پہنچائیے،

اللہ تعالیٰ اُن کے بعد اس ذمہ داری کے اٹھانے میں آپ لوگوں کی مدد فرمائے، جس کو اب تک وہ اٹھائے ہوئے تھے، وہ توفیق بخشے کہ علم اور طالبین علم کی خدمت میں لگے رہیں، اور اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے ہدایت بخش اصول کی ترویج میں اپنی زندگی اسی طرح صرف کرتے رہیں، اللہ آپ کی اعانت فرمائے،

رشاد عبداللہ البرولیسی، وزارت اعلام (انفارمیشن) مدینہ منورہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء

بمبئی، ۲۵ر دسمبر [illegible]

مکرمی صباح الدین صاحب! السلام علیکم،

ادھر کچھ دنوں سے لغت کی ترتیب کے سلسلہ میں بمبئی آگیا ہوں، اور انجمن اسلام میں مقیم ہوں، شاہ صاحب کے انتقال کی خبر سے بہت صدمہ ہوا، دہلی میں ندوہ کے طلبۂ قدیم کے تعزیتی اجتماع میں شریک تھا، اس زمانہ میں بعض کاموں کی وجہ سے دہلی جانا ہوا تھا، شاہ صاحب سے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میرا بڑا قریبی تعلق تھا، آج اُن کی پُر خلوص محبت اور دوستانہ عنایت یاد آتی ہے، تو دل تڑپ جاتا ہے، ابھی حسین حسان کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ یہ دوسرا صدمہ برداشت کرنا پڑا، شاہ صاحب نے علم دین کی خدمت میں ساری زندگی صرف کر دی، اُن کی خوش بختی پر رشک آتا ہے، اللہ اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور آپ لوگوں کو اسکی ہمت عطا فرمائے، کہ آپ اُن کے کاموں کو آگے بڑھائیں، فقط

حفیظ الدین ندوی

مراد آباد - ۱۵ر فروری

محترم و مکرم بندہ! السلام علیکم،

مزاج گرامی - کرم نامہ ملا، جزاکم اللہ! حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعی جتنا غم ذکر آپ کو ہوگا، وہ تھوڑا ہے، حق تعالیٰ شانہٗ غیب سے دستگیری فرمائیے، شاہ صاحب کے لئے دعاء ایصال اور آپ کے لئے قوت و ہمت، اور دار المصنفین کے لئے غیب سے کفالت اور اس کے انتظام کی دعائیں مانگ رہا ہوں، مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ہی اس وقت مناسب بزرگ ہیں، حق تعالیٰ اُن کو ذریعہ بنائیں، تشریف لے آئے ہوں تو میرا سلام فرما دیجئے گا، بندہ نے شاہ صاحب سے کبھی عرض کیا تھا کہ دار المصنفین کی مطبوعات کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہونا بہت ضروری ہے، اس کے ذریعہ نئے مارکٹ بھی حاصل ہوں گے،

اور مقصد ادارہ بھی پورا ہوگا ، اگر بمبئی کی طرح اجلاس کلکتہ اور مدراس میں کئے جائیں ، اور یہی مقصد یہ قرار دیا جائے اگر وہاں اُن کے تراجم و اشاعت کی شاخیں قائم ہوں ، کم از کم اہل علم ، بنگلہ ، گجراتی ، مرہٹی زبانوں کو لیا جائے ، اب آپ کی شہرت ہی تو ہوگی ، اسی میں اس مسئلہ کو دیکھیں سُنی سنٹرل اوقاف ، صوبائی اوقاف اور نظام ٹرسٹ سے بھی اس میں امداد حاصل کرنے کی ضرورت ہے ، دعوتی مقصد کے تحت کچھ مضامین معارف میں آتے رہیں ، جیسے بعض شاہ صاحب نے تحریر فرمائے تھے ، شاہ صاحب کا دسمبر میں کچھ نہ تھا ، اکتوبر یا نومبر ۲۴ء میں شاہ صاحب کا کوئی مضمون و شذرات ہوں ، تو ضرور بھجوا دیجئے ، بڑا کرم ہوگا ، اُن کی آخری تحریریں دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے ، شاہ صاحب کے میرے پاس ۸۴ خطوط ہیں ، اگر آپ فرمائیں تو انھیں ارسال کر دوں ، مولانا علی میاں صاحب نے تحریر فرمایا تھا ، کہ تعمیر حیات شاہ صاحب پر نمبر نکال رہا ہے ، کچھ خط اس میں دیدیئے جائیں ، اسحاق جلیس کو بھی میں نے لکھ دیا ہے ، اگر آپ طلب فرمائیں گے تو مقدم دارالمصنفین ہے ، ورنہ ندوہ روانہ کر دوں گا ، آپ کے جواب کا انتظار رہے گا ، شاہ صاحب پر آپ کا مضمون رُلا دینے والا ہے ، اس میں حضرت سید صاحبؒ کے مزار کی حاضری والے مضمون کی جھلک ہے ، جزاکم اللہ ،

شاہ صاحب کے سلسلے میں اور کیا تجاویز ہیں ، معارف کا ایک نمبر تو اُن پر نکلنا ہی چاہئے ، اپنے اور شاہ صاحب کے تعلق پر کچھ لکھ کر تعمیر حیات لکھنؤ کو بھیجا ہے ، المجیب پھلواری شریف سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے کوئی مضمون افغانستان میں اسلام کی دعوت کے کام پر تحریر فرمایا تھا ، اگر مل سکے تو بڑا کرم ہوگا آپ کی صحت اب کیسی ہے ، والسلام

خادم

افتخار فریدی

نجیب سلام، بمبئی، ۱۶ر دسمبر ۷۴ء

برادرم سلام مسنون

آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیسے لکھوں، مرحوم کی معصوم سی صورت رہ رہ کر سامنے آتی ہے، اور دل بھر آتا ہے، آپ پر جو کچھ گذر رہی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہے، مرحوم کی دائمی جدائی کے ساتھ ساتھ آپ کی تنہائی، بلکہ بے کسی کا خیال کچھ کم صدمہ کا باعث نہیں ہے، دار المصنفین یتیم ہو گیا، اب اسے تن تنہا آپ ہی کو سنبھالنا اور زندہ رکھنا ہوگا، اللہ آپ کو صبر دے، آپ کے لئے بڑا سانحہ ہے، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد سب بڑا سانحہ، آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے ہیں، میں آپ کو کیا سمجھاؤں، صبر اور ہمت سے کام لیجئے، اللہ آپ کی ہر لحاظ سے مدد فرمائے، والسلام، آپکے غم میں شریک، عبد الرزاق قریشی،

حیدر آباد، ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۴ء

رفیق محترم دام مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

دعوت اخبار دہلی میں مولانا شاہ معین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارتحال کی خبر سے بہت رنج وملال ہوا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم وفیضان رحمت سے سرفراز کرے، آپ کو معلوم ہے کہ میں ۴ر نومبر ۷۴ء کو حاضر ہوا تھا، شاہ صاحب مرحوم نے بہت ہی خاطر تواضع کی، ۵ر نومبر کو آپ لوگوں سے رخصت ہوا، اس وقت شاہ صاحب بہت اچھے تھے، مجھ سے فرمایا کہ میں جلد مکان جاؤں گا، اور نومبر گذار کر دسمبر میں دار المصنفین واپس ہونگا، غالباً مرحوم وطن جاکر علیل ہوئے، اور جلد آغوش رحمت باری تعالیٰ میں پہنچ گئے، اب دار المصنفین میں آپ تنہا ہیں، تمام کام کا بار آپ پر پڑ گیا، معارف کی اشاعت کتابوں کی تالیف وتصنیف اور طباعت، الغرض دار المصنفین جیسے بڑے ادارہ کا چلانا آپکے ذمہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ آپ کو قوت وطاقت وعافیت عطا فرمائے،

والسلام محمد طٰہٰ ندوی، (باقی)

مطبوعات جدیدہ

سیّد شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۲۲ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت :- ۳۵ ر

پتہ: انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد۔

حضرت شاہ امین الدین علی اعلیٰ دسویں صدی ہجری میں عادل شاہی دور میں سلطنت بیجاپور دکھن کے صاحب سلوک وارشاد بزرگ تھے، سلوک وتصوف میں ان کے کمالات کے ساتھ دکھنی زبان وادب میں ان کی خدمات بھی کم اہم نہیں ہیں، زیر نظر کتاب میں لائق مصنف کے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کے ایک حصہ کے علاوہ شاہ امین کے حالات زندگی اور ادبی ولسانی خدمات کی تفصیل ہے، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں بطور پس منظر بیجاپور میں مسلمانوں کی آمد، عادلشاہی حکومت کے قیام اور حضرت شاہ امین کے عہد کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حالات اختصار سے تحریر کئے گئے ہیں، دوسرے حصہ میں شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات، پیدائش و وفات کے سنین کی تحقیق اور خلفاء و مریدین کا ذکر ہے، اس میں حضرت امین کے والد شاہ برہان الدین جانم اور دادا میراں جی شمس العشاق کا مفصل ذکر ہے، تیسرے باب میں حضرت امین اور انکے خانوادہ کے طریقۂ رشد وہدایت کا جائزہ ہے، اسی میں تصوف کی بعض اصطلاحات کی نئی تعبیرات بھی ہیں، چوتھے باب میں شاہ امین کی منظوم اور نثری تصنیفات کے علاوہ ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جو غلطی سے ان کی طرف منسوب [illegible] کا ان کی جانب انتساب شک وشبہ سے

خالی نہیں ہے، اس ضمن میں ہر تصنیف سے متعلق مفید معلومات بھی دیے گئے ہیں، اور مختلف کتبخانو
میں انکے مخطوطات کی نشان دہی کی گئی ہے، آخری باب میں حضرت امین کی زبان پر تبصرہ ہے، اور اس
گجری کے اثرات، اس کی صرف و نحو، روزمرے، محاورے اور اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے، اس ک
میں کہیں کہیں بیجا طوالت اور غیر ضروری تفصیل سے کام لیا گیا ہے، حضرت شاہ امین کے نام ا
بعض دوسرے مباحث کو اس قدر پھیلا دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اور نفس
مسئلہ میں الجھاؤ بھی پیدا ہوگیا ہے، مصنف کو خود اعتراف ہے کہ شاہ امین پر بہت کم لکھا گ
اسی لیے ان کے حالات و کمالات کے بعض واقعات جو اس کتاب میں دیے گئے ہیں، مشکو
معلوم ہوتے ہیں، تاہم یہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے، اور اس سے حضرت ا
دکھنی زبان وادب اور اردو کی ابتدائی خدمات میں ان کے خانوادے کی مساعی سا
آجاتی ہیں۔

جب ایمان کی بہار آئی۔ مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع متوسط، کاغذ و
کتابت اعلیٰ صفحات ۲۷۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـہ پتہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ

معارف میں اس کے عربی ایڈیشن "اذا ہبت ریح الایمان" پر ریویو کیا جا چکا ہے، اب
کے ایما سے ان کے برادرزادہ مولوی سید محمد الحسنی نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، لائق
نے فاضل مصنف کی مشہور و مقبول اردو تصنیف "سیرت سید احمد شہید" کو سامنے رکھا
کیا ہے، اسلیے بقول مصنف "بہت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیا ہے"، اصل کتاب میں م
کی ایمانی استقامت، عقائد میں پختگی، مجاہدانہ کردار، اور انکے رفقاء کی دینی و ایمانی جرأت
دلکش اور پراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، شروع میں نامور مصنف کے بھانجے مولوی محمد
رضوانی بطور پس منظر سید صاحبؒ کا سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے، ابتدا میں ادب و انشا

مصنف کے پسوار قلم سے ایک ولولہ انگیز مقدمہ بھی ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف سید صاحب اور ان کی جماعت کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے، بلکہ اس سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی بھی پیدا ہوتی ہے۔

تجدید دین انسانی ۔ از جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۱۶۰ قیمت عہ پتے: (۱) اسلامک اسٹڈیز سرکل اوقاف بلڈنگ، بادشاہ چوک سرینگر کشمیر (۲) مکتبہ مسلم، ابربرشاہ، سرینگر۔

صوفی نذیر احمد صاحب ملک وملت کی اصلاح اور نوع انسانی کی خیرخواہی کا مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں قوم ووطن کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے اور دنیا کے اضطراب وانتشار کو دور کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے، اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام ساری کائنات کا دین وآئین ہے، تمام انبیاء نے اسی کی دعوت دی تھی، اور نبی آخرالزماں نے بھی اسی کی تجدید وتکمیل فرمائی ہے، اس لیے یہی وہ عالمگیر اور دائمی مذہب ہے جو دنیا کو موجودہ خلفشار اور بے چینی سے نکال کر امن وسکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں برہمن ازم ذات پات پر مبنی ایسا تسلطائی نظام ہے جو اخلاقی، روحانی اور معاشرتی انتشار کو جنم دیتا ہے، انھوں نے ملوکیت اور موجودہ اشتراکی اور جمہوری نظاموں کے نقائص اور تباہ کن اثرات بھی دکھلائے ہیں، اور اسلام کے پانچوں بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی حقیقت بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام ہی اصل اخوت ومساوات، انسانیت کی شیرازہ بندی اور فلاح وترقی کا اصل ضامن ہے، ان ارکان کے بارہ میں موجودہ مسلمانوں کی کجروی اور بے اعتدالی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے لیکن صوفی صاحب کی تحریروں میں ظاہری دلکشی کی کمی ہوتی ہے اور بعض خیالات بہت واضح بھی نہیں ہوتے کہیں کہیں غیر متعلق مباحث اور غیر ضروری طوالت میں بھی پڑ جاتے ہیں، اس سے قطع نظر جو کچھ لکھتے ہیں اس میں دلسوزی

اور اخلاص کے علاوہ غور و فکر کا عنصر شامل ہوتا ہے، یہ کتاب بھی اسی جذبہ سے لکھی گئی اور بڑی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل ہے۔

شب جائے کہ من بودم۔

مرتبہ جناب شورش کاشمیری تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ؎ پتہ: مطبوعات چٹان میکلوڈ روڈ، لاہور۔

پاکستان سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے وہاں کے ممتاز مصنف، مشہور شاعر، نامور صحافی اور دارالمصنفین کے بڑے قدردان جناب شورش کاشمیری نے اپنی کتابوں کا سٹ اور ہفتہ وار چٹان ارسال کیا، معارف میں تبصرہ کے لیے پہلے انکی کتابوں میں سے اس کتاب کا انتخاب کیا جا رہا ہے جسمیں انکے مقدس سفر حج کی روداد ہے، شورش صاحب نے ۱۹۶۸ء میں ہوائی جہاز سے حج کا سفر کیا، چودہ دنوں تک انکو بیت اللہ، بارگاہ رسالت اور ارض قرآن میں باریابی کی سعادت میسر آئی، ان کا دل خدا کی عظمت، اسلام کی محبت، رسول کی عقیدت اور قوم و ملت کے درد سے سرشار اور طبیعت بڑی حساس اور رنگین ہے، اسلیے حرمین اور مقدس مقامات میں حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی جسکی پوری تصویر اس کتاب میں ملتی ہے، ہر مقام پر انکو قرن اول کے واقعات یاد آئے ہیں جنکو پر اثر انداز میں لکھا ہے، عربوں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا بھی جائزہ لیا ہے، انکو مکہ میں مجبور اور زمزم اور جدہ میں زبان و اذان کے علاوہ ہر طرف یورپ کا مال نظر آیا، وہ یہودیوں کے قبلہ اول کے لے اٹھنے اور فصاد کے امت ہاشمی کا لہو نچوڑنے اور عربوں کی طیش کے ختم ہو جانے اور عیش میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کر کے بھی اشکبار ہوئے ہیں، آل سعود کے قبروں اور مقدس مقامات کے بارہ میں رویہ کا تذکرہ سخت لہجہ میں ذکر ہے، مگر جسکو شورش صاحب کی خوش عقیدگی کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے بعض اوقات شورش کے معاملات شخصیت و محبت کے جذبات کی تہ کے نیچے دکھے ہوئے ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غار حرا میں مسلسل ۴۰ سال تک تشریف لیجانے اور عبادت کرنے کا ذکر ہے حالانکہ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں وہاں جا کر عبادت کرنا شروع کیا تھا، یہ کتاب شورش صاحب کے مخصوص انشا پردازانہ انداز بیان کا نمونہ ہے، اسکے مطالعہ سے فاضل مرتب کی طرح ناظرین بھی اپنے کو کیفیات اور جذبات سے مخمور اور سرشار پائیں گے، کتاب کے نام میں بھی بڑی دل آویزی ہے جو دادطلب ہے، شروع میں مقدس مقامات کی تصویریں دی گئی ہیں،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی
کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :۔

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو
دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر
رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات
خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت
سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ
انہی کی مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی
کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آ گئے ہیں، قیمت :۔ للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی
ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے
ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :۔ ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ :۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

اور اخلاص کے علاوہ غور و فکر کا عنصر شامل ہوتا ہے، یہ کتاب بھی اسی جذبہ سے لکھی گئی اور بڑی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل ہے۔

شب جائے کہ من بودم۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۱۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپے۔ پتہ: مطبوعات چٹان میکلوڈ روڈ، لاہور،

پاکستان سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے وہاں کے ممتاز مصنف، مشہور شاعر، نامور صحافی اور دارالمصنفین کے بڑے قدردان جناب شورش کاشمیری نے اپنی کتابوں کا سٹ اور ہفتہ وار چٹان ارسال کیا، معارف میں تبصرہ کے لیے پہلے انکی کتابوں میں سے اس کتاب کا انتخاب کیا جا رہا ہے جس میں انکے مقدس سفر حج کی روداد ہے۔

شورش صاحب نے ۱۹۶۷ء میں ہوائی جہاز سے حج کا سفر کیا، چودہ دنوں تک انکو بیت اللہ، بارگاہ رسالت اور ارض قرآن میں باریابی کی سعادت میسر آئی، ان کا دل خدا کی عظمت، اسلام کی محبت، رسول کی عقیدت اور قوم و ملت کے درد سے سرشار اور طبیعت بڑی حساس اور رنگین ہے، اسلیے حرمین اور مقدس مقامات میں حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی جسکی پوری تصویر اس کتاب میں ملتی ہے، ہر مقام پر انکو قرن اول کے واقعات یاد آئے ہیں جنکو پُر اثر انداز میں لکھکر عربوں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا بھی جائزہ لیا ہے، انکو مکہ میں گھور اور زمزم اور جدہ میں زبان و اذان کے علاوہ ہر طرف یورپ کا مال نظر آیا، وہ یہودیوں کے قبلہ اول کے لے اڑنے اور نصاریٰ کے دست ہاشمی کا لہو نچوڑنے اور عربوں کی طیش کے ختم ہو جانے اور عیش میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کرکے بھی اشکبار ہوئے ہیں، آل سعود کے قبروں اور مقدس مقامات کے بارہ میں رویے کا تذکرہ سخت لہجہ میں ذکر ہے، گو یہ شکوہ شورش صاحب کی فرط عقیدت کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے، بعض اوقات شریعت کے مسائل عقیدت و محبت کے جذبات کی تہ کے نیچے دبکر رہ جاتے ہیں، مثلاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے غار حرا میں مسلسل ۴۰ سال تک تشریف لیجانے اور عبادت کرنے کا ذکر ہے، حالانکہ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں وہاں جا کر عبادت کرنا شروع کیا تھا، یہ کتاب شورش صاحب کے مخصوص انشاء پردازانہ انداز بیان کا نمونہ ہے، اسکے مطالعہ سے فاضل مرتب کی طرح قارئین بھی اپنے کو کیفیات اور جذبات سے مخمور اور سرشار پائیں گے، کتاب کے نام میں بھی بڑی دلآویزی ہے جو داد طلب ہے، شروع میں مقدس مقامات کی تصویریں دی گئی ہیں،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ؎ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح رحمت و خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"مینیجر"

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور معتقدوں کو بڑی بے تابی سے انتظار تھا، چھپ کر شائع ہو گئی۔ یہ محض جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ پر پھیلا ہوا تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی، علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدامِ مقابر و آثارِ حجاز وغیرہ کی بھی مفصل تاریخ آگئی ہے اور اس کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیامِ دارالمصنفین، سفرِ بھوپال، ہجرتِ پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انہوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفرِ یورپ، پھر سفرِ حجاز، پھر سفرِ افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے اسلوب و طرزِ استناد کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۷ روپئے۔

مؤلفہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۰۰

اپریل ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن	عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

مرتبین

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ⁂ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرا، و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۵ ماہ اپریل سنہ ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمن	۲۴۲-۲۴۴

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری،	"	۲۴۵-۲۶۸ ۲۶۶
اراضی ہند کی شرعی حیثیت (چند قدیم تحریریں)	جناب نور الحسن صاحب راشد (کاندھلوی)	۲۶۹-۲۹۲
جامع مسجد برہان پور کے کتبات (فتح اسیر گڈھ کا کتبہ)	جناب مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو و فارسی سیوا سدن کالج (برہان پور)	۲۹۳-۳۰۴
قبرص (سائپرس)	محمد اقبال ندوی ناظم کتب خانہ دارالمصنفین	۳۰۵

ادبیات

یاد اقبال	جناب پروفیسر سید حسن صاحب سترمہ پٹنہ	۳۱۳-۳۱۵
غزل	جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری	۳۱۵-
مطبوعات جدیدہ	" ض "	۳۱۷-۳۲۰

مجلس ادارت

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۳۔ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی لکھنؤ
۴۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ⁖ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مختصر تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت :- ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۵ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمن	۲۴۲-۲۴۴

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری،	"	۲۴۵-۲۶۸
اراضی ہند کی شرعی حیثیت (چند قدیم تحریریں)	جناب نور الحسن صاحب راشد (کاندھلوی)	۲۶۹-۲۹۲
جامع مسجد برہان پور کے کتبات (فتح اسیرگڈھ کا کتبہ)	جناب مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو و فارسی سیوا سدن کالج (برہان پور)	۲۹۳-۳۰۴
قبرص (سائپرس)	محمد اقبال ندوی ناظر کتب خانہ دارالمصنفین	۳۰۵

ادبیات

یاد اقبال	جناب پروفیسر سید حسن صاحب مترد پٹنہ	۳۱۳-۳۱۵
غزل	جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری	۳۱۵
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۱۶-۳۲۰

شذرات

۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب کے شاہ فیصل شہید کر دیئے گئے، اس حادثۂ جانکاہ سے اسلامی ممالک میں اندوہ و غم کا ایک بادل امنڈ پڑا کہ آہ! اسلام کا پاسبان، اسلامی حمیت و غیرت کا نگہبان، اسلامی مواخات و یگانگت کا حدی خوان نہیں رہا، اسلامی زندگی کی قوت پنہاں کو آشکار، مسلمانوں کے سینوں میں عزائم کو بیدار، اور اُن کی نگاہوں کو تلوار کرنے والا جاتا رہا۔

مدتوں کے بعد بڑی مشکل سے اسلامی دنیا میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا جس کے مقاصد جلیل تھے جس کی ادا میں دلفریبی اور نگاہیں دلنواز تھیں، اسلام کے اس بطلِ حریت نے صرف گیارہ سال حکومت کی، مگر سارے کارنامے اسلامی تاریخ کے زریں باب بن کر رہیں گے، سعودی عرب دنیا کے متمول ترین ملکوں کی صف میں کھڑا کیا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو سج دھج کر فردوس نگاہ بنا دیا، پٹرول کو جنگی اسلحہ سے زیادہ مہلک تسلیم کرا کر دنیا کی اہم طاقتوں کو بھی اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کیا، حاتم طائی کی افسانوی سخاوت کی شہرت کو ماند کر کے عرب کو اپنے مالی امداد سے سربلند اور سرخرو کیا، بچھڑے ہوئے مسلمان ملکوں کی دست گیری کر کے اُن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دلایا، اسلامی بینک، اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی خبر ایجنسی اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی روح رواں بن کر یہ جتلا دیا کہ توحید کی امانت سینے میں رکھنے والے اخوت کا بیان، اور محبت کی زبان بن کر ہر کو اسم محمد سے اجالا کر دیں، تو کتاب ملتِ بیضا کی شیرازہ بندی پھر سے ہو رہی تھی تو آیاتِ الٰہی کے اس نگہبان کو اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے اپنے پاس بلا لیا، جہاں سے روحِ محمدی سے کہتا ہوگا ؎ :- اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔

خبر ملی ہے کہ مسلم یونیورسٹی اس سال اپنے کانووکیشن میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ڈی لٹ کی ڈگری دے گی، اس ڈگری کا اعزاز بڑھانا چاہتی ہے یہ دونوں عظیم شخصیتیں ہر قسم کے اعزاز سے بالاتر ہیں کوئی طرۂ امتیاز اُن کی جانی پہچانی عظمت میں اضافہ تو نہ کر سکے گا لیکن ایک یونیورسٹی کی طرف سے اُن کی قدر دانی علم و ادب کے حلقہ میں ایک مژدہ ضرور ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی تقریباً بہتر سال سے اپنے قلم کا جوہر دکھا رہے ہیں، اس قلم کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ بچپن ہی میں یہ جوان ہو گیا، جوانی میں اژدھوں کا تریاق بن گیا اور بڑھاپے میں علم و فن کا خزانہ تسلیم کر لیا گیا، مولانا نے شہر کے ہنگاموں سے دور ایک قصبہ میں اپنے فن کا تخت طاؤس بچھایا، اسی پر جلوہ افروز ہو کر اپنے قلم کو صناع کار مینا نگار بنایا، جو قلم ان کو کورنش بجا لا کر زمین بوس ہوتا رہا، اُن کی صاحبقرانی علم و ادب کے میدان کار میں ہراول و قراول کی صفوں میں نمایاں طور پر دکھائی دیگی، جہاں للکار بھی ہے، یلغار بھی، تیر و خدنگ کا وار بھی، رجز بھی، چپقلش بھی، مردانہ بھی، اور شبخون بھی، انھوں نے فلسفی، ماہر نفسیات، مترجم، مقالہ نگار، نقاد، غم گسار صحافی، حق گذار دوست، وفا شعار مرید، معلم اخلاق اور مفسر قرآن بن کر اپنی تحریروں میں بڑی رنگا رنگی پیدا کی، جو کبھی تندی صہبا بن کر آبگینۂ دل کو پگھلاتی، کبھی موج خرام یار بنکر گل کترتی، کبھی قلب کو گرماتی، اور کبھی روح کو تڑپاتی رہی، اور جب ان پر خاتمہ بالخیر کا جذبہ طاری ہوا، تو تفسیر کلام پاک لکھنے بیٹھے، اور اس کو گنجینۂ تحقیق و معارف بنا دیا، جو اُن کے لئے توشۂ آخرت بھی ہے۔

اُن کی تحریروں کے ایجاز کی معجز طرازی، بلاغت کی سحر کاری، فصاحت کی تازگی، اور سلاست کی پرکاری، اردو ادب کے شہ پارے ہیں، اُن کے ترجموں میں جو لچک ہے، تنقید نگاری میں جو فن کاری اور طرز ادا میں جو طرّاری ہے، اسکے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں، انھوں نے اپنے معترضوں اور خصوصاً مذہب و دینی قدروں کے مخالفوں کے کلیجے کو اپنی نوک قلم سے چھلنی کیا، تو عقیدت و محبت کے اظہار میں بھی اپنی دلسوزی اور دلنوازی کے جلوے بھی دکھائے، اظہار حق میں اُن کی جرأت بے باکی بلکہ تیر باری کی بڑی شہرت ہوئی، انھوں نے اپنے چند چبھتے پھڑکتے جملوں، اور خصوصاً طرحدار سرخیوں سے جو کام لیا، بڑے بڑے مقالہ نگار اور کالم نویس اپنی لمبی تحریروں سے نہیں لے سکے، اُن کی تفسیر، دیدہ وری اور طباعی کے آبدار موتیوں سے برابر جھلملاتی رہیگی، وہ اپنی آخری عمر میں خوش ہو گئے کہ علم، ادب اور فن کا ایک گلزار لگا کر چلے، مسلم یونیورسٹی اُن کی قدر دانی نہ کرتی تو کس کی کرتی،

پروفیسر رشید احمد صدیقی معلوم نہیں کتنے اہل علم کے گلے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے ہار ڈال چکے ہیں، اب مسلم یونیورسٹی اپنی اعلیٰ ترین ڈگری کا ہار ان کو پہنا کر اپنی زینت بڑھائیگی، علی گڈھ یونیورسٹی اُن کو سنوار رہی ہے تو انھوں نے بھی اس کو سنوارا ہے، اُن کا قلم اسی کے ذکر میں وجد آفریں رقص کرتا ہوا لکھتا رہا ہے:- ہم اسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا،

وہ یہاں کے منصب پر انہی کے سبب ہوتے انا العلی گڑھ کی صباحت ہو رہی ہے، [illegible]
بلکہ سوات خط و خال سے اپنی رعنائی خیال کی جنت بنا رکھی ہے۔

وہ اس جنت میں زبان و ادب کے رضوان بن گئے، تو پہلے بیان بقول انہی کے، حق کی بیت عطا کرنے
بچے کا حوصلہ پایا، پھر سرسید کی روح کو جگا کر اپنے طلبہ کے لئے خضر راہ بنے، ان کی نظر میں وسعت فکر میں جستجو اور ادب
میں سوز و ساز پیدا کرنے کی کوشش کی اور حسین کے پیالہ و صہبا سے سرشار ہو کر اپنے قلم کی گل افشانی کی ابتدا کی تو طنزیات
و مضحکات کو طرز ادا کی شائستگی اور زندگی کی توانائی عطا کی جس سے ذہن کو معانی اور تخیل کو تجلی ملی، اپنے پیش رو اور ہم عصر
مزاح نویسوں اور طنز نگاروں سے الگ ہو کر انھوں نے اس صنف کو جتنی اونچی سطح پر لے جا کر چھوڑا ہے، اس سے آگے
شاید مدتوں کوئی اور نہ لے جا سکے گا، بچوں کے لئے کچھ لکھا تو ان کی ساری تحریریں الفت کی پھوار اور محبت کا آبشار
بن گئیں، دوستوں کی دائمی مفارقت پر آنسو بہانے بیٹھے تو اپنے ساتھ اپنے ناظرین کو بھی طوفان غم سے زیر و زبر کیا۔

تنقید و ادب کی انجمن میں شریک ہوئے تو خود ایک انجمن بن گئے، ان کی تحریریں دامان باغباں اور کف
گل فروش بنتی چلی گئیں، ماضی سے بیزار اور حال سے مایوس ہونے کے بجائے دونوں کی عظمت کا رس نچوڑا
اور آنے والی نسلوں کو اس رس کے نچوڑنے کا درس دیا، ان کا خیال ہے کہ جدید اردو میں ان تمام صالح
دلکشی و دقیق عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے، جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے، مگر اس دلکشی اور
جلوہ گری کے کارواں کے یوسف وہ خود بنے رہے، ان کی تحریروں میں روشن ضمیری، خیر اندیشی،
شرافت نفس، طہارت فکر اور ندرت بیان کے حسن کی جو چھٹکی ہوئی چاندنی ہے، وہ جدید اردو کی ایک با عظمت
روایت بن گئی ہے، علی گڑھ سے اعزازی ڈگری پانے میں ان سے زیادہ کون حق دار ہو سکتا تھا، یونیورسٹی
ان کی شام زندگی میں یہ ڈگری دے کر اپنا حق اور فرض تو ضرور ادا کر دے گی، مگر اس کے دینے میں
جو تاخیر ہوئی، اس کا الزام اس پر باقی رہے گا۔

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

ہندوستان کے معاشرتی حالات کے مطالعہ میں مہر و محبت کی فضا

البیرونی کی کتاب میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات کا بھی بہت ہی خوشگوار تجزیہ ہے، جس میں مہر و محبت اور افہام و تفہیم کی بڑی اچھی فضا ہے، ان ہی باتوں سے متاثر ہو کر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا جو دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے اور پھولے، اسکی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے جس کے لیے ہندوؤں کو اس کا ممنون ہونا چاہئے اور علمی دنیا بھی اسکی شکر گذار ہے، اسکی یہ خوبی لیاقت و صلاحیت سے زیادہ قیمتی ہے، (البیرونی یادگار جلد ایران سوسائٹی، کلکتہ، ص ۲۴۳) البیرونی نے ہندو مسلمانوں کی بیگانگی دور کرنے کی کوشش میں عربی جاننے والوں کیلئے سنسکرت سے اور سنسکرت جاننے والوں کیلئے عربی سے کتابیں بھی ترجمہ کیں جنکی ایک لمبی فہرست ہے، ان ہی میں پاتنجلی اور وراہ مہر کی کتاب لگھو جاتکم کے بھی ترجمے کئے، قانون مسعودی میں ہندوستان کے قیمتی پتھروں اور اس کے شہروں کے طول بلد اور عرض بلد کا بڑا فاضلانہ مطالعہ ہے، اس سے اس کے ملک کی محبت کا اظہار ہوتا ہے،

البیرونی نے ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی بھی بڑی حقیقت پسندانہ تصویر کھینچی ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے ہندوستان کی جو معاشرت تھی اس میں سے ابتک کیا چیزیں

اسی طرح سے باقی ہیں اور کن کن چیزوں میں تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔

البیرونی پہلے تو ہندوؤں پر عام تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ غیروں کو یعنی ناپاک سمجھتے ہیں، ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے۔ البیرونی نے اس کے مضرت رساں پہلوؤں کی طرف یہ لکھ کر اشارہ کیا ہے کہ اس طرح ہندوؤں میں کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونے کی رغبت اور ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے، اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں۔ (عربی ص ۱۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۱۶)

معاشرتی زندگی کے کچھ پہلو البیرونی نے ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی تفصیلات بیان کرنے میں یہ عجیب بات لکھ دی ہے کہ "یہ لوگ بال نہیں منڈاتے۔ ان کی اصلی حالت گرمی کی شدت سے ننگے رہنے کی ہے، بال اس لیے نہیں منڈاتے کہ کھلا رہنے سے سر پر گرمی نہ چڑھ جائے، داڑھی کی حفاظت کے لیے اس کی چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں"۔ بال نہ منڈانے یا داڑھی کی چوٹیاں گوندھنے کا رواج عام رہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں باتیں کسی مذہبی گروہ میں پائی جاتی ہوں، پھر معلوم نہیں کس گروہ کے متعلق اس نے یہ لکھا ہے کہ ننگے رہنے پر فخر کرنے کے لیے ناخن بڑھاتے رہتے ہیں، اس لیے کہ ناخن کے ساتھ محنت طلب کام نہیں ہو سکتا، اور اس لیے بھی کہ اس سے سر کھجانے اور جوں مارنے میں آرام ملتا ہے۔ (عربی ص ۸۹ اور اردو ترجمہ جلد اص ۱۴۴) آج یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ کون سا گروہ ننگا رہنا پسند کرتا تھا، جس کے لیے وہ ناخن بڑھا لیا کرتے تھے۔

ہندوؤں کے کھانے پینے کے آداب ہندوؤں کے کھانے پینے کے آداب کے متعلق بھی معلومات ہیں، لکھتا ہے کہ "ہندو گوبر کے دسترخوان پر اکیلے بیٹھ کر کھاتے ہیں"۔ گوبر کے دسترخوان

سے مراد شاید چوکے کے گوبر سے لپائی ہو، جواب تک کہیں کہیں ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد وہ تحریر کرتا ہے کہ جو کھانا بچ جاتا ہے اس کو دوسری دفعہ استعمال نہیں کرتے اور جس برتن میں کھاتے ہیں، اگر وہ مٹی کا ہو تو اس کو پھینک دیتے ہیں، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۰) یہ عادت تو اب تک جاری ہے۔ پان کھانے کی عادت بھی ہندوستان میں بڑی پرانی ہے، اسلیے لکھتا ہے کہ پان چونہ کے ساتھ کھا کر اور سپاری چبا کر دانتوں کو سرخ کرتے ہیں، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۰) اس کے بعد البیرونی لکھتا ہے، نہار منہ شراب پیتے ہیں، اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں، گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں، اس کا گوشت نہیں کھاتے، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۱) گائے کا پیشاب پینے کا تو شاید عام رواج نہ رہا ہو، بعض مذہبی مراسم کے موقع پر شاید پیا جاتا ہو، جگر کے مریض بھی اس کو دوا کے طور پر اکثر استعمال کرتے ہیں۔

ہندوؤں کا لباس | لباس کے متعلق لکھتا ہے "عمامہ کو سروال یعنی دھوتی بناتے ہیں، جو شخص لباس میں اختصار کرتا ہے وہ دو انگل کی دھجی پر قناعت کرتا ہے جس کو وہ دو دھاگے سے ستر پر باندھ لیتا ہے۔ (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۰) اس آخری ٹکڑے سے لنگوٹی کی طرف اشارہ ہے جو کہیں کہیں اب تک استعمال ہوتی ہے، اس کے بعد جس لباس کی تفصیل ہے اس کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ ایسا لباس اب کسی طبقہ میں نہیں دکھائی دیتا، یا شاید اس زمانہ میں سرد پہاڑی علاقوں میں پہنا جاتا ہو، روئی کے دگلے تو ابھی تک پہنے جاتے ہیں، البیرونی لکھتا ہے "جو زیادتی کرتا ہے وہ ایسے سراویل (لہنگا) پہنتا ہے جس میں اتنی روئی بھری رہتی ہے جو کئی لحاف کے لیے کافی ہو، پھر وہ ایسا جھول پہنتا جس کے چاک ایسے بند ہوتے ہیں کہ ان سے دونوں پاؤں باہر نہیں نکلتے اور ان کی گھنڈی پیچھے کی طرف ہوتی ہے، اس کے بعد جن ملبوسات کا ذکر ہے وہ واضح ہیں، صدری (سینہ

کا لباس) سراویل (پائجامہ) سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں، ان کی بندش گھنڈیوں کے ساتھ
پیٹھ کی طرف ہوتی ہے، کرتے کے دامنوں میں دائیں اور بائیں چاک رکھتے ہیں، جوتا بہت
تنگ ہوتا ہے کہ اس کو پنڈلیوں کی طرف سے قدم کی طرف موڑ کر پہنا جاتا ہے (عربی ص
اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۳۹-۲۴۰)، اس کے بعد ہے کہ مرد عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں، [illegible]
کرتے ہیں، کان میں آویزے، ہاتھوں میں کنگن، کنگلیوں اور پاؤں کی انگلیوں میں
سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۱-۲۴۲) عورتوں
جیسا لباس سے مراد غالباً رنگین دھوتیاں ہوں، مردوں کا آویزے اور کنگن پہننا تو بعض
جگہوں پر غالباً انیسویں صدی تک بھی جاری رہا، اور اب بھی کہیں کہیں پہنے جاتے ہیں،
ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تو اب بھی پہنی جاتی ہیں، البتہ پاؤں کی انگلیوں
میں اب مرد انگوٹھیاں نہیں پہنتے۔

ہندو عورتوں کی اہمیت | البیرونی کے اس بیان سے کہ "مرد عورتوں سے انتظام اور جو امر
پیش آجاتے اس میں مشورہ لیتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۱) ظاہر ہوتا ہے
کہ اس زمانہ میں بھی معاشرہ میں عورتوں کی کافی اہمیت تھی، البتہ البیرونی کی یہ بات محل نظر
ہے کہ وہ بیٹوں میں چھوٹے کو ترجیح دیتے ہیں خصوصاً پورب کے علاقہ میں، یہ سمجھ کر کہ
بڑا لڑکا باپ کی شہوت غالبہ سے پیدا ہوتا ہے، اور چھوٹے کا وجود ارادے، فکر
اور سکون سے حاصل ہوتا ہے (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۲) کیونکہ ہندوستان
کی معاشرت میں شروع سے اب تک بڑے لڑکے ہی کی اہمیت زیادہ رہی ہے اور حکمران
خاندانوں میں وہی اصلی وارث سمجھا جاتا ہے۔

معاشرتی جزئیات کا معاملہ | البیرونی کا مشاہدہ بڑا گہرا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نظر

رکھتا، جیسا کہ لکھتا ہے کہ ہندو مصافحہ میں ہاتھ کو پشت دست کی طرف سے پکڑتے ہیں، گھر کے اندر آنے کے لیے اجازت نہیں طلب کرتے مگر باہر اجازت کے بغیر نہیں جاتے، مجلسوں میں چار زانو بیٹھتے ہیں، بڑوں کے ادب کے بغیر تھوک پھینکتے رہتے ہیں، ان کے سامنے جوں مارتے رہتے ہیں …….. چھینک کو منحوس سمجھتے ہیں، جولاہے کو ناپاک سمجھتے ہیں لیکن حجام کو اور اس شخص کو جو مرتے ہوئے جانوروں کو اجرت لے کر ڈبا کے یا جلا کے مار ڈالتا ہے پاک سمجھتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اص ۲۴۲) اس اقتباس میں جولاہے کو ناپاک سمجھنے کی روایت تو کچھ مشکوک معلوم ہوتی ہے،

ابتدائی نوشت وخواند کے طریقے لڑکے اس زمانہ میں تختی پر جس طرح لکھتے اس کا رواج ابتک جاری ہے، البیرونی دلچسپ طریقہ پر لکھتا ہے کہ لڑکوں کے لیے مکتب کی تختیوں کو سیاہ رنگواتے ہیں، اس کے عرض میں نہیں بلکہ طول میں سفیدی سے بائیں طرف سے دائیں طرف لکھواتے ہیں، گویا ذیل کا شعر شاعر نے ان ہی کی شان میں کہا ہے،

"کوئی لکھنے والا ایسا بھی ہے جس کا کاغذ کوئلہ کی طرح سیاہ ہے، اس میں اس کا قلم سفیدی سے لکھتا ہے، گویا وہ رات میں روز روشن کو لکھتا ہے، وہ اس کو تانا ہو بنتا نہیں ہے (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اص ۲۴۳)

البیرونی کا یہ بیان بھی موجودہ ذوق سے کچھ مختلف ہے۔

کتاب کا نام آخر میں خاتمے پر لکھتے ہیں، ابتدائے کتاب میں شروع میں نہیں لکھتے، اپنی زبان کے اسماء کو مؤنث بنا کر اس میں عظمت پیدا کرتے ہیں، جس طرح اہل عرب تصغیر بنا کر عظمت پیدا کرتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اص ۲۴۳)

ہندوؤں کے کھیل وہ کھیلوں میں چوسر اور شطرنج کا ذکر کرتا ہے، چوسر کے متعلق لکھتا ہے کہ

دو آدمی کھیلتے ہیں، لیکن پانسہ دونوں کے درمیان تیسرا شخص پھینکتا ہے، اس نے [illegible] جیسے شطرنج کھیلنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ آج سے بالکل ہی مختلف ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج چار آدمی مل کر دو پانسے کے ذریعہ کھیلتے تھے جو بساط کے گرد مربع شکل میں بیٹھ جاتے تھے، اور باری باری اپنے درمیان دونوں پانسے پھینکا کرتے ہیں، پانسے کے عدد سے مہرہ چلایا جاتا تھا ہر مہرہ کے لیے علٰحدہ علٰحدہ عدد مقرر تھے، (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ ج ۱ ص ۲۴۴-۲۴۳)

ہندوؤں کا نفسیاتی مطالعہ البیرونی ہندوؤں کا نفسیاتی مطالعہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ان کی فطرت میں طبیعت کی مخالفت داخل ہے، اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ ہم نے کسی ہندو لڑکے کو جو اسلامی ملکوں میں نیا آیا ہو اور اس ملک والوں کے طریقہ کا مشاق نہ ہو، ایسا نہیں پایا جو اپنے آقا کے سامنے ہمیشہ کھڑاؤں اس کے اصلی وضع کے خلاف یعنی دائیں پاؤں والی کو بائیں کے لیے نہ رکھتا ہو، کپڑا الٹا نہ کرتا ہو، فرش الٹا نہ بچھاتا ہو، اور اسی قسم کی بہتری باتیں ہیں، اس کا سبب یہی ہے کہ اس کی فطرت میں طبیعت کی مخالفت ہو (عربی ص ۹۱ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۶) یہ ضروری نہیں کہ البیرونی کے اس نتیجہ کو صحیح سمجھا جائے۔

ہندوؤں کے کیمیا بنانے اور جھاڑ پھونک کا طریقہ البیرونی نے اپنی کتاب کے ۱۷ویں باب میں اس زمانہ کے ہندوؤں کے کیمیا بنانے، رسائن کے فن اور جھاڑ پھونک سے متعلق معلومات فراہم کیے ہیں، گو اس نے ان علوم کو اہمیت نہیں دی ہے اور ان کی بنیاد جہالت پر قرار دی ہے، پھر بھی اس سلسلہ میں بہت سے دلچسپ واقعات قلم بند کیے ہیں، کیمیا کو وہ جادو تو نہیں بلکہ خبط کہتا ہے، لکھتا ہے کہ اس فن کے جاننے والے اس کو چھپانے کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں، اس کو ایک بے بنیاد علم سمجھنے کے باوجود اس نے اس مشہور افسانہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیمیا کے اثر سے ایک چرواہے کا ایک کتا اور ایک سادھو سونا ہو گیا

رسائن کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے جس کو کھا کر مایوس مریض شفایاب اور بوڑھے بالکل جوان ہو جاتے ہیں، اور ان کی عمر بہت طویل ہو جاتی ہے، البیرونی اس فن کی تفصیل لکھ کر یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ رسائن کی حرص میں جاہل راجہ معصوم بچوں کو بے تکلف آگ میں جھونکوا دیتے تھے (عربی ص ۹۴ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۵۶)

جھاڑ پھونک کے سلسلہ میں رقم طراز ہے کہ جھاڑ زیادہ تر اس شخص کے لیے ہوتی ہے جس کو سانپ بچھو نے کاٹا ہو، اس بارہ میں یہ لوگ اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خود ہم سے کہا کہ اس نے ایک مردے کو جو سانپ کے کاٹنے سے مرا تھا، دیکھا کہ مرنے کے بعد اسکو جھاڑا گیا اور وہ جی اٹھا، اور دنیا میں زندہ اور دوسروں کی طرح چلتا پھرتا رہا (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۵۸)۔ البیرونی کو خود جھاڑ پھونک پر اعتقاد نہیں تھا لیکن اس کے بعض واقعات کی تفصیل مزے لے لے کر لکھی ہے۔

برہمن کی زندگی کا گہرا مطالعہ البیرونی کے یہ تمام بیانات ہندوؤں کے عوام سے متعلق ہیں، اسکے بعد ہندوؤں کی چاروں ذات برہمن، چھتری، ویش اور شودر کی معاشرتی زندگی کی بھی علیحدہ علیحدہ تصویریں کھینچی ہیں، برہمن کی زندگی کا مطالعہ بشن پران کی مدد سے کیا ہے، اور اس کے مختلف دور کی تفصیلات بڑے احترام سے لکھی ہیں، جو اجمالاً یہ ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ برہمن کی معاشرت ایک مذہبی معاشرت تھی یعنی ان کی معاشرت ان کے مذہب سے الگ نہ تھی،

کتاب کے باب ۶۳ میں ہے کہ برہمن کی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ پہلا آٹھ سال کی عمر پر ختم ہوتا ہے، جب وہ آٹھ سال کا ہوتا ہے تو برہمن جمع ہو کر اس کی کمر میں زنار باندھتے ہیں، اور گلے میں ایک جوڑا جنجوی یعنی جنیو پہناتے ہیں، جو بٹے ہوئے دھاگے کا ہوتا ہے، ایک جنیو بائیں کاندھے پر رکھ کر دائیں بغل کے نیچے لے آیا جاتا ہے، یہ کپڑے کا بنا ہوا ہوتا ہے جنیو

پہنانے وقت ایک کنگنا جس بچے کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے جب کہ وہ بچہ رہتا ہے [illegible] اس کی ایک انگوٹھی اس کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہنائی جاتی ہے، یہ انگوٹھی [illegible] اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے جو کچھ دیا جائے گا اس میں برکت ہوگی، جنیو کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، برہمن کسی حال میں بھی اس کو جدا نہیں کرسکتا، اگر کبھی اتارے تو گنہگار ہو جاتا ہے، اور سو برت رکھے یا صدقے کا کفارہ ادا کیے بغیر پاک نہیں ہوسکتا وہ اپنی عمر کے ۲۵ ویں سال اور بعض کے نزدیک ۴۸ سال تک زہد اختیار کرنے کے لیے بڑی محنت و ریاضت کرتا ہے، جا بجا گھومتا رہتا ہے، دن رات کسی گرو کی خدمت میں اس کے لیے رہنا ضروری ہے، بید اور اس کی تفسیر کو سیکھنا بھی اس کے لیے لازمی ہے، روزانہ تین بار غسل کرنے کا عادی ہوتا ہے، صبح شام دونوں وقت آگ کی پوجا کرتا ہے، پھر استاد کے پاس جا کر سربسجود ہوتا ہے، ایک دن بیچ کرکے روزے رکھتا ہے، گوشت مطلق نہیں کھاتا ہے، گرو کے گھر پر جب رہتا ہے تو وہاں سے صرف ایک مرتبہ دوپہر یا شام کے وقت پانچ گھروں سے بھیک مانگنے باہر نکلتا ہے، جو کچھ ملتا ہے پہلے اس کو استاد کے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے، وہ کچھ تو اپنے لیے پسند کر لیتا ہے، بقیہ اس کو دیدیتا ہے، آگ کی پوجا کے لیے پلاس اور دب کے درختوں کی لکڑی فراہم کرتا رہتا ہے، ۲۵ سال کے بعد وہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے، جو پچاس اور بعض کے نزدیک ستر سال تک باقی رہتا ہے، اس دور میں اسکو اپنے گرو سے بیاہ کرنے کی اجازت ملتی ہے، جس کے بعد وہ گھرستی کی زندگی اختیار کرتا ہے اس کو بیاہ کرنے کی اجازت اس شرط پر ملتی ہے کہ اس کی نیت اولاد پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو، اس کے لیے ایسی عورت سے بیاہ کرنا جائز نہیں جس کی عمر بارہ برس سے

زیادہ یہ اسی دور میں وہ اپنی معاش کے لیے برہمچاری بچوں کو تعلیم دیتا ہے لیکن تعلیم دینے کے سلسلے میں اس کے لیے اجرت لینا جائز نہیں، وہ نذرانے لے سکتا ہے، وہ بہت بنکر بادشاہوں اور رئیسوں سے بھی نذرانے قبول کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے مانگنے میں اسکی طرف سے اصرار اور دینے والے کے لیے جبر نہ ہو، وہ مجبوری کی حالت میں کپڑے یا سپاری کی تجارت بھی کر سکتا ہے لیکن تجارت میں دغا اور فریب بھی کرنا پڑتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی تجارت کسی ویش کے ذریعہ کرائے۔ اس کے لیے مویشی اور جانور رکھنا یا سود سے فائدہ اٹھانا حرام ہے، نیل کا رنگ اس کے لیے ناپاک ہے، اگر اس کے بدن پر لگ جائے تو اس کے لیے غسل کرنا واجب ہے، اس کی زندگی کا تیسرا دور پچاس برس سے پچہتر برس یا بعض کے نزدیک نوے برس تک رہتا۔ اس دور میں وہ دنیا ترک کر دیتا ہے، بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے، چھت کے بجائے آسمان کے نیچے رہتا ہے، درخت کے پتوں سے صرف ستر چھپائے رکھتا ہے، زمین پر بستر کے بغیر سوتا ہے، اور صرف پھل، ساگ پات اور ان کی جڑیں کھاتا ہے، بال بڑھا لیتا ہے اور اس میں تیل نہیں لگاتا۔

اس کی زندگی کا چوتھا دور آخری دور ہوتا ہے، اس دور میں وہ سرخ کپڑا پہنتا ہے، ہاتھ میں سونٹا رکھتا ہے، برابر دھیان یعنی فکر میں لگا رہتا ہے، قلب کو دشمنی اور ذہن کو حرص ہوس، غضب سے پاک رکھتا ہے تاکہ وہ نجات ابدی حاصل کرے اور دنیا کی طرف رجوع نہ ہو، اس کو کسی دنیاوی کام سے سروکار نہیں ہوتا ہے، ثواب کی خاطر کسی گاؤں میں جاتا ہے تو ایک دن سے زیادہ اس کے لیے ٹھہرنا جائز نہیں، شہر میں پانچ دن قیام کر سکتا ہے، اس قیام میں کوئی اس کو کوئی چیز دے تو اس میں سے دوسرے دن کے لیے کچھ باقی نہ رکھے۔

برہمن کے عام فرائض یہ ہیں کہ زندگی بھر نیک کام کرتا رہے، صدقہ دے اور صدقہ لے،

جسٹ کو جلا [illegible] تو ہم دے . بچّی کی گردن کی طرح اس کو [illegible]
آگ جلانے کے بعد یہی ہیں جلایا جائے یہی کام ہوم ہے ، جس کو اشٹکرنت . کہتے [illegible]
پرن کے سوراخ ڈھیلے ہو جانے سے جو ناست [illegible] ہو گئی ہو وہ دور ہو جائے ، پھر مگر
آفتاب کی طرف دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کر دونوں انگوٹھوں پر اپنی رسم کے مطابق سجدہ
کرے ، کیونکہ آفتاب ہی ان کے نزدیک قبلہ ہے . رخ دکھن کے علاوہ کوئی اور طرف ہو .
دکھن کی طرف کوئی نیک کام نہیں کیا جاتا ہے . دوپہر کے وقت غسل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے
اس لیے وہ اس وقت بھی نہائے ، شام کا وقت رات کے کھانے اور نماز کا وقت ہوتا ہے
اس لیے وہ شام کو بھی نہائے ، گو دوپہر اور شام کا نہانا صبح کے نہانے کی طرح لازمی نہیں ،

اس کو صرف دو دفعہ کھانا چاہیئے ، دوپہر اور رات کے وقت جب وہ کھانے بیٹھے
تو ایک یا دو شخص خصوصاً اجنبی برہمنوں کے لیے صدقہ نکالے ، کچھ جانوروں ، چڑیوں ،
اور آگ کے واسطے علیحدہ کرے ، بقیہ خدا کا نام لے کر خود کھائے اور جو بچ جائے ، وہ
حاجت مندوں کے لیے باہر رکھ دیئے تاکہ جو بھی اس طرف سے گزرے ، خواہ انسان ہو
یا جانور اس کو کھالے ، برہمن کے کھانے پینے کا برتن بالکل علیحدہ ہو . اس کو ایسے ملک میں
رہنا جائز نہیں جہاں وہ گھاس پیدا نہیں ہوتی ہو جس کی انگوٹھی وہ اپنی چھوٹی انگلی
میں پہنتا ہے ، اور جس کے اندر کالے بال کے ہرن نہ چرتے ہوں ، گھر میں ہر کھانے والے برہمن کی جگہ یعنی
منڈل کو گوبر سے لیپا جاتا ہے ، اس کی شکل مربع ہوتی ہے ، کھانے کے بعد دوسرا اور لیپا جاتا ہے
تاکہ پھر سے پاک ہو ، برہمن کے لیے پیاز لہسن ، کدو ، گرنجن اور نالی جیسی ترکاریاں کھانا بالکل
حرام ہے ، (عربی ص ۲۶۴-۲۶۶ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۰-۳۰۳)

چھتری کی زندگی کا مطالعہ | چھتری ، ویش اور شودر کے معاشرتی حالات لکھنے میں البیرونی نے کچھ بخل

سے کام لیتا ہے شاید اس لیے کہ وہ برہمنوں سے زیادہ متاثر رہا ہو۔ لکھتا ہے کہ چھتری بید پڑھنا سیکھ سکتا ہے لیکن اس کی تعلیم نہیں دے سکتا، وہ پران کے ان احکام کی بھی پابندی کر سکتا ہے، اس کا جو کام مثلث ہوتا ہے، اس کے ذمہ حکومت کرنا اور لوگوں کی حمایت میں لڑنا ہے، جب وہ بارہ برس کا ہوتا ہے تو ایک جنیو میں دھاگے کا اور ایک موٹے کپڑے کا جنیو پہنایا جاتا ہے۔ (عربی ص ۲۷۰ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۱)

بیش کے فرائض بیش کا کام کاشتکاری، مکان بنانا، مویشی کی رکھوالی اور برہمنوں کی حاجتیں پوری کرنا ہے۔ اس کے لیے صرف دو دھاگے کا جنیو پہننا جائز ہے۔ (عربی ص ۲۷۰ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۱)

شودر کی حیثیت شودر کی حیثیت برہمن کے غلام کی ہے، اس کے لیے مالا جپنا، بید پڑھنا اور آگ کی قربانیاں کرنا منع ہے، اگر شودر یا بیش کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے بید پڑھا تو برہمن کی اطلاع پر حاکم اس کی زبان کاٹ لیتا ہے، البتہ اللہ کا ذکر اور نیک کام کرنا یا صدقہ دینا اس کے لیے منع نہیں ہے، وہ جنیو بھی پہن سکتا ہے لیکن موٹے کپڑے کی ایک فرد سے زیادہ نہیں۔ (عربی ص ۲۷۱ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۱۲-۳۱۱)

البیرونی کو اس تفریق سے دکھ پہنچا تھا، اس لیے خود ایک ہندو عالم کے ذریعہ سے اس کو یہ لکھ کر غلط قرار دیا ہے کہ یہ سارا تفرقہ درجات کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے، جس میں ایک شخص دوسرے کو مسخر یا محکوم بنا لیتا ہے، ورنہ باسدیو نے طالب نجات کے حق میں کہا کہ عقل مند کے نزدیک برہمن اور چنڈال، دوست اور دشمن، امانتدار اور خائن، سانپ اور نیولا برابر ہیں، اور اگر عقل سب کو مساوی ٹھہراتی ہے تو فرق اور برتری جہالت کی پیدا کی ہوئی ہے۔ (عربی ص ۲۷۱ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۳)

شودر کے حق میں البیرونی کا بیان ہے کہ ہندوؤں میں مال کو سود سے بڑھانا حرام ہے اور اس ذریعہ سے حاصل مال جس قدر زیادہ ہوگا، گناہ ہوگا، صرف شودر کو اس غرض کے لئے سود لینے کی اجازت ہے کہ نفع راس المال کے پچاسویں حصے سے [illegible]
(عربی ص ۲۷۶ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۲۵)

ہندوؤں کے نزدیک حلال و حرام چیزیں

ہندوؤں کے کھانے پینے کی حلال و حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی کی معلومات یہ ہیں کہ بکری، بھیڑ، ہرن، خرگوش، گینڈا، بھینس، مچھلی، پانی کے پرندے، گوریا، فاختہ، تیتر، کبوتر اور مور مباح ہیں، گائے، گھوڑا، خچر، اونٹ، ہاتھی، پلی ہوئی مرغی، کوا، طوطا، کوئل، انڈے اور شراب حرام ہیں (عربی ص ۲۷۶ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۲۰)

تعجب ہے کہ البیرونی نے ہندوؤں کے لیے بھینس کو بھی حلال بتایا ہے، حالانکہ آپ ان کے لیے گائے کی طرح بھینس بھی حرام ہے، البیرونی نے بعض لوگوں کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ مہابھارت کی لڑائی سے پہلے گائے ہندوؤں میں حلال تھی، اور بعض قربانیوں میں گائے ذبح کی جاتی تھی، پھر حرام کر دی گئی، اس کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ گائے کا گوشت ثقیل ہوتا ہے، برہمن اس کو کھا کر آسانی سے ہضم نہیں کر پاتے تھے، اس لیے اس کو حرام قرار دیا گیا، مگر خود البیرونی نے اپنی طرف سے یہ لکھا ہے کہ اس کا بچھڑا سفر، بار برداری اور کاشتکاری کے کام آتا ہے علاوہ دودھ دیتی ہے، جو خانہ داری میں استعمال ہوتا ہے، اس کے گوبر سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اور یہ عجیب بات لکھی ہے کہ اس کی سانس سے بھی جاڑے کے دنوں میں استفادہ کیا جاتا ہے، ان ہی باتوں سے وہ حرام قرار دی گئی (عربی ص ۲۷۷ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۲۱-۳۲۰)

ہندوستان کے متعلق کتاب کے باب ۶۹ میں ہندوؤں میں شادی بیاہ کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے، کہ ان میں بیاہ کم سنی میں ہوتا ہے، اس لئے اس کو والدین انجام دیتے ہیں، اس تقریب میں برہمن قربانی کی رسمیں ادا کرتے ہیں، برہمن اور غیر برہمن کو خیرات بانٹی جاتی ہے، خوشی کے آلات بجائے جاتے ہیں، مہر کا رواج نہیں، جو جہیز کے مطابق عورت کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اس وقت جو کچھ دیدیا جاتا ہے، واپس لینا جائز نہیں ہوتا، تا وقتیکہ عورت خود اپنی خوشی سے ہبہ نہ کر دے، شوہر اور بیوی کے درمیان موت کے سوا تفریق نہیں ہوتی، ان کے یہاں طلاق نہیں ہے (عربی ص ۲۰۷، اردو ترجمہ ص ۲۲۲-۲۲۳)

البیرونی نے ایک طرح سے یہ عجب انگیز بات لکھ دی ہے کہ ہندو مرد کو حق ہے کہ ایک سے زیادہ چار بیوی تک کرے، چار سے زیادہ نہیں کر سکتا (عربی ص ۲۰۷) البیرونی نے اس کی سند میں کسی مذہبی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس نے کسی سند ہی کی بنا پر لکھا ہوگا عام خیال یہی ہے کہ تعدد ازدواج اسلام ہی میں ہے، ہندو مذہب میں نہیں، لیکن البیرونی کے اس بیان سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ برہمن کے لئے چار، چھتریوں کے لئے تین، ویش کے لئے دو، اور شودر کے لئے ایک بیوی جائز ہے، (عربی ص ۲۰۹) بیوہ کو دوسری شادی کا حق نہیں ہے، وہ یا تو زندگی بھر بیوہ رہے، یا جل کر ہلاک ہو جائے (عربی ص ۲۰۸) بیاہ کا رشتہ قرابت مندوں میں نہیں ہوتا، بلکہ ان میں ہوتا ہے جو نسب سے بہت دور ہوتے ہیں، ہر طبقہ کے لئے خود اپنے طبقہ اور اس سے نیچے طبقے میں بیاہ کرنا جائز ہے، اوپر کے طبقہ میں کرنا جائز نہیں ہے، (عربی ص ۲۰۸) اولاد ماں کی طرف ہوتی ہے، باپ کی طرف نہیں، یعنی اگر برہمن کی بیوی برہمن ہے تو اولاد بھی برہمن ہوگی، اور اگر شودر ہے تو اولاد بھی شودر ہوگی، لیکن برہمن اپنے طبقہ سے باہر بیاہ نہیں کرتے (عربی ص ۲۰۸)

[illegible] یہ نام کلکے چھٹے مہینہ کے بعد [illegible]

کیا جاتا ہے (دوبی ص ۲۷۸) بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو ولادت سے [illegible] پہلے

گھر میں بھی قربانی کیجاتی ہے، جس کا نام جات کرم ہے (دوبی ص ۲۷۹) جب مدت [illegible]

ختم ہو جاتی ہو تو بچہ کا نام رکھا جاتا ہے، اس وقت بھی قربانی کی جاتی ہے، جس کو نام کرم کہا جاتا ہے،

(دوبی ص ۲۷۹) جب تک عورت نفاس کی حالت میں رہتی ہے، کسی برتن کے پاس نہیں جاتی

ہے نہ اس کے گھر کے اندر کوئی چیز کھائی جاتی ہے، اور نہ برہمن اس کے گھر میں آگ سلگاتا ہے،

(دوبی ص ۲۷۹) رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ تین برس ہے، عقیقہ تیسرے برس ہوتا ہے،

کان چھیدن کی رسم ساتویں یا آٹھویں برس ہوتی ہے (دوبی ص ۲۷۹)

سزاؤں کے طریقے | البیرونی کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ قتل، چوری، شراب خوری اور زنا کے لئے

سخت سزاؤں کے قوانین تھے، اگر قاتل برہمن اور مقتول دوسری ذات کا ہوتا، تو برہمن کو سزا تو نہیں

دیجاتی، لیکن اس کو کفارہ ادا کرنا پڑتا، وہ برت رکھتا، صدقے ادا کرتا اور عبادت میں مشغول رہتا

اگر مقتول بھی برہمن ہوتا تو یہ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا، جس کو کفارہ بھی دور نہیں کرتا، اس کی سزا

آخرت میں ملتی، (دوبی ص ۲۸۰-۲۸۱) برہمن کے قتل کے بعد سب سے بڑا گناہ گائے کو ہلاک کرنا سمجھا

جاتا ہے، (دوبی ص ۲۸۱) اس کے بعد شراب خوری اور زنا کا گناہ تھا، برہمن یا چھتری شراب

یا زنا کے مرتکب ہوتے تو ان کا مال ضبط کر کے ان کو ملک سے باہر نکال دیا جاتا، برہمن اگر

چوری کرتا، تو اس کی آنکھیں نکلوا لیجاتیں، پھر اس کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں

کٹوا دیا جاتا، ان دونوں کے علاوہ اور چوروں کو قتل کر دیا جاتا، زانیہ عورت شوہر کے گھر سے

نکال دیجاتی اور وہ جلاوطن رہتی (دوبی ص ۲۸۱)

وراثت | میراث کے متعلق ہندوؤں کا اصول ایسا ہے کہ بیٹی کے سوا اور سب عورتیں وراثت

سے محروم ہو جاتی ہیں، منو کی کتب میں ہے کہ بیٹی کا حصہ بیٹے کے حصہ کا ایک ربع ہے (عربی ص ۲۸۱)
میت کے وارث صرف مرد ہو سکتے ہیں، اصول یہ ہے کہ میت کے نیچے والوں کا حق زیادہ قوی ہے اور وہ بہ نسبت اوپر والوں کے ترکہ کے زیادہ مستحق ہیں، یعنی بیٹی اور بیٹے کی اولاد کو باپ دادا پر ترجیح ہے، پھر جو اشخاص اوپر یا نیچے ایک ہی جانب میں ہیں، ان میں جو لوگ میت سے زیادہ قریب ہیں، ان کی نسبت زیادہ مستحق ہیں، جو اس سے دور ہیں، یعنی بیٹا بہ نسبت پوتے کا اور باپ بہ نسبت دادا کے زیادہ مستحق ہیں، جو لوگ نسبت کے سیدھے سلسلہ سے ادھر ادھر ہٹ گئے ہوں جیسے بھائی وغیرہ ہیں اور صرف اس وقت وارث ہوتے ہیں، جب قوی وارث نہیں ہوتا اس طرح بیٹی کا بیٹا بہن کے بیٹے سے اور بھائی کا بیٹا ان دونوں سے زیادہ مستحق ہے، اگر متعدد وارث ہوں تو سب کے درمیان برابر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں، اگر میت کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو اس کا ترکہ حکومت کے پاس چلا جاتا ہے، مگر لاوارث برہمن کے مال پر حکومت قبضہ نہیں کر سکتی ہے وہ صدقہ کر دیا جاتا ہے (عربی ص ۲۸۲)

وارث پر میت کے یہ حقوق ہیں کہ اس کے مرنے کے وقت سے دس دن تک روزانہ پکا ہوا کھانا اور پانی کا ایک کوزہ کھلے آسمان کے نیچے ایک برآمدہ نما جگہ پر رکھ دیا جائے کہ شاید روح کو ابھی کسی جگہ قرار نہیں ہوا ہو، اور وہ بھوک یا پیاس سے گھر کے ارد گرد چکر لگا رہی ہو دسویں دن میت کے نام پر کھانا اور ٹھنڈا پانی صدقہ کریں اور گیارہویں دن سے ایک سال تک ایک آدمی کے کھانے کے برابر کھانا اور ایک درہم کسی برہمن کے گھر بھیجتے رہنا چاہئے، (عربی ۲۸۲ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۴۶ - ۳۴۷) اس کے مرنے کے بعد وارث کو سولہ ضیافتیں دینا ضروری ہوتا ہے جن میں کھانا کھلانے کے علاوہ کھانے والوں کو صدقہ بھی دیا جاتا ہے، پہلی ضیافت موت کے گیارہویں دن اور دوسری پندرہویں دن ہوتی ہے، پھر ہر مہینہ ایک مرتبہ

رہتاہے، بچے بیٹے کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے، ایک ضیافت سال ختم ہونے کے بعد ہوتی ہے، پھر سال تمام کا کھانا ہوتا ہے، ان ضیافتوں سے میت کے عزیز ادا ہو جانے کے علاوہ وارث بیٹا سال بھر غم مناتا ہے، بیوی کے پاس نہیں جاتا، پھر سال کی ابتداء میں ایک دن کھانا اس کے لئے حرام ہو جاتا ہے، (ع ب ص ۲۸۲، اردو ترجمہ ۹۴-۳۴۰)

ہندوؤں کے تہواروں کی رسم | البیرونی نے ہندوؤں کے تہواروں کا ذکر باب ۷۶، میں بہت تفصیل سے لکھا ہے، ان کے ہر تہوار کو عید کے نام سے یاد کیا ہے، ان میں سے بعض تہواروں کی خبر تو شاید بہت سے موجودہ دور کے ہندوؤں کو بھی نہ ہوگی، ہم نے ان تہواروں کے نام کا املا البیرونی ہی کے املا کے مطابق لکھ دیا ہے، لیکن ان کے بہت سے نام مثلاً چیت، اجشٹ، بھند، روپ پنچ، اہاری، پیائی، اپوی، گائے بٹ، دروپ ہر، پربت، گوتا نہیدا، اشتک، سائگا رتم، ماوتیج، مانسرگا، بالی تن، اوداد اور پوتین، آج کل کے تہواروں کے نام سے بالکل مختلف ہیں، یہ تمام الفاظ زمانہ کے بیان کے مطابق ہندی الاصل ہیں جیسا کہ کتاب لسند میں اس کے تیار کردہ انڈکس سے ظاہر ہے، ان ناموں کے اختلاف کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی، بعض تہواروں کی تاریخ بھی اس زمانہ سے مختلف ہے، ہندی مہینہ کی ترتیب میں کچھ نہ کچھ تھوڑا سا فرق ہے، ساون کے بعد آسن کا ذکر کیا گیا ہے، آسن سے مراد اشون یعنی کوار ہے جو آج کل بھادوں کے بعد کنوار آتا ہے، اس کی معلومات کی کچھ تفصیلات یہ ہیں،

چیت کا دوسرا دن اہل کشمیر کے لئے عید کا دن ہے، اس کا نام اگدوس ہے، چیت کے گیارہ دن کا نام ہنڈولی چیت ہے، اس دن باسدیو کے مندر پر جمع ہو کر اس کے بت کو اس طرح جھولا جھلاتے ہیں، جس طرح اس کو بچپن میں جھلایا جاتا تھا، گھروں میں بھی جھولے لگاتے ہیں، اور لوگ خوش خوش جھولا جھولتے رہتے ہیں، چیت میں پورے چاند کے دن کا نام بہ

اس ماہ میں عورتیں سنگار کرکے اپنے شوہروں سے تحفہ طلب کرتی ہیں، چیت کے بائیسویں دن کا نام چیت چشت ہے، اس دن غسل کیا جاتا ہے، اور صدقے تقسیم ہوتے ہیں، بیساکھ کے تیسرے دن عورتیں غسل کرکے سنگار کرتی ہیں، اور مہادیو کی بیوی گور (یعنی گوری) کے بت کی پوجا کرتی ہیں، اس کے سامنے چراغ جلاتی اور خوشبو پیش کرتی ہیں، دن بھر بھوکی رہتی ہیں، جھولے سے دل بہلاتی ہیں، دوسرے دن صبح کو صدقہ کرکے کھاتی ہیں، بیساکھ کے دسویں دن برہمن میدانوں میں نکل کر قربانی کے لیے پانچ روز بہت سی آگ علٰحدہ علٰحدہ سولہ جگہوں پر سلگاتے ہیں، چار چار جگہوں کا ایک ایک حلقہ ہوتا ہے، ہر حلقہ میں ایک برہمن قربانی کا نگران ہوتا ہے، وہاں سے سولہویں دن واپسی ہوتی ہے، اس مہینہ بسنت کی تقریب منائی جاتی ہے، اس میں برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، جیٹھ کے پہلے دن میں غلہ برکت حاصل کرنے کی خاطر پانی میں ڈالا جاتا ہے، جیٹھ کے مہینہ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے، تو اس کو روپ پنچہ کہتے ہیں، اس روز عورتیں جمع ہو کر خوشی مناتی ہیں، اساڑھ صدقہ کا مہینہ سمجھا جاتا ہے، اسکا نام اہاری ہے، اس مہینہ میں برتن بدل کرنے کرائے جاتے ہیں، ساون میں جب چاند پورا ہوتا ہے، تو برہمنوں کو بلا کر کھانا کھلایا جاتا ہے، آسن (آشون یعنی کوار) کے آٹھویں دن کا تہوار باسدیو کی بہن مہانومی کے نام پر منایا جاتا ہے، اس دن گنا چوسا جاتا ہے، اور گنے کی پہلی پیداوار بھگت بت کے نذر کی جاتی ہے، اس روز صدقے بھی ہوتے ہیں، اور بکریاں بھی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، آسن کی پندرھویں تاریخ میں جب چاند اپنی آخری منزل ریوتی میں ہوتا ہے تو پہائی کا تہوار ہوتا ہے، اس روز کشتی لڑنے اور جانوروں کا تماشا دکھایا جاتا ہے، اسی تاریخ کو باسدیو کے ماموں کنس نے اس کو کشتی لڑنے کے لیے بلایا تھا، آسن کی سولہویں تاریخ کو برہمنوں کو صدقے دیئے جاتے ہیں، اس مہینہ کی ۲۳ ویں تاریخ کو اہوی کہا جاتا ہے، اس روز بھی کشتی لڑنے کی تفریح ہوتی ہے، بھادوں کے مہینہ میں جب

چاند دسویں منزل میں داخل ہوتا ہے تو اس کو پتر پکش کہتے ہیں، اس میں بزرگوں کے لئے پندرہ دن تک صدقے کئے جاتے ہیں، بھادوں کے تیسرے دن کو ہریالی کہا جاتا ہے، عورتیں کئی دن پہلے سے ہر قسم کا بیج ٹوکروں میں بوتی ہیں، اور جب ان میں کونپل نکل آتی ہے تو ان کو نکال کر ان پر گلاب اور خوشبو چھڑکتی ہیں، رات بھر کھیل تماشا کرتی رہتی ہیں، دوسرے دن ان سب کو تالاب پر لا کر غسل دیتی ہیں، خود بھی نہاتی ہیں، پھر صدقے تقسیم کرتی ہیں، بھادوں کی چھٹی تاریخ کو گلے بت کہا جاتا ہے، اس دن کھانے کی ضیافت ہوتی ہے، بھادوں کے آٹھویں دن جب چاند کا آدھا جسم روشن ہو جاتا ہے تو یہ دن دوب ہر کہلاتا ہے، اس روز غسل کر کے اگا ہوا غلہ استعمال کیا جاتا ہے، اسی دن عورتیں حمل سے رہنے اور بیٹے کی آرزو کرتی ہیں، بھادوں کی گیارھویں دن کا نام پربت ہے، یہ بڑا اہم دن سمجھا جاتا ہے، اس روز باسدیو بت کا پوجاری اس دھاگے کو زعفران سے رنگتا ہے، جو اس کو دیا جاتا ہے، رنگتے وقت دھاگہ میں کچھ جگہ خالی چھوڑ دیتا ہے، پھر باسدیو بت کے قد کے برابر ناپ کر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے جو اس کے قدم تک لٹک جاتا ہے، بھادوں کی سولھویں تاریخ کو لڑکے سنوارے جاتے ہیں، ان کو خوشبو لگائی جاتی ہے پھر ان جانوروں کے ساتھ کھیلنے کو کہا جاتا ہے، اس کے ساتویں دن مرد بھی اپنی آرایش کرتے ہیں، مہینہ میں جتنا دن باقی رہ جاتا ہے اس کی ہر شام کو بھی لڑکے سنوارے جاتے ہیں، برہمنوں کو صدقہ دیا جاتا ہے، اور نیک کام انجام دینے کی کوشش کیجاتی ہے، جب چاند چوتھی منزل روہنی میں ہوتا ہے، تو وہ گوناالید کہلاتا ہے، اس کے تین دن تک باسدیو کی پیدایش کی خوشی میں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں، کاتک کے پہلے دن دیوالی یعنی دیوالی منائی جاتی ہے، اس روز برج میزان میں آفتاب و ماہتاب اکٹھے ہوتے ہیں، اس دن لوگ غسل کر کے اپنی آرایش کرتے ہیں، پان اور سپاری تحفے میں لوگوں کے پاس بھیجتے ہیں، صدقے کرتے

بلا مہر کھیل تماشے میں مشغول رہتے ہیں، رات کے وقت، بکثرت سے چراغ جلاتے ہیں
کہ ہر ایک روشن ہو جاتا ہے، ان کا خیال ہے کہ اُس دن باسدیو کی بیوی لکشمی سرو جن کے بیٹے راجہ
بل کو ساتویں زمین میں قید سے آزاد کرتی ہے، اور دنیا میں نکال لاتی ہے، اس دن کو بل راج
یعنی بل کی حکومت بھی کہتے ہیں، عام لوگوں کا خیال ہے کہ راجہ بل کرتا جگ میں تھا جو خیر یعنی نیکی
کا زمانہ تھا، یہ دن اس زمانہ کے مشابہ ہو جاتا ہے، اسی لئے خوشی منائی جاتی ہے، ماگھ میں جب چاند
کے پورے ہونے کا وقت گذر جاتا ہے، تو ضیافتیں ہوتی ہیں، اور بقیہ مہینہ کی نصف تاریک
میں عورتیں سنوری رہتی ہیں، ماگھ کے تیسرے دن گور (یعنی گوری) کے چاندی کے بتوں
کو ایک کرسی پر اکٹھا کیا جاتا ہے، عورتیں جمع ہو کر رات بھر کھیلتی رہتی ہیں، اور صبح کو صدقے
کرتی ہیں، ماگھ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس میں عورتیں جمع ہو کر خوشی مناتی ہیں، پوس
کے اکثر دنوں میں عورتیں کثرت سے پوہول پکاتی ہیں، جو ایک قسم کا میٹھا کھانا ہوتا ہے، پوس کے
نصف روشن کے آٹھویں دن کا نام آشتک ہے، اُس دن کھانا باست یعنی سرمق یا پالک سے
پکایا جاتا ہے، اور برہمنوں کو بلا کر اسی سے ان کی خاطر مدارات کیجاتی ہے، پوس کے نصف
تاریک کے آٹھویں دن کا نام ساگارتم ہے، اس دن شلغم کھایا جاتا ہے، ماگھ کے تیسرے دن کا
نام ماہ تریج ہے، اس روز عورتیں بڑے لوگوں کے گھروں میں گور کے بت کے پاس جمع ہو کر
اس کے سامنے عمدہ قسم کے کپڑے، عطر اور کھانے رکھتی ہیں، علٰحدہ علٰحدہ مجمع میں پانی سے بھرے
ہوئے ایک سو آٹھ برتن رکھے جاتے ہیں، جب ان کا پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، تو رات کے ہر
چوتھے حصہ میں اس سے چار مرتبہ غسل کرتی ہیں، پھر صبح کو صدقے کر کے لوگوں کو کھلاتی پلاتی
ہیں، ماگھ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کا نام چاماہ کہلاتا ہے، اس رات اونچے مکانات
پر لگن روشن کی جاتی ہے، ماگھ کی ۲۳ تاریخ گانسرتک یا باہانک کہلاتی ہے، اس دن گوشت

اور بڑی کالی ماش کی [illegible]، ماگھ کی ۲۰ ویں تاریخ جب رات ختم ہونے کے [illegible] تو سب لوگ پانی میں داخل ہو کر بار بار غوطے لگاتے ہیں، پھاگن کے آٹھویں دن کا نام پورہک ہے، اس دن برہمنوں کی دعوت آٹے اور گھی کے مختلف کھانوں سے کی جاتی ہے، پھاگن کے مہینے میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کو اودھا یا ڈھولکھ کہتے ہیں، اس رات چوراہے [illegible] پر آگ روشن کرکے اس کو گاؤں کے باہر پھینک دیا جاتی ہے، اس مہینے کی سولہویں رات کو شیوراتری منائی جاتی ہے، رات بھر مہادیو کی پوجا ہوتی ہے، اس مہینہ کی ۲۲ ویں دن کا نام پوتپن ہے، اس دن چاول کے ساتھ گھی شکر ملا کر کھایا جاتا ہے، ملتان کے ہندوؤں کا ایک خاص تہوار سانب پور یاترا ہے، اس میں آفتاب کی پوجا ہوتی ہے (عربی ۹۰۰-۲۰۷، اردو ترجمہ جلد دوم ۲۴۳-۴۵)

ہندوؤں کے بعض نامناسب مراسم کی مدافعت

اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ ہندوؤں کی معاشرتی زندگی میں مذہب کی گہری چھاپ پڑی رہی، برہمن کی معاشرتی زندگی تو مذہب کے بالکل تابع رہتی، اس زندگی کی جو تصویر البیرونی نے کھینچی ہے، وہ تو ویدک کال کے برہمنوں کی زندگی معلوم ہوتی ہے، معلوم نہیں گیارہویں صدی عیسوی میں ہر برہمن کی زندگی بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ البیرونی نے پتن پران کی مدد سے پیش کرکے قلم بند کردی ہے، اگر ایسی ہی رہی تو وہ ضرور قابل قدر ہے، البیرونی خود بھی ان کی پاکیزہ زندگی سے متاثر معلوم ہوتا ہے، پھر اس کو اگر برہمنوں یا عام ہندوؤں کی زندگی سے متعلق بھی کچھ جاہلی یا نامناسب باتیں معلوم ہوتی تھیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی خوبصورت عذر بھی پیش کرتا رہتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے، کہ اس جاہلیت پر ہم تنہا ہندوؤں ہی کو ملامت نہیں کرتے، اہل عرب بھی زمانۂ جاہلیت میں ان ہی کے مانند بڑی بڑی نامناسب اور قابل شرم باتوں کے مرتکب ہوتے تھے (عربی ص ۱۹ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴-۲۶)، جھاڑ پھونک کے سلسلہ میں لکھتا ہے، کہ ہندو اس کو

جادو سمجھتے ہیں، لیکن یہ لکھ کر یہ بھی کہ دلیل کرتا ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے سب قومیں جاہل ہیں، یعنی اور قومیں بھی اپنے جھاڑ پھونک کو جادو سمجھتی ہیں، (عربی ص ۱۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۰۵) ہندوؤں میں کچھ بدچلن عورتیں رہتی تھیں، اس کے متعلق البیرونی کا بیان ہے کہ یہ خرابی ان کے راجاؤں کی پیدا کی ہوئی ہے، مندروں میں جو عورتیں رہتی ہیں، وہ گانے ناچنے اور دل بہلانے کی غرض سے ہیں، برہمن اور مہنت یا پجاری اس کے سوا اور کچھ یعنی زنا کاری ان کے حق میں پسند نہیں کرتے، لیکن ان کے راجاؤں نے ان کے شہروں کے واسطے آرائش اور لوگوں کے واسطے عیش و نشاط اور آزادہ روی کا ذریعہ بنا دیا ہے جس سے ان کا مقصود ان کے ذریعہ سے خزانے کا فائدہ اور جو کچھ خزانے سے فوج کے واسطے باہر نکلتا ہے اس کو جرمانہ اور ٹیکس کے ذریعہ خزانے میں واپس لانا ہے، اس کی تحقیق کرنے کے بجائے البیرونی اس پر یہ لکھ کر پردہ ڈالنا چاہتا ہے کہ عضد الدولہ نے بھی یہی کیا تھا، اس کے علاوہ اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ فوج کے بن بیاہے سپاہیوں سے رعایا کی حفاظت ہو، (عربی ص ۲۷۹، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۲۳۷-۳۸)

پہلے ذکر آیا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جب کوئی مرتا ہے تو اسکے لئے آسمان کے نیچے ایک برآمدہ نما جگہ پر مرنے کے وقت سے دس دن تک ہر روز کھانا اور پانی کا کوزہ رکھدیا جاتا ہے، تاکہ اس کی روح کو اگر کسی جگہ قرار نہ ہو تو وہ اپنی بھوک اور پیاس کو گھر کے ارد گرد آکر رفع کرے، اس سلسلہ میں بیرونی لکھتا ہے کہ سقراط کے یہاں بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ مقبرے کے گرد نفس اپنے بدن کی محبت میں چکر لگاتا رہتا ہے، نفس بدن کے ہر عضو میں سے کچھ نہ کچھ جمع کرتا ہے، جو ل کر اس عالم میں اور بدن کی موت پر جب وہ اس سے جدا اور علیحدہ ہوتا ہے، اس کے بعد کے عالم

تھے اس کی سکونت کی جگہ بن جاتا ہے (عربی ص ۲۸۰، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۵۸)
ایک جگہ البیرونی گنگا اور جمنا کے سنگم کے پاس ایک درخت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے اس درخت کے پاس لوگ اپنے آپ کو اس طرح ہلاک کرتے ہیں کہ اس پر چڑھ کر نیچے کود پڑتے یا گنگا میں گرا دیتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہے کہ جو کچھ ہم نے نقل کیا، بعینہ اسی قسم کی بات سقراط نے کہی ہے، کہ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو قبل اس کے ہلاک کرے دیوتا اس کے واسطے ایسی اضطراری حالت پیدا کر دیں، جیسی اس وقت ہمارے واسطے موجود ہو گئی ہے، سقراط نے یہ بھی کہا ہم انسان ان لوگوں کی طرح ہیں جو قید ہیں، یہ مناسب نہیں کہ ہم لوگ بھاگیں، اور کہ اپنے نفس کو کھول دیں، اس لئے کہ دیوتا، اس وجہ سے کہ ہم انسان ان کے غلام ہیں، ہماری طرف خاص توجہ رکھتے ہیں (عربی ص ۲۰۸، اردو ترجمہ دوم ص ۵۶ - ۳۵۵)

البیرونی کی نہ صرف ان تاویلات سے بلکہ اس کی زیر نظر کتاب کی ہر سطر سے اس کی کشادہ دلی اور بے تعصبی کا اظہار ہوتا ہے، اس کو پڑھتے وقت بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ اپنے مذہب کی برتری کے احساس کے ساتھ وہ ہندوؤں کی مذہبی، علمی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کا کوئی محقق اپنی غیر جانبداری سے ہر بات کو تحقیق کر کے لکھنے کی کوشش کر رہا ہے، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ ہم سنا کرتے تھے کہ جو ہندو غلام ممالک اسلامیہ سے بھاگ کر اپنے ملک اور دین میں واپس جاتا ہے تو کفارے کے طور پر اس پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، اور گائے کے گوبر اور پیشاب اور دودھ میں چند دن تک اس کو گاڑ دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان میں خمیر اٹھ آتی ہے، اس وقت نجاست سے اس کو اسی قسم کی چیزیں جن میں گاڑا گیا تھا کھلائی جاتی ہیں، اس سنی ہوئی روایت

بیرونی کو دیکھا ہوا، اسی لئے اس نے اس کی تحقیق کی جس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس قسم کی دسری باتیں بھی ہم نے سنی تھیں، ہم نے ان کے متعلق برہمنوں سے پوچھا، انھوں نے نکار کیا، اور کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی کفارہ ہے، اور نہ اس کی سابق حالت سے آنے کی اجازت، اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے، اس لئے کہ برہمن چند روز شودر کے گھر میں کھانا کھا لیتا ہے تو پنے طبقہ سے گر جاتا ہے، اور اس میں کبھی واپس نہیں آسکتا۔ (عربی ص ۲۸۱، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۲۴۴-۲۴۵)

بیرونی کی بے تعصبی کی تعریف البیرونی کی کتاب میں ہندوؤں کے مذہبی، علمی اور معاشرتی حالات کے مطالعہ میں ہمدردی، سیر چشمی اور افہام و تفہیم کی جو خوشگوار فضا ہے، اس سے متاثر ہو کر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی نے لکھا ہے کہ

" وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے اچھے لوگوں کے کارناموں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا، جو دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے اور پھولے، اس کی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے، جس کے لئے ہندوؤں کو اس کا ممنون ہونا چاہئے، اور علمی دنیا بھی اس کی شکر گذار ہے، کہ اس کی خوبی اس کی صلاحیت و لیاقت سے زیادہ قیمتی ہے"

(البیرونی یادگار جلد، ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۸۳)

البیرونی قوموں کی باہمی دوری اور بے گانگی کو ایک دوسرے کے لئے بہت مضر سمجھتا رہا، اس کا یہ سمجھنا بہت صحیح تھا، کیونکہ ایک دوسرے کی لاعلمی سے بے گانگی پیدا ہوتی ہے، بے گانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیتی ہے، جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی اور قومی خود بینی پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد دل آزاری اور مردم بیزاری، آبرو ریزی، اور خونریزی بھی شروع ہو جاتی ہے، جس کو قومی سرخ روئی کا نام دیدیا جاتا ہے، البیرونی نے اپنی کتاب کے باب

ہوں کے آمادہ ہوئی، لکھا ہے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے، اس میل جول کی فضا کو پیدا کرنے کی خاطر اس نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے کتاب الہند لکھی، اگر ہندو اور مسلمان دونوں میں ہر زمانہ میں ایک ایک البیرونی پیدا ہوتے رہتے، تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی،

شہاب الدین غوری کی رواداری غزنویوں کے بعد ہندوستان میں غوری آئے، شہاب الدین غوری کی تلوار ملتان، انہلواڑہ، سیالکوٹ، بھٹنڈا، اور ترائن وغیرہ میں ضرور چلی، لیکن اس کے واقعاتِ زندگی میں یہ واقعہ بھی غور کرنے کے لائق ہے، کہ جب نہروالا یعنی انہلواڑہ کی فتح میں ناکام رہ کر غزنین میں مقیم تھا، اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا کہ کسی نے عرضی لکھ کر بھیجی کہ نہروالہ میں ایک مشہور سوداگر ہے، جس کا نام وسالہ ابہر ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھیجا کرتا ہے، چنانچہ اس وقت بھی اس کا دس لاکھ کے قریب کا مال غزنین میں آیا پڑا ہے، اگر بادشاہ سلامت چاہیں تو اس مال کو ضبط کر کے خزانے میں بھجوایا جا سکتا ہے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا، بلکہ شاہی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا، سلطان نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ

وسالہ ابہر کا یہ مال اگر نہروالہ میں ہوتا، اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لئے حلال ہوتا، لیکن غزنین میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لئے حرام ہے، کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے، (جوامع الحکایات و لوامع الروایات اردو ترجمہ نسخہ دار المصنفین، ورق ۴۹ اردو ترجمہ حصہ اول ص ۷۴)

(باقی)

اراضیٔ ہند کی شرعی حیثیت

چند قدیم تحریریں

از

جناب نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی

اراضیٔ ہند کا مسئلہ کئی سو سال تک علماء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، متعدد علماء نے اس موضوع پر داد تحقیق دی، قدیم علماء میں شیخ جلال الدین[1] تھانیسری نے "تحقیق اراضی الہند" کے نام سے ایک مختصر جامع اور پُر مغز رسالہ تحریر فرمایا تھا یہ رسالہ

---

[1] شیخ جلال الدین بن قاضی محمد (مجمعی) فاروقی تھانیسری، شیخ عبد القدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) کے خلفاء اور بلند پایہ علماء میں سے تھے، اکبر نے جب اپنے بھائی حکیم مرزا پر فوجکشی کی تو وہ راستہ میں شیخ جلال سے ملا تھا، شیخ جلال نے تمام عمر درس و تدریس کا بازار گرم رکھا، آخر عمر میں نہایت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے ۹۵ سال کی عمر میں ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ مطابق ۱۵۸۱ء میں انتقال ہوا، شیخ الاولیاء سے تاریخ وفات نکلتی ہے، تھانیسر میں اپنی خانقاہ کے صحن میں مدفون ہیں، اراضی ہند کے علاوہ متعدد درسی کتابوں کے حواشی اور تصوف میں ارشاد الطالبین علمی یادگار ہے۔

شیخ جلال نے تھانیسر (کرکشیتر) میں کورپانڈو کے مشہور تاریخی قلعہ پر قیام فرمایا تھا، وہیں آپ کی عظیم الشان خانقاہ، مسجد اور مدرسہ تھا، مسجد میں آج کل ایک بھنگن مقیم ہے، مدرسہ کی بچی کھچی عمارت

بہت کمیاب ہے، صرف چند کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں، مؤلف کا قریب العہد قلمی نسخہ ان کے خاندانی ذخیرۂ کتب میں چند سال پہلے موجود تھا مگر اس وقت دستیاب نہ ہو سکا، اس نسخہ کی ایک نقل کتب خانۂ مظاہر العلوم میں اور ایک ہمارے مختصر سے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے،

یہ رسالہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع احمدی میں طبع بھی ہو چکا ہے، مگر اس قدر غلط چھپا ہے، کہ اس سے صحیح مفہوم اخذ کرنا بہت دشوار ہے، چار پانچ سال قبل اسی مطبوعہ نسخہ کو بنیاد بنا کر کراچی (پاکستان) سے حاشی متن اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے،

تحقیق اراضی الہند کی تالیف کے بعد بھی علماء نے اپنے فتاوی اور تالیفات کے ذریعہ اراضی ہند کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی

(بقیہ حاشیہ ص۲۶۹) کا بھی یہی حال ہے، مزار کا مجاور ایک ہریجن بنا ہوا ہے، اس نے قبہ مزار کے اندر ہی پوجا پاٹ کی جگہ بنا لی ہے، یہ حال دیکھ کر بڑی عبرت ہوتی ہے، مزار کا قبہ خستہ حال تھا، ایک صاحب خیر نے حال میں اس کی مرمت کرا دی ہے، جس سے مزار محفوظ ہو گیا، تفصیل کے لئے دیکھئے اخبار الاخیار شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۴۳، مطبع مجتبائی دہلی ۱۲۸۲ء سفینۃ الاولیا شہزادہ دارا شکوہ ص ۱۰۲، ۱۰۱، نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء، خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری ص ۳۴۹ جلد اول نولکشور ۱۸۷۳ء انوار العارفین مولوی محمد حسین مراد آبادی ص ۴۴۲ نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء نزہۃ الخواطر مولانا عبد الحئی، ار اسے بریلوی ص ۸۲-۸۳ جلد ۴، تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۲۴-۲۲۵، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات مولانا اعجاز الحق قدوسی ص ۵۲۵، ۵۲۶، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۱ء،

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے وہ فتاوے ہیں جن کے بارے میں ذیل کی سطور لکھی جا رہی ہیں:-

۱؎ قاضی محمد ثناء اللہ بن مولوی حبیب اللہ بن مولوی ہدایت اللہ عثمانی پانی پتی کی ۱۱۴۳ھ میں پیدائش ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) سے علوم ظاہری اخذ کئے، ۱۸ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوگئے، باطنی علوم میں شیخ عابد سنامی (متوفی ۱۱۶۰ھ) سے استفادہ کیا، پھر شیخ کے فرمان کے مطابق حضرت مرزا مظہر جانجاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) سے اکتساب فیض کیا، حضرت مرزا صاحب کو قاضی ثناء اللہ سے بےحد تعلق تھا، علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کرتے تھے، اور فرماتے "اگر خدا بروز قیامت از بندہ بپرسد کہ در گاہ ما چہ تحفہ آوردی، عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را"، قاضی ثناء اللہ کا تراسی سال کی عمر میں رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا، مزار مبارک پانی پت میں شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی (متوفی ۷۶۵ھ) کی درگاہ کے قریب ایک بڑے احاطہ میں ہے، قاضی صاحب کے برابر ہی مرزا مظہر جانجاناں کی دوسری اہلیہ مدفون ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد اس احاطہ کی کیفیت ناگفتہ بہ تھی، خدا جزائے خیر دے ایک ترکی عالم نے اس کی مرمت کرا کے محفوظ کرا دیا،

قاضی ثناء اللہ کی چونتیس[۳] تالیفات کا علم ہو سکا ہے، جن میں سے اکیس[۴] کے قلمی یا مطبوعہ نسخے راقم سطور کی نظر سے گذرے ہیں، قاضی صاحب کی مشہور تالیف حقوق الاسلام کا مؤلف کا تصحیح کردہ قلمی نسخہ راقم کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، قاضی صاحب کی تمام تالیفات میں حدیث مظہری، تفسیر مظہری اور مالا بد منہ (الاقوی دفعہ میں) امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، حدیث مظہری کا قلمی نسخہ بہار میں موجود ہے، مالا بد منہ بالاقوی کے کسی نسخہ کا سراغ نہیں ملتا، تفسیر مظہری سب سے پہلے نصف اول دو[۲] جلدوں میں حصار سے پھر میرٹھ سے، اور آخر میں مکمل شکل میں دہلی سے طبع ہوئی ہے، تفسیر مظہری کے اردو میں متعدد ترجمے ہوئے، آخری اور مکمل ترجمہ مولانا عبد الدائم جلالی کا ہے، قاضی صاحب کی چند تالیفات اور تفسیر مظہری کے مسودہ کی زیارت کیلئے راقم سطور

۲؎ تذکرہ اولیائے ہند مؤلفہ مرزا محمد اختر دہلوی کراچی میں ص ۔۔ پر قاضی صاحب کی وفات ۱۲۱۶ھ تحریر ہے، یہ صحیح نہیں ہے

ان فتاویٰ کا شانِ نزول یہ ہے کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی مؤلف کشاف اصطلاحات

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۱) مولانا شاہ زید ابو الحسن فاروقی سجادہ نشین خانقاہ حضرت مظہر جانجاناں دہلی کا ممنون ہے، تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو مقاماتِ مظہری از شاہ غلام علی ص ۵۷ تا ۸۷، مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۹، خزینۃ الاصفیاء ص ۶۰۰ - ۶۰۹، ۱۳۲۹، الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی از شیخ محسن بن یحییٰ یمانی ص ۷، سوادِ اعظم دیوبند ۱۳۰۶، نزہۃ الخواطر ص ۳۱۱ د ۱۳۱۱ ج ۶، حالاتِ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ مولانا محمد حسین نقشبندی ص ۲۴۰ - ۲۴۳، ناشر ملک فضل الدین تاجر کتب لاہور طبع دوم۔

۱؎ مولوی محمد علی ابن شیخ علی بن شیخ حامد بن شیخ العلماء قاضی محمد صابر متوفی ۱۱۹۲ھ فاروقی تھانوی قاضی محمد اعلیٰ ہندوستان کے ان جلیل القدر علماء میں سے ہیں جن پر سرزمینِ ہند ہمیشہ فخر کرتی رہیگی، کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ کی مشہور تالیف ہے، قاضی اعلیٰ اس کی ترتیب سے ۱۱۵۸ھ میں فارغ ہوئے، کشاف اصطلاحات الفنون کا قلمی نسخہ (غالباً نسخۂ مؤلف) مولانا ابو الحسن بن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (متوفی ۱۲۶۹ھ) کے کتب خانہ کی زینت تھا، یہ نسخہ مولانا مملوک علی (متوفی ۱۲۶۷ھ) کے ذریعہ سے ڈاکٹر اسپرنگر کو ۱۸۵۳ء میں ملا، اسپرنگر نے کشاف اصطلاحات کے پیش لفظ میں نسخۂ دہلی کا ذکر کیا ہے، اس سے یہی نسخہ مراد ہے، اسکو اسپرنگر نے ولیم ناسولیس کے تعاون سے ایڈٹ کیا، اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے اسے پہلی بار ۱۸۶۲ء میں شائع کیا، دوبارہ پھر سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۸۶۲ء میں طبع ہوئی، اس کے بعد آستانہ ترکی سے ۱۳۱۷ھ میں صرف جلد اول تین حصوں میں چھپی، پھر ۱۹۶۳ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی، آخری اڈیشن چھ خوبصورت دیدہ زیب جلدوں پر مشتمل ۱۹۶۶ء میں بیروت سے آیا ہے، ان میں سے طبع دوم کلکتہ، ترکی اور بیروت کے اڈیشن راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔

نے قاضی امداد معاش کے سلسلہ میں ایک حکم تحریر فرمایا تھا، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے یہ حکم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۲) قاضی محمد اعلیٰ کی تالیف ہے، حاشیہ صدرا کا قلمی نسخہ بخط مؤلف راقم کے ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے،

یوسف سرکیس نے سبق الغایات فی نسق الآیات کو بھی قاضی محمد اعلیٰ کی تالیف میں شمار کرایا ہے (معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ کالم ۲۶۶/۲ مطبع سرکیس مصر ۱۳۴۶ھ) یہ درست نہیں، سرکیس کو علی اور تھانوی کے لفظ سے اشتباہ ہوا، (عام طور پر مورخین محمد اعلیٰ تھانوی کو محمد التھانوی یا علی التھانوی سے ذکر کرتے ہیں) معجم المطبوعات سے یہ غلطی الاعلام خیر الدین زرکلی ص ۱۰۸۰-۱۰۹/۷ (طبع ثالث بیروت) میں نقل ہوئی، اور اب اس غلطی کو مزید سند حاصل ہو گئی، حالانکہ سبق الغایات فی نسق الآیات مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی تالیف ہے، قاضی محمد اعلیٰ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں، دیکھئے فہرست تالیفات اشرفیہ مرتبہ مولوی عبد الحق ص ۱۲ (دلی پریس لکھنؤ ۱۳۵۰ھ) اشرف السوانح خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۲۴۶ ۳/۲ (دلی پریس لکھنؤ ۱۳۰۰ھ) نزہۃ الخواطر ص ۵۰۸/۸،

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے ۱۱۹۱ھ میں وفات پائی (بیاض قلمی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی) قاضی محمد اعلیٰ کا ذکر اکثر کتب حوالہ میں ملتا ہے، مگر عجیب اتفاق ہے کہ قاضی صاحب کے صحیح نام میں اکثر مورخین کو سہو ہوا، صحیح نام اور نسبتہً تفصیلی تذکرہ نزہۃ الخواطر ص ۲۷۸ میں ملتا ہے،

۱؎ مفتی الٰہی بخش فرشاہ دین مولانا حکیم شیخ محمد عرف شیخ الاسلام صدیقی کاندھلوی ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے والد محترم سے تعلیم حاصل کی، پھر حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تین سال تک مختلف کتابیں پڑھیں (تذکرہ مفتی الٰہی بخش قلمی مرتبہ مولوی محمد سلیمان کاندھلوی متوفی ۱۳۰۵ھ) شاہ عبد القادر (متوفی ۱۲۳۰ھ) شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ) اور ملک الشعراء میر قمر الدین منت سونی پتی (المتوفی ۱۲۰۸ھ) کے ہم درس رہے، (نزہۃ الخواطر ص ۳۶۹/۷) (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴ پر)

علمائے بنگال کے [illegible] (بقیہ حاشیہ [illegible])

(بقیہ حاشیہ [illegible]) مفتی الٰہی بخش شاہ عبد العزیز کے شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے [illegible]

"میرے شاگردوں میں تین آدمی نہایت لائق اور عمدہ ہیں مولوی رفیع الدین صاحب، مولوی الٰہی بخش جو بقید حیات ہیں، اور کلکتہ میں مولوی مراد علی ہیں، انہوں نے پڑھنے پڑھانے کا شغل چھوڑ دیا ہے، اور تجارت کرتے ہیں (ملفوظات و کمالات عزیزی ص ۵۰ مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی طبع پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۰ء)

حضرت شاہ عبد الغنی (بن شاہ ولی اللہ متوفی ۱۲۰۲ھ) سے مسلسل بالاولیہ کی سند حاصل کی، (ریاض علمی مفتی الٰہی بخش) حضرت شاہ غلام علی (متوفی ۱۲۴۰ھ) اور مولانا سید قطب الہدیٰ علوی بریلوی (متوفی ۱۲۰۷ھ) سے صحاح ستہ کی ضروری قرأت کا شرف حاصل ہے، (فضائل عزیزیہ ص ۱۱) طب میں حکیم شریف خان سے استفادہ کیا۔"

تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجیب الدولہ (متوفی ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء) کے دربار سے بحیثیت مفتی اول وابستہ ہوئے، اور ضابطہ خان کی وفات ۱۱۹۹ھ تک اسی عہدہ پر فائز رہے، ضابطہ خاں کی وفات کے بعد امیر نگر، بریلی، بھوپال، تھانہ بھون، خورجہ، سہارنپور، کوٹہ (راجستھان) وغیرہ میں درس تدریس اور ملازمت کا سلسلہ رہا، آخر عمر میں وطن آگئے تھے، وطن میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، مفتی صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، مولانا عبد الحی رائے بریلوی مفتی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

درس وأفاد مدة عمره وأخذ عنه	زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے
خلق لا يحصون بعد وعد،	اور ان سے بیشمار لوگوں نے استفادہ کیا،

(الثقافة الاسلامية في الهند ص ۱۰۱ طبع المجمع العلمي دمشق ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) (بقیہ حاشیہ ص ۱۷ پر)

شرعی کا حکم تحریر فرما دیا، مفتی صاحب نے مزید وضاحت چاہی، اس پر قاضی ثناء اللہ صاحب نے دوبارہ اس مسئلہ کے بارہ میں مفصل تحریر لکھدی، یہ دونوں فتوے پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲) تلامذہ کی طویل فہرست میں مرزا حسن علی اصغر، محدث لکھنوی متوفی ۱۲۵۵ھ، مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی متوفی ۱۲۴۲ھ (ان کے شاگردوں میں محدث جلیل قاری عبدالرحمٰن پانی پتی متوفی ۱۳۱۴ھ اور سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر کی متوفی ۱۳۱۷ھ جیسے بلند پایہ حضرات ہیں) مولانا احمد علی محدث سہارنپوری متوفی ۱۲۹۷ھ کے نام بھی آتے ہیں،

درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، حدیث، فقہ، تفسیر، تجوید تاریخ، (اور اس کے دوسرے شعبوں تذکرہ و سوانح، رجال و طبقات،) عقائد، کلام، منطق، فلسفہ، نحو صرف، طب، تصوف، ادب (نظم و نثر عربی اردو فارسی) نجوم، جفر، رمل، عملیات کے متنوع موضوعات پر ساٹھ تالیفات کا اب تک علم ہوا ہے، مولانا احتشام الحسن صاحب نے مشائخ کاندھلہ ص ۱۲۸ ۱۲۹ میں صرف ۴۴ تالیفات کا ذکر کیا ہے،

مفتی الٰہی بخش کی تالیفات میں خاتمہ مثنوی مولانا روم مشہور و معروف ہے، اس کی تالیف جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ اور مولانا روم متوفی ۶۷۲ھ کے حکم پر ہوئی، ۱۲۲۶ھ میں خاتمہ مثنوی مکمل ہوا، غیور سے تاریخ نکلتی ہے، خاتمہ مثنوی کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۶ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوا، اس کے بعد سے آج تک ہر اڈیشن کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے نسخیات اسلامی ص میں خاتمہ مثنوی کی پہلی طباعت محمود المطابع کانپور مولانا احمد حسن بٹالوی ثم کانپوری کی شائع کردہ بیان کی ہے، یہ درست نہیں،

مفتی صاحب کی وفات بروز یکشنبہ ۱۵ رجادی الآخرہ ۱۲۴۵ھ ۱۳ دسمبر ۱۸۲۹ء بوقت مغرب کاندھلہ میں ہوئی، مولوی کریم الدین نے مفتی صاحب کی وفات ۱۲۵۰ھ لکھی ہے، یہ صحیح نہیں ہے (بقیہ حاشیہ ص ۸)

موجودہ زمانہ میں ان مباحث کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے، لیکن علمی تبرک اور معلومات کے طور پر ان کا مطالعہ مفید ہوگا، چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے یہ فتوے پیش خدمت ہیں، ان فتاوے میں سب سے اول الذکر مفتی الٰہی بخش کی قلمی بیاض سے منقول ہے، اسے نقل کرنے کے بعد مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"مولوی محمد ثناء اللہ سلمہ اللہ در ۱۲۲۳ھ در جواب خط ایں جانب بمہر خود نوشتہ فرستادہ بودند" کاتبہ الٰہی بخش عفی عنہ،

دوسرے فتویٰ کی اصل قاضی صاحب کی لکھی ہوئی، راقم سطور کے ذخیرہ میں محفوظ ہے،

آخر میں اراضی ہند کے متعلق مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید[1] اور مولانا رشید الدین

(بقیہ حاشیہ) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو حدیقۃ الافراح احمد بن محمد یمنی شروانی ص ۲۲۵، ۲۲۸، مطبع کلکتہ ۱۲۲۹ھ، سفینہ رحمانی عبد الرحمٰن حیرت جھنجھانوی ص ۶۶، ۶۷، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۰ء، فوائد الدہر مولوی کریم الدین پانی پتی ص ۳۸۸، مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء، تذکرہ مفتی الٰہی بخش قلمی مؤلفہ مولانا محمد سلیمان کاندھلوی، حالات بر اختتام مثنوی ص ۷۰۷، محمود المطابع کانپور ۱۳۱۹ھ، نزہۃ الخواطر ص ۷، ۸، مشائخ کاندھلہ طبع اشاعت دینیات دہلی، ص ۱۰۰-۱۱۲)

[1] شاہ محمد اسمٰعیل (بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ) فاروقی دہلوی۔ ۱۱۹۳ھ میں پیدائش ہوئی، بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، والد کے انتقال کے بعد شاہ عبد القادر کی تربیت میں آگئے، ابتدائی تعلیم کے بعد اکثر کتابیں شاہ عبد القادر سے اور کچھ شاہ رفیع الدین سے پڑھیں، حدیث شریف کا درس شاہ عبد العزیز سے لیا، ۱۶ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے، مولانا شہید ذکاوت و ذہانت اور قوت حافظہ میں بے مثل تھے، فنون سپہ گری اور تیراکی وغیرہ میں بھی (بقیہ حاشیہ صفحہ پر)

خانؒ وغیرہ علماے دہلی کے فتوے بھی شامل کردیئے ہیں، یہ مولانا ابوالحسن صاحب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) پچی تغیر نہ کئے تھے، دوسرا عقد ثانیہ کا نکاح شاہ عبدالقادر کی نواسی ام کلثوم سے ہوا، ان سے ایک صاحبزادے محمد عمر تھے جو ۱۲۶۸ھ میں لاولد انتقال کر گئے،

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ۱۲۳۴ھ میں حضرت سید احمد شہید متوفی ۱۲۴۶ھ سے بیعت ہوئے اور بیعت کے بعد سید صاحب کے ہو رہے، سید شہید کے ساتھ ہی جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ میں اللہ کے لئے راہ ہجرت میں قدم رکھا، اور اس راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کیا، بالآخر ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) کو اس پیمان وفا پر آخری مہر لگادی، اور سرزمین بالاکوٹ کو اپنے خون سے لالہ زار بنا کر فاطر السموات والارض کی بارگاہ میں جا پہنچے،

رد بدعت اور توحید و تصوف پر مشہورہ مفید اور بیش قیمت کتابیں شاہ اسمٰعیلؒ کی یادگار ہیں، شاہ صاحب شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، تعجب کہ اس وصف کا تذکرہ نگاروں نے بہت سرسری ذکر کیا ہے، شاہ صاحب کی ایک نعتیہ مناجات ۶۳ اشعار پر مشتمل اور حضرت سید احمد شہید کی شان میں اسی شعروں کا طویل قصیدہ مولانا محمد یحیٰی پھلتی متوفی ۱۳۰۵ھ کا نقل کردہ ۱۲۹۵ھ راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی ص ۹۴ (طبع بلالی اسٹیم سادھورہ) میں اس قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے آٹھ شعر نقل کئے ہیں، لیکن ہمارے پیش نظر قصیدہ اور مطبوعہ سوانح احمدی کی ترتیب بہت مختلف ہے، مولانا غلام رسول مہر نے بھی جماعت مجاہدین ص ۱۲۹ (طبع کتاب منزل لاہور) میں اس مناجات اور قصیدہ کا ذکر کیا ہے، مگر مولانا مہر کے خیال میں اس کی نسبت شاہ صاحب کی جانب مشتبہ ہے،

(ملاحظہ ہو ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں ص ۹۱۲، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۵ھ آثار الصنادید سر سید احمد خاں ص ۵۵-۵۹، نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۰ء، الیانع الجنی ص ۷۶، حیات ولی،
(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۰)

... سے تک گئے ... اور ہماری معلومات کی حد تک کہیں ...
نہیں ہوسکے ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص) ی مولوی رحیم بخش ص ۱۰۰-۲۰۳، مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء (مرزا حیرت دہلوی نے حیات طیبہ کے نام سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مفصل سوانحیات لکھی ہے مگر اس کے اکثر مندرجات تاریخی حیثیت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے، حیات طیبہ مولانا ابو الکلام آزاد نے دیکھی تو فرمایا، اس میں فرضی کہانیاں ہیں بلکہ جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بھی فرضی ہیں، کہیں وجود میں نہیں آئیں، (ملخص از ذکر مولانا آزاد، حیات شہید نمبر ماہنامہ الفرقان بریلی ۱۳۵۵ھ، جماعت مجاہدین مولانا غلام رسول مہر ص ۱۱۱-۱۱۲، کتاب منزل لاہور، سیرت سید احمد شہید مولانا سید ابو الحسن ندوی ص ۴۵۰، ۴۵۲، طبع اول مکتبہ تعمیر کتب لاہور ۱۹۷۵ء)

لہ مولانا رشید الدین (بن امین الدین متوفی ...) وحید الدین خاں دہلوی نے شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر سے تعلیم پائی، علم کلام اور ہیئت میں خصوصی دسترس حاصل تھی، دہلی کے انگریزی حکام نے عہدۂ قضا کی پیش کش کی، مگر مولانا نے قبول نہیں فرمائی، اور دہلی کالج میں مدرس ہوگئے، مولانا رشید الدین خاں نے ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی، بعض تذکرہ نگاروں نے مولانا کی وفات ۱۲۴۹ھ میں بیان کی ہے جو صحیح نہیں ہے،

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ فرائد الدہر ص ۲۰۰-۲۰۲، ابجد العلوم ص ۹۱۷، اتحاف النبلاء ص ۱۸۶، الیانع الجنی ص ۷۷، نزہۃ الخواطر ص ۱۷۷-۱۷۸/۷،

ردِ شیعہ میں متعدد رسائل لکھے، جن میں الشوکۃ العمریہ بہت مشہور ہے، کئی شیعہ علماء نے اس کے جوابات لکھے، مثلاً محمد قلی بن محمد حسین کنتوری نے الشعلۃ المعمریہ کے نام سے اور محمد بن دلدار علی لکھنوی نے الغرۃ البجلۃ کے نام سے، اس کے علاوہ بھی مولانا نے کئی تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، مولانا کی تالیفات میں سے اعانۃ المومنین

تحریر یادگار قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی

سوال بادشاہ اگر زمینے بکسے عطا کرد بیع و ہبہ وغیرہ تصرفات شرعی در آں جائز باشد یا نہ؟

(سوال) اگر بادشاہ کوئی زمین کسی شخص کو دے تو کیا اس زمین کو بیچنا اور ہبہ کرنا یا اس میں کوئی اور شرعی تصرف کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸) در اثبات المولد (در رد راجہ رام موہن رائے) مولانا نور الحسن بن مولانا ابو الحسن (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کاندھلوی کی نقل کردہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، مولانا کی ایک اور تالیف عزة الراشدین کا قلمی نسخہ بعض خاندانی بزرگوں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، مولانا رشید الدین کے ایک صاحبزادے مولانا سدید الدین تھے جو دلی کالج میں مدرس بھی رہے، (دیکھئے مرحوم دلی کالج ص ۱۴۰، ڈاکٹر مولوی عبد الحق، طبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء) افسوس ان کے مفصل حالات کہیں نہیں ملے،

[1] مولانا ابو الحسن (حسن) بن مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی نے اپنے والد بزرگوار سے تعلیم حاصل کی، علم فرائض، اور طب میں امتیازی شان رکھتے تھے، گوشہ نشین اور تارک الدنیا بزرگ تھے درس و تدریس کا مشغلہ رہتا تھا اور شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، مولانا کا کلام سادہ مگر پر تاثیر ہے مولانا کی مثنویوں میں محبت خداوندی کو جوش میں لانے کی بڑی صلاحیت ہے، حقائق و معارف میں کئی مثنویاں یادگار ہیں، مولانا حکیم عبد الحی لکھتے ہیں کہ لہ مزدوجات مشہورة بالہندیة فی الحقائق والمعارف علی نہج المثنوی المعنوی (نزہة الخواطر ص ۱۰ ج ۷) ان مثنویوں میں گلزار ابراہیم بہت مشہور ہے، گلزار ابراہیم اور اس کا دفتر اول مثنوی بحر الحقیقت کے نام سے مولف کی حیات میں پہلی بار طبع ہوا، اس کے بعد سے آج تک برابر چھپ رہا ہے، خصوصاً گلزار ابراہیم کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ اردو کی بہت کم کتابوں کے حصہ میں آیا ہوگا، دوسری تالیفات میں مثنوی جد و جہد، مثنوی بکھرے بول، منبع فیض العلوم اردو ترجمہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰ پر)

جواب اگر زمین موات کہ کسے مالک آں	جواب اگر افتادہ اور ویران زمین کا کوئی مالک نہ
زمین نباشد، بادشاہ شخصے عطا کرد	ہو اور بادشاہ اسے کسی کو دیدے اور زمین
ومعطی لہ آں زمین را احیا نمودہ معطی لہ	پانے والا اسے آباد اور قابل زراعت

(بقیہ حاشیہ ص) مثنوی مولانا روم (یہ بھی ایک بار طبع ہو چکا ہے) منظوم یادگار ہیں، طب میں بحران پر ایک رسالہ اور فرائض میں حل الغوامض کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف کی،

مولانا نے اپنا کلام بھی مرتب کیا تھا، اردو فارسی کلام کے مجموعے چند سال پہلے موجود تھے،

مولانا حسن کو حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے بڑی دلچسپی اور گہری وابستگی تھی، مولانا نے سید صاحب کی شان میں متعدد قصیدے کہے، اور ایک رسالہ جہادیہ لکھا، مولانا نے سید صاحب کی حج سے واپسی پر ایک طویل قصیدہ پیش کیا تھا، اس کے کچھ اشعار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی ص ۶۶-۶۹ طبع ہلالی پریس سادھورہ میں اور مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید ص ۲۴۲-۲۴۳ طبع اول کتاب منزل لاہور میں نقل کئے ہیں، مولانا حسن کی بیاض میں مکمل قصیدہ خود مولانا کا تحریر کردہ موجود ہے،

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے گلشن بیخار میں سعادت خاں ناصر نے خوش معرکہ زیبا میں اور شیر محمد خاں سرور نے عمدہ منتخبہ میں مولانا حسن کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ متعدد تذکرہ نگاروں نے بیان کا ذکر کیا ہے،

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ مولانا ہدایت اللہ فارسی سہرقی متوفی ۱۳۲۵ھ اور شاہ عظمت علی صابری جیسے علما آپ کے شاگردوں میں ہیں،

۱۲ جمادی الاخری ۱۲۶۵ھ ۲ اپریل ۱۸۴۹ء بروز چہار شنبہ کاندھلہ میں وفات پائی، حالات کیلئے دیکھئے سفینہ رحمانی قلمی تذکرہ مفتی الٰہی بخش مشمولہ خاتم مثنوی قلمی، نزہۃ الخواطر ص ۱۰۰، مشائخ کاندھلہ ص ۱۴۲-۱۴۴)،

مالک رقبۂ آں زمین می شود بعد
مردن معطی لہ بورثہ او می رسد و بیع
وغیرہ تصرفات در رقبۂ آں زمین جاری
می شود و عشر یا خراج آں زمین از
معطی لہ بادشاہ گیرد و در مصرف آں
خرچ کند و اگر معطی لہ مصرف عشر یا
خراج باشد جائز ست کہ بادشاہ
عشر و خراج آں زمین بمعطی لہ
بدہد و ہرگاہ خود از معطی لہ موقوف کردہ بدیگر
بدہد و اگر زمینے است مزروعہ بیت المال
و بادشاہ آں زمین را بشخصے مستحق بانعام بدہد
معطی لہ مالک رقبۂ آں زمین می شود و حکم
خراج آں زمین ہمان است کہ
بالا گذشت و اگر محصول آں زمین
برائے کسے بطریق عاریت تحریر
کردہ آں کس مالک آں زمین
نمی شود و بیع و ہبہ دراں جائز نیست
و اگر زمینے است مملوک دہقانان و خراج
آں زمین را بادشاہ در وجہ مدد معاش

بخش دے تو یہ شخص اس زمین کا مالک ہو جائیگا
اس کے مرنے کے بعد وہ زمین اسکے ورثہ کو ملیگی
اور اس میں بیع وغیرہ ہر قسم کے تصرفات ہو سکتے
ہیں، اس زمین کا عشر یا خراج لیکر بادشاہ
اس کے مصارف میں خرچ کریگا اور اگر زمین
والا خود عشر یا خراج کا مستحق ہو تو بادشاہ
کیلئے اس زمین کا عشر یا خراج اسے دیدینا
جائز ہے، لیکن اگر وہ شخص خود لینے سے
باز رہے تو بادشاہ دوسرے کو دے سکتا ہے،
اور اگر بیت المال کی کاشت کے لائق کوئی
زمین ہو اور بادشاہ اسے کسی مستحق آدمی کو ہمیشہ
کیلئے بطور انعام دیدے تو یہ شخص زمین کا
مالک ہو جائیگا اور اس کے خراج کا بھی وہی
حکم ہوگا جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے، لیکن اگر
اس زمین کی پیداوار کسی شخص کے لئے بادشاہ
نے عاریۃً تحریر کی ہو تو وہ شخص نہ اسکا مالک
ہوگا اور نہ ایسی زمین کی بیع و ہبہ جائز ہو
اور اگر کوئی زمین کاشتکاروں کی ملکیت میں
ہو اور اس کا خراج بادشاہ کسی مستحق شخص

کسے را بسبب استحقاق عطا کرد،
عطا ہو ید، غیر مو ید چنانچہ رسم بادشاہان
ہندوستان بیع و ہبہ و غیرہ تصرفات در آں
جائز است، چرا کہ خراج حصہ است
از حقوق... عہ... شئے موجود نیست لہٰذا
معطی لہ بعد قبض کردن غلہ خراج مالک
غلہ می شود پیش از قبض مالک نمی شود
پس بیع و ہبہ تصرفات شرعی در وے
و وراثت جائز نیست و بعد فوت
معطی لہ در وراثت نہ آید در اختیار
بادشاہ است یا نائب او کہ صدر است

کو گذر بسر کیلئے بطور مدد مستقل طور
یا غیر مستقل طور پر دیدے، جیسا کہ ہندوستان
کے بادشاہوں کا دستور ہے تو ایسی
زمین میں بیع و ہبہ وغیرہ ہر طرح کے
تصرفات جائز ہیں، کیونکہ خراج کی
حیثیت ایک شرعی حق کی ہے، .....
اس لئے جس کو خراج گذر بسر کے لئے دیا
گیا ہو وہ خراج پر قابض ہونے کے بعد پیداوار کا
مالک ہوگا، قبضہ سے پہلے مالک نہ ہوگا پس جو زمین
گذر بسر کیلئے بطور مدد دی گئی ہو اس میں بیع و
ہبہ یا اور کوئی شرعی تصرف جائز نہیں ہے اور نہ
مرنے کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی
بلکہ یہ بادشاہ یا اس کے قائم مقام شخص
کے جو صدر ہوگا، اختیار میں رہیگی،

روایات مختلفہ کہ در کتب فقہ در حق
عطائے سلطانی مرقوم است در صحت
روایات محکمہ نیست بلکہ باعتبار اختلاف
اقسام زمین است، محل جواز بیع

عطائے سلطانی کے متعلق فقہی کتابوں میں
جو روایتیں مروی ہیں، ان میں ضعف کا
احتمال نہیں ہے، بلکہ ان میں اختلافات
دراصل زمین کی قسموں کے اختلاف کی وجہ

عہ یہ لفظ واضح نہ ہو سکا

وغیرہ تصرفات دیگر است عمل
عدم جواز دیگر،
در بلدہ پانی پت کہ بیع مدد معاش
رواج دارد این بیع رواجی موافق
است موافق قاعدۂ شرع نیست
مگر بیع رقبۂ زمین کہ مالک قبضہ کند
شرعاً جائز و نافذ است
واللہ اعلم،

بیع ہبہ جانے یعنی بیع وغیرہ تصرفات کے جواز کا
عمل ہے اور عدم جواز کا دوسرا
اس شہر پانی پت میں مدد معاش کے لئے
دی جانی والی چیزوں کی بیع کا چلن ہے
ہے وہ شرعی قاعدے کے موافق نہیں ہے بلکہ
عرفی اور رواجی قاعدہ کے مطابق ہے البتہ
رقبہ زمین کا مالک جو بیع کر کے قبضہ دے شرعاً
جائز اور نافذ ہوگی، واللہ اعلم،

(۲)

مکتوب گرامی قاضی ثناء اللہ پانی پتی بنام مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی صاحب مشفق مہربان من سلامت!
بعد از سلام سنت الاسلام واضح
رائے گرامی باد سابق خط سامی
معہ سوال فتویٰ و حکمنامہ مہری
قاضی محمد اعلیٰ در بارہ حکم قاضی برطبق
دستور العمل بادشاہی در باب
مدد معاش رسیدہ بود و جواب اصل
خط مع جواب آں مسئلہ ہماں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے مشفق و مہربان مولوی صاحب!
سلام مسنون کے بعد معلوم ہو کہ آپ کا
پہلا خط مع استفتا ملا تھا، اس کے
ساتھ قاضی محمد اعلیٰ کی مہر لگا ہوا وہ
حکمنامہ بھی تھا جو مدد معاش کے بارہ میں
بادشاہ کے دستور العمل کی مطابقت پر
قاضی کے حکم کے بارہ میں تھا اس خط
استفتا کا جواب خط لانے والے کو تحریر

بودم خط نوشته فرستاده بودم
ظاہراً آں خط نزد آں مہربان نہ
رسیدہ، عبارت آں سوال و حکایت ہمہ
قاضی محمد اعلیٰ مفصل یاد نیست لیکن
فتویٰ ایں باب نوشتہ می شود کہ
زمین ہائے ہندوستان مثل اراضی
سواد عراق مملوک بادشاہ اسلام نیست
بلکہ مملوک مسلماناں نیز نیست بلکہ مملوک اہل آں زمین
است اگرچہ کفار باشند قال
فی الہدایہ،
ارض السواد مملوکۃ لاہلہا یجوز
بیعہم لہا و تصرفہم فیہا لان الامام
اذا فتح ارضاً عنوۃ و قہراً لہ ان
یقرّ اہلہا علیہا و یضع علیہا الخراج
فتبقی الارض مملوکۃ لاہلہا،
و خراج حقے است اسلامی تعلق
بزمین دارد، بادشاہ متولی اخذ
آں خراج است و صرف آں در
مخرج، اگر در غیر مصرف خرچ کند

کہ میں نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، مگر شاید وہ آپ
کو نہیں ملا، سوال کی عبارت اور قاضی
محمد اعلیٰ کے فتویٰ کی تفصیل تو یاد نہیں
رہی، تاہم اس بارہ میں فتویٰ تحریر
کیا جاتا ہے،
سواد عراق کی زمینوں کی طرح ہندوستان
کی زمینیں بھی نہ سلطان اسلام کی
ملکیت ہیں اور نہ مسلمانوں کی، بلکہ ان کے
مالک زمین والے ہی ہونگے خواہ یہ کافر
ہی کیوں نہ ہوں، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں،
سواد کی زمین زمین والوں کی ملکیت میں ہوگی
ان لوگوں کو اسے بیچنے اور اس میں تصرف
کرنے کا حق حاصل رہیگا کیونکہ جب امام کسی
زمین کو زبردستی فتح کرے تو وہ اس پر زمین
والے کے قبضہ کو برقرار رکھے گا، اور
اس پر خراج عاید کریگا، اس طرح زمین
پہلے کی طرح اپنے مالک کی ملکیت اور
تصرف میں رہیگی، زمین پر خراج
ایک اسلامی حق ہے، بادشاہ اسکو

ما لی باشد قال فی فتاوی الرحمانیہ
الامام کما یجوز الامساک عن الصرف
فکذا لا یجوز الصرف فی غیر المصرف

بیت المال سے اسکے مصرف میں خرچ کرنے کو روکنا
جائز ہے اگر وہ بیجا مصرف میں خرچ کرے تو روکا
ہوگا چنانچہ فتاویٰ رحمانی میں ہے کہ جس طرح
خرچ سے روکنا امام کیلئے جائز نہیں ہے
اسی طرح بیجا مصرف میں خرچ کرنا بھی
جائز نہیں ہے،

و خراج امرے است معدوم
تملیک آں ممکن نیست،
بادشاہاں کہ مدد معاش باہل
استحقاق می دہند حاصلش آنست
کہ ہرگاہ کہ خراج آں زمین
بدست آید آں مستحق آں خراج
را بگیرد و بعد قبض آں را
مالک شود قال فی فتاوی الرحمانی
اختلف العلماء فی حکم الوظیفۃ التی
یعطیہا الامام لبعض المستحقین من
خراج الارض وغیرہ ہل یملکہ
المعطی لہ قبل القبض عند الجمہور
لا یملکہ قبل القبض و یملکہ عند البعض

دراصل خراج ایک ایسی معدوم چیز
ہے جس کی تملیک جائز نہیں،
بادشاہ مستحقین کو گذر بسر کے لئے
جو کچھ دیتے ہیں اسکا حاصل یہ ہے کہ جب
بھی اس زمین کا خراج حاصل ہوگا تو مستحق
اس کو لے گا اور قبضہ کے بعد اسکا مالک
ہو جائے گا، فتاوائے رحمانی
میں ہے۔
بادشاہ بعض مستحقین کو زمین کے خراج وغیرہ
کی صورت میں جو انعام دیتا ہو اسکے حکم میں
بھی علماء کا اختلاف ہے کہ آیا قبضہ سے
پہلے ہی وہ شخص اس کا مالک ہو جائیگا
جسے انعام ملا ہے یا بعد میں؟ جمہور کے نزدیک

وفی المجمع و ہو موافق لفروعہن
الفقہیہ فان الاصل ان المعدوم
لا یصح تملیکہ و لا یصح من التصرفات
فیہ و لہذا لا یعطی لہ فرد من حق خراج
زمین جائز نیست و ہم در ارث
نمی آید قال فی الفتاوی الاحمدیہ
وغیرہا،
الاراضی التی اعطاہا الامام لرجل
علی وجہ الادرار والاستحقاق لا
یصیر ملکا لہ فلا تباع ولا توہب لا
تورث و لہذا یوضع الخراج فی
بیت المال عند موت المعطی لہ
فہی مفوضۃ الی رأی الامام
اوتابہ و کذا فی تاتارخانیہ والمحیط
پس بعد موت معطی لہ بادشاہ
وقت اگر خواہد بمستحق دہد
بوارث او بجویز کند و اگر خواہد بکسے

قبضہ سے پہلے مالک نہیں جیسا کہ
لوگوں کے نزدیک ہو جائیگا جیسا کہ
فقہی ضابطوں کے موافق ہے کیونکہ اصل
یہ ہے کہ معدوم کا مالک بنانا درست نہیں
تصرفات کرنا صحیح نہیں ہے اسی بنا پر
انعام پانے والے شخص کے لئے زمین کے
خراج کو فروخت کرنے کا حق نہیں ہے
اور اس کے اندر وراثت بھی نہیں ہوگی
فتاوٰی احمدیہ وغیرہ میں ہے کہ،
جن زمینوں کو امام استحقاق کے طور پر کسی
شخص کو دیدیتا ہے تو یہ شخص ان زمینوں کا
مالک نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے نہ ان کو
بیچا اور نہ ہبہ کیا جائیگا اور نہ ان میں
وراثت چلے گی بلکہ عطا کئے جانے والے
کی وفات کے بعد خراج بیت المال
میں داخل کر دیا جائیگا، فتاوی تاتارخانیہ
اور محیط میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح بیان ہوا ہے
پس اس کے مرنے کے بعد اگر بادشاہ
وقت مستحق سمجھے گا، تو اس کے ورثہ کو

دیگر بدهد یا اگر خواهد در بیت المال
محفوظ دارد، لیکن این حکم به بادشاه
حال تعلق دارد، بعد از آنکه بادشاه
میرد یا معزول شود حکم او معتبر نیست
از بسکه بادشاهان در همه
بلده خود نمی توانستند رسید لهذا صدور
مقرر کرده بودند و دستور العمل
نوشته داده بودند که موافق این
دستور العمل صدور وارثان معطی
له آراضی مدد معاش را تقسیم
می کرده باشند، آن دستور العمل
تا وقت حیات این بادشاه
جاری و معتبر است، صدور
بر آن عمل کند، و قاضیان هم حکم
صدور را که نائب بادشاه جاری
دارند، لیکن بعد موت آن
بادشاه آن دستور العمل معتبر
نیست،
و آنچه قاضی اعلیٰ نوشته اند که دستور العمل

اسے تجویز کر دیگا، اور اگر چاہے گا تو
دوسرے شخص کو دیدیگا، اور اگر چاہیگا
تو بیت المال ہی میں محفوظ رکھے گا
لیکن یہ واضح رہے کہ یہ حکم موجودہ
بادشاہ سے متعلق ہے، کیونکہ اگر بادشاہ
کا انتقال ہو جائے یا وہ معزول کر دیا
جائے تو اس کا حکم معتبر نہ ہوگا، خلاصہ کلام
یہ ہے کہ بادشاہ اپنی سلطنت کے تمام
شہروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے، اس لئے
وہ صدور کو مقرر کرتے، اور اپنا
دستور العمل تحریر کرتے تھے، اس کے
مطابق انعام پانے والے کے ورثہ
معاشی مدد کے لئے دی جانے والی زمینوں
کو تقسیم کرتے ہیں، یہ دستور العمل بادشاہ
کی زندگی تک جاری و معتبر سمجھا جاتا ہے،
صدور اسی پر عمل کرتے ہیں اور قضاۃ بھی صدور
کے حکم کو جاری کرتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ کے نائب
ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کی موت کے بعد وہ دستور العمل معتبر نہیں رہتا
باقی قاضی اعلیٰ نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ

شاہجہانی منسوخ گشتہ و دستور العمل
عالمگیری معتبر ماندہ، این سخن
اصلی ندارد و در فہید ما نمی آید
معتبر تجویز بادشاہ حال است،
اگر در زمانہ بادشاہ حال مسلط
نباشد دران صورت مدد معاش
ہاے این دیار دو قسم اند،
یکے آنست کہ زمینداران از
قسم گوجر و جاٹ و مانند آن
بران قابض اند چنانچہ در دیہات
و ملکے و خراج آن زمین از
زمیندار بگیرند، این قسم خراج
بیع و ہبہ در بیع نمی تواند آید مگر
مگر آنکہ بطریق عرف آنچہ میگیرند
میگیرند،
و قسم دیگر مدد معاش آن است
کہ در اکثر قصبات است کہ زمیندا
سوای ملکیان کسے دیگر نیست
و ہمان ملکے زمیندار است درین

شاہجہانی دستور العمل منسوخ ہو گیا ہے اور
عالمگیری دستور العمل معتبر ہے تو اس کی کوئی بنا
نہیں یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی موجودہ
بادشاہ کی تجویز کا اعتبار ہوتا ہے، اگر کسی
زمانے میں بادشاہ کا تسلط باقی نہ ہو تو ایسی
صورت میں اس علاقہ کی گذر بسر کیلئے دی جانیوالی
امدادی زمینوں کی دو قسمیں ہیں :
پہلی قسم ان زمینوں کی ہے جن پر گوجر جاٹ
یا اور قوموں کے زمیندار قابض ہوتے ہیں
دیہات اور دوسرے علاقوں میں
ان زمینوں کا خراج زمیندار سے لیا
جاتا ہے، اور اس طرح کے خراج کو
کسی صورت میں فروخت نہیں کیا جا سکتا
ہے بجز اس کے کہ لوگ رواج کے مطابق
جو کچھ حاصل کر لیں، کر لیں،
معاشی امداد کے لئے دی جانیوالی زمینوں
کی دوسری قسم میں اکثر قصبات کی وہ
زمینیں ہیں جن کے مالک زمیندار کے سوا
اور کوئی نہیں ہوتا ایسی صورت میں اگر

صورت اگر آں ملکی زمین فروخت
شود بحکم زمینداری بیع او
جائز است و ہم وراثت می باشد
و موافق فرائض حصہ تقسیم کردہ
بدہد، و خراج ایں زمین چو کسے
بادشاہ مسلط نباشد ہماں مشتری
می خوردہ باشد کہ حق اخذ خراج
مر بادشاہاں راست با کسے کہ
بادشاہ حال بسے تجویز کردہ
بدہد، دریں صورت کسے را
دعوی مزاحمت نمی رسد
در عہد محمد شاہ بادشاہ چوں
بادشاہ حال دستور العمل عالمگیری
را مسلم داشتہ باشد آنرا دستور العمل
ہم بادشاہ حال شدہ و اگر
خلاف دستور العمل ہم بادشاہ
تجویز کردہ بدہد آں تجویز ہم جائز
باشد غرضیکہ ایں امر بابت خراج
کسے را با دیگرے بدوں حکم حدیثہ

مالک اپنی زمین کو فروخت کرسکیگی
بیع زمینداری کے قاعدہ سے جائز ہے
اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی
اور وارثوں کے مقرر کردہ قاعدہ کے مطابق
ان کی تقسیم بھی ہوگی، اگر کوئی بادشاہ
نہ ہو تو ایسی زمین کا خراج خود خریدنے
والا کھائیگا، اور اس میں کوئی شخص مزاحمت
نہیں کرسکتا کیونکہ خراج لینے کا حق
صرف بادشاہ کو ہے یا ایسے شخص
کو جس کو موجودہ بادشاہ نے
تجویز کیا ہو،
سلطان محمد شاہ نے اپنے دور میں عالمگیری
دستور العمل کو باقی رکھا تھا، اس لیے یہی
کہ موجودہ دستور العمل سمجھا جائیگا اور
اگر موجودہ بادشاہ اس کے مخالف
دستور العمل کو تجویز کرے تو یہ بھی جائز
ہوگا، غرضیکہ خراج کے معاملہ میں موجودہ
بادشاہ کے حکم کے بغیر محکمہ قضا میں کسی
شخص کا دوسرے شخص پر دعوی نہیں

بادشاہ و صدر [illegible]

نیست، در این ایام احوال بادشاہ
معلوم نیست و صدر جزو از مدتی
در پرگنات نیست کہ در تجویز مدد
معاش و در نائب بادشاہ گرفتہ شود
اگر کسی نزد صدر الصدور می رود
صدر الصدور را نہ ملاحظہ دستور العمل
است، نہ ملاحظہ اجازت بادشاہ
نہ دریافت استحقاق ہر کس کہ رود
دو روپیہ می دہد و نوشتہ می دہد
اگر طرف ثانی می رود و از دہم دو
روپیہ گرفتہ نوشتہ می دہد، نوشتہ
را چہ اعتبار

و قاضیان حاکمان شرع اگر حکم
کنند موافق شرع حکم کنند، اگر
تجویز صدر جز یا تجویز بادشاہ مستحق
باشد قاضی اگر تجویز را جاری نمایند

[illegible] بادشاہ کے

حالات معلوم نہیں اور عرصے سے
ہیں ایسے صدر بھی نہیں ہیں جو
معاشی امداد کی تجویز میں بادشاہ کے
نائب کہلائے جا سکیں، اگر کوئی
اگر کوئی صدر الصدور کے پاس جاتا
ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ اسے نہ
نہ دستور العمل کو دیکھا ہے اور نہ اسے
بادشاہ ہی کی اجازت حاصل ہے اور
نہ وہ یہ جانتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے جو
شخص اس کے پاس جاتا ہے دو روپے
دیتا ہے اور اس کے لئے فرمان جاری
ہو جاتا ہے اگر فریق ثانی بھی جائے
تو دو روپیہ لیکر اس کو بھی نوشتہ دیدیا
جاتا ہے، ظاہر ہے ایسے نوشتہ کا کیا اعتبار
قاضیوں کی حیثیت شرعی حکام کی
ہے، وہ اگر فیصلہ کرتے ہیں تو شرع کے
مطابق کرتے ہیں، اگر صدر یا بادشاہ
کی تجویز سے کوئی شخص مستحق قرار پا

این امر گنجایش ندارد که در این هم
حکم شرع است و اگر نه خود قاضی
را موافق دستور العمل یا خلاف آن چیزی
تجویز کردن و حکم نمودن نمی رسد
که قاضیان در این ماده نائب
بادشاه نیستند،

شاہ محمد اسحٰق
۱۲۱۱

سے تو قاضی اس تجویز کو جاری کر سکتا
ہے ورنہ اس کیلئے صرف اسی قدر گنجائش ہے کہ
باقی قاضی کو دستور العمل کے موافق
یا مخالف کوئی چیز تجویز کرنے اور حکم جاری
کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ قاضی بادشاہ
کے نائب نہیں ہوتے،

(۳)

فتوی مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید و مولانا رشید الدین خان وغیرہ علمائے دہلی

لو اعطی الامام لفقیر مستحق شیئا
من الارض المیتة فاحیاہ
باذنه هل یصیر ملکا له ام لا؟

اگر امام کسی مستحق اور ضرورت مند شخص کو افتادہ
زمین میں سے کچھ دیدے اور وہ امام کی اجازت سے
اسکو آباد کردے تو کیا یہ شخص اس زمین
کا مالک ہوگا یا نہیں؟

الجواب: قال نعم وکذا لو اعطی الامام
فقیر مستحق شیئا من الارض
النامیة یصیر الفقیر مالکا له
لانه بمنزلة التصدق والفقیر
یملک التصدق باستحقاقه
کذا هذا، و لو باع الفقیر هذا

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں وہ مالک ہو جائیگا
اسی طرح اگر امام کسی محتاج مستحق کو کوئی
آباد اور نفع بخش زمین دے تو محتاج اسکا
مالک ہو جائیگا کیونکہ اسکی حیثیت صدقہ
کی ہوگی اور ضرورتمند اپنے استحقاق کی
وجہ سے صدقہ کا مالک ہو جائیگا اور اگر

جندها قطعة جلد بیع و شراء منه لا بد
بیلکه وهو الصحیح و ذکر فی الکبری
اذا اعطی السلطان ارضا رجلا
استحقاقا لا یصیر ملک الارض
ملکا له ولا یجوز بیعها الا تری
انه اذا مات ذلک الرجل یوضع
خراج الارض المذکور فی بیت
المال وهکذا اختاره صاحب الذخیرة
لکن الفتوی فی زماننا علی الروایة
الاولی لان العرف شاهد لها
والفتوی یتغیر بتغیر الزمان من
فتاوی مختصر شاہی ۔

قطعہ زمین بیع وشرا اس کی
خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ وہ اس کا
مالک ہے، یہی صحیح فتوی ہے، مگر
کبری میں مذکور ہے کہ جب بادشاہ
کسی شخص کو استحقاق کی وجہ سے کوئی
زمین دے تو وہ اس زمین کا مالک نہ
ہوگا اور نہ اس کی بیع جائز ہوگی،
کیونکہ جب یہ شخص فوت ہو جائیگا
تو مذکورہ زمین کا خراج بیت المال
میں داخل کیا جائیگا، صاحب ذخیرہ
کا مختار قول یہی ہے، لیکن ہمارے
زمانہ میں فتوی پہلی روایت پر ہے،
کیونکہ وہ رواج کے مطابق ہے، اور
زمانہ کے تغیر سے فتوے بھی بدل
جاتے ہیں (دیکھو فتوی مختصر شاہی کلام)

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

فتح اسیر گڈھ کا کتبہ

از

جناب مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو فارسی سیوا سدن کالج برہان پور

(۲)

شہنشاہ اکبر کے ۱۰۰۸ھ میں برہان پور پہنچنے کا ایک تاریخی ثبوت یہ بھی ہے کہ مستند تاریخی کتابوں کی صراحت کے مطابق حضرت سید احمد گیسو دراز کے پوتے حضرت سیدی صاحب، اکبر کے طبیب خاص حکیم مصری، خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی والدہ ماہم انگہ (جو شہنشاہ اکبر کی رضاعی والدہ تھی)، سندھ کے معزول بادشاہ مرزا جانی اور جون پور کے نواب بابا بیگ جلایر کی وفات ۱۰۰۸ھ میں اسیر گڈھ کے دوران محاصرہ میں ہوئی تھی۔ ان میں سے سیدی صاحب بہادر شاہ کی فوج میں ملازم اور قلعۂ اسیر میں محصور تھے، باقی کے چاروں اکبر کے ساتھ برہان پور آئے تھے، چونکہ اسیر گڈھ کا محاصرہ اکبر کے برہان پور پہنچنے کے بعد ہوا تھا، اس لئے اکبر کے ورود برہان پور کا ۱۰۰۸ھ ہی تھا نہ کہ ۱۰۰۹ھ،

مینار کے اس کتبہ میں اکبر کے ورود برہان پور کی صحیح تاریخ پڑھنے میں اکثر حضرات کو دھوکا ہوا کتبہ میں فرودین کی تاریخ کا ۲۱ کا ہندسہ کسی قدر محو ہوگیا ہے، جسے اکثر حضرات نے ۱۱ پڑھا ہے، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کتبہ میں بائیں جانب کا ہندسہ ۲ صاف نظر آتا ہے، جس سے ابوالفضل

سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہنشاہ اکبر ۲ فروردین کو وارد برہان پور ہوا تھا، اسی طرح کتبہ میں رمضان کی تاریخ درج نہیں ہے، لیکن پڑھنے والوں نے اسے ۵ رمضان پڑھا ہے، اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہوئی کہ کتبہ میں رمضان کی "ر" کا کچھ حصہ مٹا ہوا سا ہے، اس لئے اکثر حضرات نے اسے ۵ کا مٹا ہوا ہندسہ سمجھ کر اکبر کے ورود برہان پور کی تاریخ ۵ رمضان قرار دی ہے، جو غلط ہے، کیونکہ اگر اسے ۵ مانیں تو پھر رمضان کی "ر" کہاں ہے، ؟

اب رہا اکبر کی آمد کا ہجری سنہ تو اگر کتبہ کی تحریر کے مطابق ۱۰۰۹ کو صحیح مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسیر گڈھ ایک ہی مہینہ میں فتح ہو گیا تھا، کیونکہ کتبہ کے مضمون اور انداز بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں شہنشاہ اکبر کی آمد آمد تھی، برہان پور کا بادشاہ بہادر خاں فاروقی عید کے چاند کی طرح اس کا انتظار کر رہا تھا جب شہنشاہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۰۰۹ھ میں برہان پور پہنچا تو بہادر خاں نے جھٹ آکر قدم بوسی کی عزت حاصل کی اور بکمالِ عقیدت اسیر گڈھ نذر کر دیا، جسے شہنشاہ نے فتحِ اسیر سے تعبیر کیا، یہ معاملہ ہنسی خوشی انجام پا گیا، نہ کوئی جنگ ہوئی نہ کسی قسم کی مزاحمت، چند روز عید کی ملاقاتوں میں گزار کر شہنشاہ اکبر ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ میں لاہور چلا گیا، اس طرح یہ سب کارروائی بخیر و خوبی ایک مہینہ میں انجام پا گئی، حالانکہ تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً گیارہ ماہ تک اسیر گڈھ کا محاصرہ رہا اور اس دوران میں سخت جنگ بھی ہوتی رہی، قلعہ سے گولے برستے رہے، اور قلعہ کے باہر راجپوتوں اور کولیوں کے چھاپہ مار دستے مغل فوج کا ناک میں دم کرتے رہے، اس طویل عرصہ میں اکبر کے بے شمار سپاہی قتل ہوئے، اور بے حساب سامان لوٹا گیا، ظفر الوالہ کے الفاظ میں اس جنگ کا حال سنئے،

"والعساکر تخرج من الباب   (بہادر شاہ فاروقی کی) فوجیں

وتحارب المغل وترجع	(قلعہ کے) دروازہ سے نکل کر جنگ
والبنادق والمدافع من الابراج	کرتیں، اور واپس آتی تھیں تینوں
الحصار الاول والثانی و	حصاروں[1] کے برجوں سے بندوقیں
الثالث لا تزال تطعن	اور توپیں (دشمنوں کو) مسلسل
الی ان هلک جم غفیر	نشانہ بناتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ
من النازلین علی القلعة	حملہ آور فوج کا جم غفیر ہلاک ہوگیا
مع الامیر الکبیر میرزا	ہلاکین میں امیر کبیر مرزا خرم بھی
خرم ابن الخان الاعظم	شامل تھا، جو خان اعظم مرزا عزیز
عزیز کوکلتاش بن	کوکلتاش کا فرزند اور شمس الدین
شمس الدین محمد اتکه	محمد اتکہ خاں کا پوتا تھا، اگرچہ
خان مع ان عسکر	(بہادر شاہ فاروقی کی) میدانی
السهل لحق بالمغل	فوج مغلوں کی اطاعت کرکے
انقطعت الطرق و	اُن سے مل گئی تھی، (اس لئے اس
ذلک لانه سکنة الارض	سے مغلوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا)
من الراجپوت وهم اهل	پھر بھی راستے مخدوش ہوگئے تھے،
الجبل فیها والکولی وهم	کیونکہ مقامی باشندوں میں سے

---

[1] قلعۂ اسیر میں تین حصار ہیں، پہلا کوہِ اسیر کی زیریں بلندی پر ہے، دوسرا درمیانی بلندی پر اور تیسرا انتہائی بلندی پر، یہ بالترتیب مالی گڈھ، کمرگڈھ اور اسیرگڈھ کے حصار کہلاتے ہیں،

وجل اجتمعوا على القتل
والسلب، فهلك بهم من
خيل السلطنة ورجلها و
اتباعها والمتوجهة اليها
من سائر الاصناف ما
لا يحصى كثرة۔ وتموّل
سكنة الارض وملكوا من
الخيل والجمال والاقمشة
والاثاث والاسباب
ما صار لهم شان ورياسة

راجپوت سواروں اور کولی پیادوں
نے متفق ہو کر (مغلوں کو) قتل و
غارت کرنا شروع کر دیا تھا، اس
نے شہنشاہ اکبر کے سوار، پیادے
نوکر چاکر، اور اس کی طرف آنے
والے ہر قسم کے لوگ اس کثرت سے
ہلاک ہوئے کہ اُن کا شمار ناممکن ہے
مقامی باشندے یعنی راجپوت اور کولی
(لوٹ کے مال سے) مالامال ہو گئے
اور اُن کے قبضہ میں اتنے اونٹ
گھوڑے اور دیگر سامان و اسباب
آیا کہ وہ صاحب حیثیت رئیس بن گئے

جب شہنشاہ اکبر اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود ناکام رہا تو اس نے دھوکہ سے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا، چنانچہ اس نے بہادر شاہ فاروقی کو اس کی سلطنت پر قائم رکھنے کی ضمانت دیکر ملنے کے لئے بلایا، بہادر شاہ اسے ایک سیاسی چال سمجھ کر قلعہ سے اترنے پر راضی نہیں ہوا، ادھر قلعہ میں غلہ سڑ گیا تھا، اور ہیضہ پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے اہلِ قلعہ پریشان تھے، اور مصالحت کے ذریعہ اکبری حملہ کی مصیبت سے نجات پانا چاہتے تھے۔ اس لئے عرب سردار لجاج یانی نے بہادر شاہ سے کہا کہ جب شہنشاہ ہند آپ کو سلطنت پر قائم رکھنے کا وعدہ کر کے ملنے کے لئے بلا رہا ہے، تو آپ کو اس سے ملنے میں کیا عذر ہے، اگر آپ قلعہ سے اتر کر اس کے

پاس نہیں گئے تو ہم آپ کو (زبردستی) اتار کر اس کے پاس لیجائیں گے، ظفر الوالہ کے الفاظ یہ ہیں، قال لبہادر ما یمنعک من الاجتماع بسلطان الہند وھو یعدک بابقاءک فی الملک ۔ وان لم تنزل الیہ نزلنابک الیہ"

آخر کار طویل بحث ومباحثہ کے بعد بہادر شاہ کا معتبر امیر سادات خاں شاہی اجازت لے کر شہنشاہ اکبر سے عہد وپیمان لینے کے لئے قلعہ سے اترا لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری کی اور شہنشاہ سے اپنی جان ومال کی امان لے کر اسے قلعہ کے تمام اندرونی حالات سے آگاہ کر دیا، اس کے بعد بہادر شاہ کا دوسرا معتبر امیر مقرب خاں شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا شہنشاہ نے اسے اپنی عنایتوں سے نوازا، اور "وعدہ علی وصولہ بقاء ملکہ لہ" یعنی اس سے وعدہ کیا کہ اگر بہادر شاہ ملنے آئے گا تو اس کی سلطنت اس کے پاس قائم رکھی جائے گی مقرب خان قلعہ میں واپس گیا۔ اور بہادر شاہ کو اکبر سے ملنے پر آمادہ کر لیا، بہادر شاہ اکبر کے وعدہ پر بھروسہ کر کے اپنے وزرا، اور رام داس درباری کے ساتھ قلعہ سے اتر کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے وعدہ خلافی کر کے اسے اپنی حراست میں لے لیا جب اہل قلعہ کو یہ خبر ملی تو انھوں نے تقریباً ایک مہینہ تک قلعہ کی مدافعت کی، قلعہ میں بہادر شاہ کا معتبر امیر مقرب خاں کا باپ یاقوت سلطانی بھی تھا، جو نہایت شجاع و غیور تھا، وہ شاہی خاندان کے افراد سے ملا، اور کہا کہ ابھی تک قلعہ محفوظ ہے اور جنگ کی استعداد بھی بدستور ہے، تم میں سے کون عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے آبا واجداد کی عزت بچاتا ہے، ؟ لیکن کوئی آمادہ نہیں ہوا، اس پر اس نے کہا "لیتکم نساءً فتعذروا" یعنی کاش تم عورتیں ہوتے، تاکہ معذور سمجھے جاتے، اتنے میں اس کا فرزند مقرب خاں شہنشاہ اکبر کا پیغام لے کر اس کے پاس آیا، تو اس نے ملنے سے

انکار کر دیا، اور کہا کہ خدا مجھے تیری صورت نہ دکھائے تو بہادر شاہ کو ساتھ لے کر قلعہ سے اترا اور اُسے حراست میں چھوڑ کر آ رہا ہے۔ مقرب خاں کو باپ کے طعنہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ قلعہ سے اتر کر ابوالفضل کی محفل میں گیا اور پیٹ میں خنجر مار کر خودکشی کر لی۔ ادھر یاقوت سلطانی نے شاہی خاندان کے رویہ سے مایوس ہو کر دشمن کی محکومی کی ذلت پر عزت کی موت کو ترجیح دی۔ چنانچہ اُس نے اپنی تعمیر کردہ مسجد میں بڑی دیر تک نماز پڑھی، پھر خیرات کی۔ اسی مسجد کے قریب اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی، اپنا کفن تیار کیا، پھر عزیزوں کو وصیت کرنے کے بعد افیون کھا کر خودکشی کر لی، اور اسی قبر میں دفن کیا گیا۔ ظفر الوالہ کے بیان کے مطابق اہلِ قلعہ نے تقریباً ایک مہینہ تک مدافعت کرنے کے بعد جان و مال کی امان لے کر قلعہ حوالہ کر دیا، لیکن قیاس ہے کہ یہ مدافعت صرف اٹھارہ روز تک جاری رہی جس کا ثبوت نامی کے اس کتبہ سے ملتا ہے جو جامع مسجد اسیرگڈھ میں داخل ہوتے وقت درمیانی کمان کے ایک ستون پر نظر آتا ہے۔ اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیرگڈھ ۶ بہمن سنہ ۴۵ الٰہی میں فتح ہوا، اور شہنشاہ اکبر ۲۴ بہمن کو قلعہ میں داخل ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اکبر نے جب قلعہ کو اتنی جانفشانی کے بعد حاصل کیا، اس میں داخل ہونے میں اٹھارہ روز کی تاخیر کیوں کی؟ غالباً بہادر شاہ ۶ بہمن کو اکبر کی حراست میں آ گیا، جسے نامی نے فتح اسیر سے تعبیر کیا، لیکن چونکہ اہلِ قلعہ نے ۱۸ روز تک مدافعت کی، اس لئے اکبر کو ۲۴ بہمن کے پہلے قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے اس کتبہ کی پوری عبارت درج ذیل ہے،

"بتاریخ ۶ بہمن ماہ سنہ ۴۵ الٰہی موافق ۲۲ رجب قلعۂ اسیر مفتوح شد و بتاریخ
۲۴ ماہ مذکور موافق ۱۰ شعبان حضرت خاقانی ظل سبحانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ
غازی بمقدم شریف آن را مزین ساختند۔"

ز بخت جوان فتح آسیر کرد — جہاں بخش شاہ اکبر ملک گیر

چو نامی طلب کرد تاریخ فتح — خرد گفت بگرفته کوه اسیر

قائلہ کاتبہ محمد معصوم بکری ابن سید صفائی الترمذی، المنتسب ابًا الی سید شیر بابا حسن ابدال السبزواری اصلاً والقندھاری مرقدًا ؎

جامع مسجد برہان پور کے جنوبی مینار کے کتبہ سے پہلے ہی معلوم ہو چکا کہ شہنشاہ اکبر ۲ر فروردین ۴۵ سنہ الٰہی میں وارد برہان پور ہوا تھا، اب جامع مسجد اسیرگڑھ کے اس کتبہ سے واضح ہو گیا وہ ۲۴ بہمن ۴۵ سنہ الٰہی میں مکمل قبضہ کے بعد قلعۂ اسیر میں داخل ہوا تھا، فروردین فصلی سنہ پہلا مہینہ ہے، اور بہمن گیارہواں مہینہ۔ اس لئے ان دونوں کتبوں کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ئی کہ اسیرگڑھ پر گیارہ مہینے میں قبضہ ہوا، اسی سے ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جامع مسجد ہان پور کے مینار پر اکبر کے ورود برہان پور کا جو ہجری ۱۰۰۹ھ سنہ تحریر ہے، وہ سہو قلم کا ہ ہے حقیقت یہ ہے، کہ شہنشاہ اکبر ۲۴ر رمضان المبارک ۱۰۰۸ھ میں برہان پور ا، ۸ر شعبان المعظم ۱۰۰۹ھ میں قلعہ پر مکمل قبضہ ہوا، اور وہ ۲۶ر شوال ۱۰۰۹ھ میں پور روانہ ہو گیا، اس طرح یہ مہم ایک مہینہ کے بجائے تقریباً ایک سال میں انجام پذیر ئی۔

آئیے اب ایک نظر کتبہ کے ترقیمہ پر بھی ڈال لیجیے، کتبوں میں کاتب کا نام کتبہ کے خاتمہ میں آتا ہے، جس کے بعد کوئی عبارت نہیں آتی، نامی نے بھی دیگر کتبوں میں س اصول کی پابندی کی ہے، مگر اس کتبۂ مینار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کاتب کا م ونسب خلاف دستور کتبہ کے درمیان میں آیا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نامی کو بہ میں جو نیا مضمون تحریر کرنا تھا، وہ سب مع نام ونسب تحریر ہو چکا ہے اور مینار پر

دو سطروں کی جگہ باقی رہ گئی، تو اس نے اس جگہ تازہ قلم کے طور پر اکبر کے لاجواب کارنامے تحریر کردیا،

فتح اسیرگڈھ کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ بہادر شاہ فاروقی کی حکومت شہنشاہ اکبر نے چھینی، جس کی حمایت میں بہادر شاہ کے والد عادل شاہ فاروقی، اس کے ۵۰ نامی سرداروں اور بے شمار سپاہیوں نے ۱۰۰۵ھ میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی متحدہ فوج سے لڑتے ہوئے ناندیڑ کے میدان جنگ میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، پھر لطف یہ ہے کہ بہادر شاہ، شہنشاہ اکبر کا بھی عزیز تھا، اور فاتح اسیرگڈھ ابوالفضل کا بھی، چنانچہ شہزادہ مراد کی بیوی بہادر شاہ کی بیٹی تھی، اور بہادر شاہ کی بیوی ابوالفضل کی بہن، سچ ہے انسان حرص دنیا میں مبتلا ہو کر نہ کسی کے احسان کا خیال کرتا ہے، نہ رشتہ کا لحاظ،

شہنشاہ اکبر نے اسیرگڈھ فتح تو کر لیا لیکن اس شاندار فتح کا نتیجہ اس کے حق میں عبرت خیز نکلا، کیونکہ فتح اسیر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نہ خاندیس کی سلطنت پر قبضہ کرنے والا شہنشاہ اکبر رہا، نہ فاتح اسیرگڈھ ابوالفضل جو اس مہم میں اکبر کا سپہ سالار تھا، نہ شہزادہ دانیال جسے خاندیس کا صوبہ دار بنایا گیا تھا، یہ تینوں یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے، اور حسرتناک موت مرے، سب سے پہلے ابوالفضل کی باری آئی، فتح اسیرگڈھ کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شاہزادہ سلیم (جہانگیر) نے دوبارہ بغاوت کی، اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اکبر نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے ابوالفضل کو دکن سے طلب کیا، وہ اکبر کی طلب پر احمد نگر سے آگرہ جا رہا تھا، اسے نرسنگھ دیو بندیلہ نے شہزادہ سلیم کے ایماء سے یکم ربیع الاول ۱۰۱۱ھ میں بمقام انتری بے دردی سے

قتل کر دیا،

ابوالفضل کے دردناک قتل کے ٹھیک پونے دو سال بعد شہزادہ دانیال کی حسرتناک موت واقع ہوئی، جسے شہنشاہ اکبر نے فاروقیوں سے چھینی ہوئی سلطنت خاندیس کا مالک و مختار بنادیا تھا، اور جس کے نام پر خاندیس کا نام داندیس یعنی دانیال کا دیس رکھ دیا تھا، شہزادہ کی زندگی عیش و عشرت میں گذر رہی تھی، اور اُس کی صحت کثرتِ مے نوشی سے برباد ہوگئی تھی، اس کے بھائی شہزادہ مراد کی زندگی بھی عین عالمِ شباب میں اسی شرابِ خانہ خراب کی نذر ہوچکی تھی، جب شہنشاہ کو اس کی خبر ہوئی، تو اُس نے دانیال کے خسر عبدالرحیم خانِ خاناں کو جو اس کا اتالیق بھی تھا، فرمان بھیج کر تاکید کردی کہ اس کی شراب نوشی پر پابندی عائد کردی جائے خانِ خاناں نے محل پر پہرہ بٹھا کر شراب کا داخلہ بند کرادیا، دانیال شراب کے لئے تڑپنے لگا، تو اس کے نوکر مرشد قلی خاں کو ترس آیا، شہزادہ کی ایک پسندیدہ بندوق تھی، جس کا نام اس نے یکہ و جنازہ رکھا تھا، اور اس پر اپنا یہ شعر لکھوایا تھا،

از شوقِ شکارِ تو شود جان تر و تازہ ‏ ‏ ‏ ‏ بر ہر کہ خورد تیرِ تو یکہ و جنازہ

مرشد قلی خاں وہی بندوق لے کر محل سے نکلا، اور اس کی نالی میں شراب بھر کرلے آیا، پہرہ والوں کو شبہ نہیں ہوا، شہزادہ ساری شراب غٹ غٹ پی گیا، اور پیتے ہی لوٹ پوٹ ہوکر موت کا شکار ہوگیا، کیونکہ بندوق میں لوہے کا میل اور بارود کا دھواں جما ہوا تھا، جس سے شراب زہر آلود ہوگئی تھی، افسوس اُس نے اپنی جس بندوق کا نام یکہ و جنازہ رکھا تھا، اسی نے اس کا جنازہ نکال دیا، اور اُس نے عین عالمِ جوانی میں اپنی جانِ عزیز شرابِ خانہ خراب پر قربان کردی، شہنشاہ اکبر جو پہلے ہی اپنے والدہ کی رحلت، شہزادہ مراد اور

ل دربار اکبری ص ۵۰۵،

اور بادشاہ کی عبرتناک موت سے شہزادہ سلیم کی پہلے بغاوت سے شکستہ دل شہنشاہ دانیال کی اس عبرتناک موت کے صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور اس سانحہ کے چھ ماہ بعد بعد حضرت عیسیٰ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را — چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

بزرگان دین سے عقیدت رکھنے والوں کا یہ خیال ہے کہ فتح اسیر گڑھ کے بعد اکبر کی پے در پے پریشانیوں کا سبب برہان پور کے اولیائے کرام کی دل آزاری ہے۔ اکبر نے اسیر گڑھ فتح کیا تو برہان پور کے اکثر مشائخ پر فاروقی بادشاہ کی حمایت کا الزام لگا کر انھیں قید و بند کے مصائب میں مبتلا کر دیا۔ اس نے مسیح الاولیا حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہؒ کو جو اپنے زمانہ کے غوث تھے، دیگر بزرگان دین کے ساتھ آگرہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔ انھیں مسیح الاولیاؒ کے مرید و خلیفۂ خاص حضرت عبداللہ سندھیؒ جو اپنے پیر کے حسب الحکم گجرات جا کر خلق خدا کی ہدایت میں مصروف تھے، ایک عرصہ کے بعد اپنے پیر کی اجازت سے برہان پور آئے تھے، اکبر نے انھیں بھی شاہ برہان پور کی حمایت کا الزام لگا کر قید کر لیا اور آگرہ لے جا کر قید خانہ میں بند کر دیا۔ وہ ایک عرصہ کے بعد حضرت غوث الاولیاء کے فرزند کی سفارش پر رہا ہوئے، مگر برہان پور آنے کی اجازت نہیں ملی، آخرکار وہ سنہ ۱۰۱۰ھ میں پنجاب میں راجپوتوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اب سب سے آخر میں ان اشخاص کا مختصر تعارف ضروری ہے، جن کا اس کتبہ میں ذکر آیا ہے، اور وہ شہنشاہ اکبر کے علاوہ بہادر خاں، بابا حسن ابدال، سید شیر قلندرؒ محمد معصوم نامی ہیں۔

بہادر خاں (بہادر شاہ فاروقی) :۔ یہ خاندیس کے سلاطین فاروقیہ کے سلسلہ کا آخری

بادشاہ تھا، جو اپنے والد عادل شاہ فاروقی کی وفات کے بعد ۱۰۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، برہان پور سے ۱۰ میل دور بہادر پور آباد کر کے اسے اپنا دارالخلافہ بنایا، شہنشاہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ میں حملہ کر کے اسیر گڑھ کا محاصرہ کیا، اور ۱۰۰۹ھ میں اس کی سلطنت پر قبضہ کر لیا، اس طرح خاندیس کی فاروقی سلطنت جو ۲۲۵ سال سے قائم تھی ختم ہو گئی،

بہادر شاہ صوم و صلاۃ کا پابند، فیاض، اور غرباء کا ہمدرد تھا، اور ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ رکھتا تھا، لیکن وہ اپنے والد کی طرح مدبّر، دور اندیش، مردم شناس، اور تجربہ کار نہیں تھا،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہادر شاہ نام کے بادشاہ خاتم سلاطین ثابت ہوئے، چنانچہ برہان پور، احمد نگر، گجرات اور دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ہی تھے، شہنشاہ اکبر بہادر شاہ فاروقی اور اس کے دو شہزادوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، جنھیں شاہی خزانہ سے وظیفہ ملتا تھا، بہادر شاہ نے ۱۰۳۳ھ میں جہانگیر کے عہد سلطنت میں بمقام آگرہ انتقال کیا، اور وہیں دفن ہوا،

بابا حسن ابدال :- ایک بزرگ کا نام ہے، وہ بستی بھی حسن ابدال کہلاتی ہے، جس میں اُن کا مقبرہ ہے، کتبہ نویس محمد معصوم نامی کی والدہ انہی کی اولاد میں تھیں،

سید شیر قلندر :- یہ بابا حسن ابدال کے فرزند اور اپنے زمانہ کے روحانی پیشوا تھے، اُن کا مولد سبزوار اور وطن قندھار تھا، ان کا مقبرہ بھی قندھار میں ہے، جس کے متولی محمد معصوم کے آباؤ اجداد تھے،

میر محمد معصوم[1] :- محمد معصوم نام، نامی تخلص، ان کے آباء و اجداد شہر ترمذ کے سادات تھے جنھوں نے

---

[1] مآثر الامراء، جلد سوم صفحہ ۳۲۶ تا ۳۳۰ کی تلخیص،

وہ تین پشتوں سے قندھار میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں وہ [illegible]
کے مقبرہ کی تربیت کے فرائض انجام دیتے تھے، محمد معصوم کے والد سید صفائی نے
قندھار سے ہجرت کر کے بکھر سندھ کو وطن بنایا تھا، جہاں محمد معصوم کی ولادت ہوئی
محمد معصوم نے مروجہ تعلیم سے فارغ ہو کر تلاش معاش میں گجرات کا سفر کیا، کچھ عرصہ
کے بعد شہنشاہ اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کر کے مقرب شاہی بن گیا، وہ عہد
جہانگیر میں امین الملک بن کر بھکر گیا تھا، جہاں اس کا انتقال ہوگیا،

محمد معصوم نامی کی مختلف حیثیتیں تھیں، وہ مشیر بھی تھا، شاعر بھی، مورخ بھی، طبیب بھی،
کتبہ نویس بھی، اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) دیوان نامی (۲) مثنوی معدن الافکار بجواب مخزن الاسرار (۳) تاریخ
سندھ (۴) مفردات معصومی، آخری کتاب طب میں ہے،

اس کو کتبہ نویسی کے فن سے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ اس نے ہندوستان سے ایران
جاتے ہوئے اثنائے راہ میں تبریز و اصفہان تک کئی عمارتوں اور مسجدوں پر کتبے کندہ کئے
ہیں، اس مقالہ میں فتح اسیر سے تعلق رکھنے والے اس کے سات کتبے درج ہوئے ہیں
اس سلسلہ کا اس کا آٹھواں کتبہ قلعہ آگرہ کے دروازہ پر ہے۔

قبرص (سائپرس)

از محمد اقبال ندوی ناظر کتب خانہ دار المصنفین

"ادھر کچھ عرصے اخبارات میں قبرص کا ذکر بہت آرہا ہے، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے تاریخی حالات بیان کر دیئے جائیں، ذیل کی سطور اسی خیال کے ماتحت شائع کی جا رہی ہیں۔"

قبرص بحر متوسط کے مشرقی حصہ میں ایک جزیرہ ہے، جس کا رقبہ ۹ ہزار ۲ سو ہاسی کیلومیٹر ہے اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ہے، یونانی ۴۳۰۰۰۰ اور ترک ایک لاکھ ہیں، اس کا دار السلطنت نیکوسیا ہے، اور اس کے مشہور شہر لیماسول Limassol اور فماجوستا Famagosta ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام پورے طور پر اسلامی حکومت کے دائرہ میں شامل ہو گیا اور حضرت معاویہؓ اس کے گورنر مقرر ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ رومیوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے مسلمانوں کو بحری طاقت حاصل کرنا ضروری ہے، لیکن عراق شام و مصر کے معرکوں میں بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور جانباز سپاہی شہید ہو چکے تھے، اور بری لڑائیوں کا سلسلہ ابھی تک بالکل ختم نہیں ہوا تھا اس لئے حضرت عمرؓ کی احتیاط پسند اور مآل اندیش طبیعت نے بحری لڑائی کی اجازت نہیں دی، چند برس میں جب اسلامی اقتدار مستحکم ہو گیا تو حضرت عثمانؓ کے دور میں بحری مہم کی

بھیجنت لی گئی، حضرت معاویہؓ نے جنگی کشتیوں کا ایک بیڑا [illegible]
(قبرص) بحرِ روم میں کلید کی حیثیت رکھتا تھا، اور شام کی سرحد سے قریب تھا، جہاں سے بھی آسانی سے مدد پہنچ سکتی تھی، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اس طرف اپنے بیڑہ کو حرکت دی مصر سے عبداللہ بن سعد بھی کمک لیکر آگئے، اور قبرص پہنچکر اس کے ساحلی علاقہ پر حملہ آور ہوئے، لیکن اہل قبرص نے جنگ کے بجائے سالانہ سات ہزار دینار ادا کرنے کے معاہدہ پر صلح کرلی، یہی رقم وہ اس سے پہلے رومیوں کو دیتے تھے، اس کے ساتھ انہوں نے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے، اور ہمیشہ مسلمانوں کو رومی دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہیں گے،

لیکن اس معاہدہ کے خلاف انھوں نے ۳۲ھ میں مسلمانوں کے خلاف جنگی کشتیوں اور اسلحہ سے رومیوں کی مدد کی، تو حضرت معاویہؓ نے ۳۳ھ میں دوبارہ قبرص پر چڑھائی کی، لیکن وہاں کے باشندوں نے پھر صلح کرلی، اس مرتبہ وہاں کا نظم و نسق قابو میں رکھنے کے لئے، امیر معاویہؓ نے بارہ ہزار تربیت یافتہ فوج روانہ کی، جنہوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور شہر آباد کئے، امیر معاویہؓ کی وفات تک وہاں کے باشندے خراج دیتے رہے، لیکن ان کے بعد پھر خراج دینا بند کر دیا، اس کے نتیجہ میں تادیبی کارروائی کی جاتی رہی، اور بنی امیہ اور بنی عباس کے طاقتور عہد میں یہ جزیرہ اسلامی حکومت کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے پایا،

جب بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ۱۱۹۱ء میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ سسلی سے شامی شہر عکا کی جانب روانہ ہوا تو تیز طوفانی ہواؤں نے اسے منزل مقصود کے بجائے جزیرہ قبرص کے ساحل پر پہنچا دیا،

برص حکمران، اسحاق کے عہد میں ایک دفعہ ہوئی تو اس نے اس بحری قافلہ کو گرفتار کرنے
اور اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا، رچرڈ خود تو نہیں آیا مگر اس کی
رڈ کی بیوہ آنا اور اس کے خاوند گرفتار ہو گئے، رچرڈ بہت غضبناک ہوا اور چند دنوں
کے بعد اس کے جواب میں قبرص پر فوج کشی کر دی، اور معمولی جنگ کے بعد قبرص کے
دار السلطنت پر قابض ہو گیا، اسحاق نے اپنے آپ کو رچرڈ کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد
رچرڈ قبرص کا انتظام ایک فوجی دستہ کے سپرد کر کے عکا کی جانب روانہ ہو گیا اور ایک عرصہ
تک محاصرہ کے بعد جون ۱۱۹۱ء میں اسے فتح کر لیا،

رچرڈ کی فتح کے بعد قبرص صلیبیوں کی تحریک کا مرکز بن گیا، جس کا اندازہ عکا کے محاصرہ سے ہوتا ہے، ابن اثیر کے قول کے مطابق وہ انگریزوں کی طاقت کا ایک عظیم مرکز ہو گیا، پھر ۱۱۸۸ء میں سلطان صلاح الدین نے جب بیت المقدس فتح کر لیا تو یہاں کا فرنگی حکمراں لوزنجان قبرص چلا گیا، اس طرح قبرص فرانسیسی مملکت کا ایک حصہ ہو گیا جس کی غمازی فرانسیسی تہذیب آج بھی کر رہی ہے، لوزنجان اور وہ فرانسیسی جو یہاں آباد ہوئے تھے عرصہ تک مقیم رہے، عصر حاضر میں بھی شہر نیکوسیا، میشہ اور اس کے گرد و نواح میں فرانسیسی معماروں کی تعمیر کردہ عمارتوں، محلوں اور کلیساؤں سے فرانسیسی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے،

قبرص ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بحر روم کے دروازے مسیحی حملہ آوروں کے لئے کھل گئے، اور اسلامی ممالک ان کے حملوں کی آماجگاہ بن گئے، چنانچہ ۱۳۶۵ء میں اسکندریہ پر شدید حملہ ہوا، یہ جمعہ کا دن تھا، کسی حملہ کا خیال نہ تھا، لوگ نماز ہی میں تھے کہ عیسائی فوجیں اسکندریہ میں اتر گئیں اور بڑی بے دردی سے قتل و غارت گری کی، لیکن اس جنگ

میں مال غنیمت کی کثرت اور مسلمانوں کے شدید نقصانات کا باعث ہوا، پطرس کا [illegible]
ہوا اور کچھ حاصل نہ ہوا، عباسی تو برائے نام خلیفہ تھے، مصر پر مملوک سلاطین کی حکومت
تھی، چنانچہ ان کی طرف سے فوج بھیجی گئی، لیکن مسیحی حملہ آور اور ان کا سرغنہ پطرس
اس سے پہلے بھاگ نکلے تھے، بقول نویری "پطرس چور کی طرح اسکندریہ میں داخل ہوا اور
چوری کر کے نکل گیا"، اس کے بعد اگرچہ اس قسم کا کوئی حملہ نہیں ہوا، مگر لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ
بند نہیں ہوا اور مصر کے شمالی علاقہ میں ہر وقت کسی حملہ کا دھڑکا لگا رہتا تھا،

آخر ۱۴۲۲ء میں جب سلطان برسبائی مملوک سلطنت کا تخت نشین ہوا تو اس نے
گذشتہ اولوالعزم بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا اور قبرص کو [illegible]
میں شامل کر لینے کا منصوبہ بنایا، وہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک حالات نے اس کا موقع پیدا
کر دیا کہ ۱۴۲۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی کشتیوں کو ساز و سامان اور [illegible] مسافروں
کے ساتھ گرفتار کر لیا، اور قبرص کے حکمران نے ھدایا دیکر اپنے قبضہ میں کر لیا، تو برہم ہو کر
اپنے ارادہ کو برسبائی نے مزید مستحکم کیا، اور قبرص کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا،

برسبائی نے جزیرہ قبرص پر تین مرتبہ فوج کشی کی، پہلی بار ۱۴۲۴ء میں حملہ کیا،
ان کے جنگی جہازوں کو تباہ اور ساحل کے بعض علاقوں کو تاراج کرنے کے بعد قیدیوں
کی بڑی تعداد اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ مصر واپس آیا،

دوسرا حملہ پہلے کی بہ نسبت وسیع تھا، ۱۴۲۵ء کے موسم گرما میں مصری ساحلوں سے
حملہ آور ہوا، اور بیروت، طرابلس و شام سے گذرتا ہوا قبرص کے شمالی مشرقی ساحل "[illegible]"
کے بندرگاہ پر جا پہنچا اور وہاں "فماجوستا" کے جانب رخ کیا، سوار اور پیدل فوج کے خشکی پر
قدم رکھتے ہی فماجوستا کے حکمران نے اطاعت اختیار کر لی، شہر کے قلعہ پر فتح کا پرچم لہرانے کے بعد

بادشاہ کو امان دیدی۔ مسلمانوں نے چار روز میں قریب وجوار کے علاقہ کو فتح کرکے ملامر کا رخ کیا، یہاں قبرصیوں کے ساتھ سخت معرکہ ہوا، اس جنگ میں قبرصیوں اور ان کے معاون انگریزوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا، مسلمان شکست فاش دینے کے بعد لیماسول پہنچے اور قلعہ کے ایک بڑے حصہ کو مسمار کرکے شہر کے اندر داخل ہوگئے، اور قلعہ پر اپنا شاہی علم نصب کر دیا، لیکن قبرص پر بنادقہ کے فوج کی چڑھائی کی خبر پاکر مسلمان قدم آگے بڑھانے کے بجائے قاہرہ لوٹ آئے، اس جنگ میں بہت سے قبرصی قید ہوئے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا لیکن برسبائے نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کے حملہ کا مقصد محض غارت گری، مال و دولت اور لوٹ کھسوٹ نہ تھا، بلکہ اس جزیرہ پر پورا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا، تاکہ دشمن اس کو مصر پر حملہ کا اڈا نہ بنا سکیں، اس خیال کے مطابق ۸۲۹ھ میں قبرص پر حملہ کیا، اور لیماسول کو فتح کرکے دشمنوں کی ایسی سرکوبی کی کہ پھر انھیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو، اس سے فارغ ہوکر جزیرہ کے اندرونی علاقہ میں داخل ہوا، لیکن قبرصی حکمران جانوس بھی خیروتیا کے مقام پر پانچ ہزار سواروں اور سات ہزار پیادوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے تیار تھا، دونوں فریقوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، آخرکار قبرصیوں کو شکست ہوئی، اس لڑائی نے ان کا زور توڑ دیا، اور ان کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہوگیا،

مسلمانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جزیرہ کے دارالسلطنت کی جانب بڑھے، اب قبرصیوں میں مقابلہ کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی، آسانی کے ساتھ نکوسیا فتح ہوگیا، اور اس کے کوچہ و بازار، اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے، اذان دیکر جمعہ کی نماز پڑھی گئی، پایہ تخت کے امرار، اہل علم اور پادری انجیل ہاتھ میں لے کر پناہ کے طلب گار ہوئے، مسلمانوں نے ان کی درخواست قبول کی، اور امان عام کا اعلان کر دیا، اس دن سے قبرص

باضابطہ سلطان اشرف برسبائے کی سلطنت میں شامل ہوگیا،

سلطان قاہرہ واپس ہوئے تو قبرصی سردار جانوس تین ہزار قیدی اور بے شمار مال غنیمت ساتھ تھا، شہر میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا، یہ جلوس جب قلعہ جبل پہونچا تو جانوس زمیں بوس ہوا، پھر جب سلطان کے پاس حاضر ہوا تو قدمبوسی کی، اس کی جان بخشی کی گئی لیکن احتیاط کے طور پر حراست میں قلعہ کے برج میں رکھا گیا، یاد ہوگا کہ ۱۳۶۵ء میں اچانک اسکندریہ پر قبرص کی طرف سے حملہ کیا گیا تھا اور بے شمار مسلمانوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا تھا، شاہ اشرف برسبائے کی اس فتح نے لوگوں کے جلے ہوئے دلوں پر مرہم رکھا اور ذلت کا احساس دور کیا، اور ان کے اندر نئے سرے سے اعتماد پیدا ہوا، ازراہ کرم جانوس کو دو ہزار دینار فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا، اس کے بعد سے قبرص سلاطین مصر کی بقاء حکومت تک مصر کے زیر اثر رہا، جب ۱۴۵۸ء اور ۱۴۵۹ء میں ارکانِ سلطنت میں شدید اختلافات شروع ہوگیا تو ۱۴۷۱ء میں وینادقہ پھر اپنا رسوخ قبرص پر وسیع کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ جزیرہ کے والی ہوگئے ۱۵۱۷ء میں مصر ترکان آل عثمان کے قبضہ میں آیا اور سلطان سلیم اول کے دور خلافت عثمانیہ کا آغاز ہوا، لیکن قبرص کی فتح دوسرے سلیم کی منتظر تھی،

جب سلطان سلیم ثانی نے یمن کو فتح کرلے اور فتنہ کو فرو کرنے کے بعد اطمینان کی سانس لی تو جزیرہ قبرص کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، اگست ۱۵۷۰ء میں سپہ سالار مصطفیٰ ایک لاکھ فوج ساٹھ کشتیوں اور تیس جنگی جہازوں پر مشتمل عثمانی بیڑہ کے ساتھ ایک قدیم شہر اپا نوت پہنچا ترک فوج کی مزید کمک بھی جاری رہی، وینادقہ نے ۱۵۶۷ء میں شہر کی دیواروں کو مضبوط کر دیا اس کے ارد گرد خندق کھود دی تھی، اور اس کی نگرانی اور حفاظت کے لئے فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا دفاع کارگر ثابت نہ ہوا، یہ محاصرہ

عید تک ایک ماہ جاری رہا، لیکن ۹ ستمبر میں ترک شہر میں داخل ہوگئے، اس جنگ میں تقریباً بیس ہزار افراد قتل تقریباً بیس ہزار گرفتار کیے گئے، ایک ہفتہ میں پورا تسلط قائم ہوا،

ترک فاجوستا کے علاوہ تمام شہروں میں قابض ہوگئے اور طیلہ بھی اسی سنہ میں فتح کیا، طویل مدت تک محاصرہ سے پریشانی اور سخت سردی کی وجہ سے ۱۶ اپریل کو مسلمانوں نے جنگ چھیڑ دی، ینقولا اپنے حامیوں کی سات ہزار تعداد لیکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور مسلمانوں کی پیش قدمی روک دی، ینقولا نے حفاظت کی غرض سے شہر کی دیواروں کو اور مضبوط کیا اور اس کے چاروں طرف گہری خندق کھدوائی، لیکن غذا کی قلت نے شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کرنے پر مجبور کیا، انھوں نے یہ شرط رکھی کہ پیادوں اور سواروں کو کاندیا تک ترکی کشتیوں پر جانے کی اجازت دیجائے، لیکن مسلمانوں نے اس شرط کو تسلیم نہیں کیا، اور ان سب کو گرفتار کر لیا، ینقولا سارے ہنگامہ اور کشت و خون کا ذمہ دار تھا، اس کی وجہ سے ہزاروں شہریوں کی جانیں گئیں، اسلئے اس کی جان بخشی نہیں کی گئی اور قتل کی سزا دی گئی،

اس کے بعد قبرص عثمانی حکومت کا ایک جزو رہا، اگرچہ اٹھارہویں صدی کے شروع سے دولت عثمانیہ کی حالت کمزور ہونے لگی تھی، اور یورپ کی حکومتیں اس کی نقصان رسانی میں مصروف تھیں، اور آہستہ آہستہ یورپی مقبوضات ترکوں کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے جنگی اہمیت کی بنا پر قبرص پر ان کی نظر تھی، وہ بحر روم کی کنجی سمجھا جاتا تھا لیکن ترکی حکمرانوں نے ۱۸۷۸ء تک اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا، ۱۸۷۶ء میں سلطان عبد الحمید تخت نشین ہوئے، اس وقت دولت عثمانیہ بڑی مصیبت میں مبتلا تھی، یورپی حکومتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو بھڑکا کر جابجا بغاوت کرا رہی تھیں، اور چاہتی تھیں کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں،

سلطان عبد الحمید نے قسطنطنیہ میں دول یورپ کے نمایندوں کی کانفرنس

بلاتاکہ روس سے شکایت کا تدارک کیا جائے، لیکن ان روسیوں نے ایسی شرطیں پیش کیں، کہ کوئی باعزت حکومت انہیں قبول نہیں کرسکتی تھی، پھر کیا تھا روس نے لشکر کشی شروع کر دی، بالآخر پھر صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور ...... وہاں علاقے سے ترکوں کو دست بردار ہونا پڑا،

اس صلح نامہ کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس طرح روس کا اثر بڑھ جائیگا اور ممکن ہے آگے چل کر ان کے مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں، انگریزی سفیر نے اطمینان دلایا کہ روس کو اب پیش قدمی کا موقع نہ ملنے دیا جائیگا، بشرطیکہ قبرص انگریزوں کو اس لئے دیدیا جائے کہ وہاں ان کی فوجیں رہیں، اور روس کی پیش قدمی کو بروقت روک سکیں، اس ترکیب سے قبرص انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا، اس شاطرانہ چال کی کامیابی پر اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے ملکہ وکٹوریہ کو مبارکباد دی کہ بحر روم کی کنجی ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے،

گو قبرص عملاً انگریزی علاقہ بن گیا تھا، مگر رسمی طور پر ترکی سیادت کا نام باقی تھا، پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے نام کی اس سیادت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا، اور ۱۹۱۴ء سے باضابطہ قبرص کو برطانوی شہنشاہیت میں شامل کر لیا، جنگ کے بعد ۱۹۲۳ء میں لوزان کی صلح کانفرنس نے بھی اس کی تصدیق کر دی،

عرصہ تک یہ اس طرح برطانوی حکومت کے ماتحت رہا، لیکن رفتہ رفتہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی آزادی کی خواہش ہوئی، برطانیہ کی طرف سے کچھ عرصہ تک ٹال مٹول ہوتی رہی پھر جب اس سے کام نہیں چلا تو کچھ معمولی اختیارات دیئے گئے، لیکن وہاں کے باشندوں کا جذبۂ آزادی اس سے ختم نہیں ہوا، مجبور ہو کر خود مختیارات دیئے گئے، قبرص کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی دشواری وہاں کے باشندوں

ا باہمی اختلافات تھا جزیرہ کی آبادی میں عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور ترک اقلیت ں ہیں، لیکن ان کی آبادی کا ایک مستقل علاقہ ہے، یونان قبرصی عیسائیوں کا طرفدار تھا اور ترکی لومت ترکوں کی حامی تھی، بالآخر فروری ۱۹۵۹ء کو جنیوا میں یونان اور ترکی کے درمیان معاہدہ ہوگیا اور طے پایا کہ ۲ سال کی مدت میں بحر روم کے مشرق میں برطانیہ کے جنگی مصالح اور جزیرہ میں ترکی کی اقلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس معاہدہ کو نافذ کر دیا جائے، پھر ۱۳ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انتخابات ہوئے، جن کے بعد مکاریوس قبرص کے صدر اور ڈاکٹر کوچک نائب صدر ہوئے،

لیکن اندرونی اختلافات رہ رہ کر ابھرتے رہے، اور وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہے آخر جولائی ۱۹۷۴ء میں صدر مکاریوس کی حکومت کا فوجی سرداروں نے تختہ الٹ دیا، مکاریوس بھاگ کر دوسرے ملک میں پناہ لی، چونکہ یہ نئی حکومت یونانیوں کے زیر اثر تھی، اس وجہ سے ترکوں کو اپنے بارہ میں خطرہ محسوس ہوا، ترکی حکومت نے ان ترک باشندوں کی حفاظت کی خاطر اپنی فوج قبرص میں اتار دی، اس پر ادھر ادھر سے بہت لے دے ہوئی، مگر ترکی حکومت نے اس واویلا پر کان نہیں دھرا اور صاف کہدیا کہ وہ ترکوں کو لاوارث نہیں چھوڑ سکتی، اور جب تک کوئی قابل اطمینان انتظام نہ ہو جائیگا، ان کی فوجیں اس علاقہ سے نہیں ہٹیں گی، اس صورت حال نے یونانی فوجیوں کو ڈھیلا کر دیا اور مکاریوس کی واپسی کی راہ صاف ہو گئی، چنانچہ چند ماہ ہوئے وہ قبرص میں آ گئے، مگر ان کا اثر عیسائی علاقہ تک محدود ہے ترک فوج ترکی حصہ میں ڈٹی ہوئی ہے، اور آئندہ نظام کے بارے میں بات چیت جاری ہے،

ادبیات

یادِ اقبال

بمناسبت یوم یادبود اقبال

از پروفیسر سید حسن سترو پٹنہ

شاعرِ مشرق زمیں رنگیں نوا آنکہ ازاو یافتہ دانش ضیا

شعراو اقوامِ مشرق را حیات شرح رازہست و بود کائنات

کرد روشن فکر او دنیائے دل تاب و تب انداختہ درآب و گل

پاک دل، دانا سرشت، آزاد مرد آنکہ جز تبلیغِ حق کارے نکرد

ہرچہ گفت از معنی قرآں بگفت گوہرِ مضمون آں آساں بسفت

بود شیدائے امام المرسلینؐ عشقِ احمدؐ در دلش بودہ مکیں

زندگی را شعر او سنگِ فساں تیغ براں بہر تسخیر جہاں

شمع ساں بر پستی آدم گداخت قلب او دلسوزی پروانہ داخت

تابِ گفتارش ورا از شکوہ داشت از خدائے خود جوابِ شکوہ یافت

بد کلامش قوم را بانگِ درا رہنمائی کرد در ہر مرحلہ

سرِ نہانِ خودی را باز کرد با رموزِ بیخودی دمساز کرد

از زبورِ اعجم بیتے گفت		ارمغان از حجاز آورد رفت

کس نیاید بعد او دانائے راز		نی ز ترکستان نہ از مصر و حجاز

در حیات و آشتی اقبال رفت

صد درودش بر روان پاک باد

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

شوق اگر کامیاب ہو جائے		زندگی لاجواب ہو جائے
جس پہ تیرا عتاب ہو جائے		اس کی دنیا خراب ہو جائے
درسِ تعمیر ہے زمانے کو		عشق میں جو خراب ہو جائے
ہے یہی انتہائے ناکامی		آدمی کامیاب ہو جائے
پوچھنا کیا ہے پھر مسرت کا		غم اگر بے حجاب ہو جائے
آنکھ مل جائے کاش ساقی سے		یوں بھی دورِ شراب ہو جائے
آپ کے ناز برہمی کی خیر		کوئی خانہ خراب ہو جائے
ہائے وہ دل جو ایک آہ کے بعد		موردِ صد عتاب ہو جائے
عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں		معصیت بھی ثواب ہو جائے
پرتوِ حسن کی کرامت سے		ذرہ بھی آفتاب ہو جائے
چشمِ ساقی کی مستیاں توبہ		پانی پانی شراب ہو جائے

ایک ایسا بھی نام ہے جوہر
ختم جس پر کتاب ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

اردو املا، مرتبہ جناب رشید حسن خاں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۸۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔ پتہ: نیشنل اکاڈمی ۲۰۰۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی۔

مرکزی حکومت کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اردو املا کے مسائل پر غور و خوض کے لیے جو سہ نفری کمیٹی تشکیل ہوئی تھی، اس کے ایک ممتاز رکن جناب رشید حسن خاں بھی تھے، جن کو علمی و تحقیقی کاموں کا اچھا تجربہ اور املا و لسانیات کا عمدہ ذوق ہے، انھوں نے اس مبسوط کتاب میں اردو املا کے انتشار اور غلط نگاری کو دور کرنے اور اس میں صحت و یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اصول و ضابطے تجویز کیے ہیں، اس سلسلہ میں بڑی کد و کاوش سے ان تمام الفاظ کا مفصل جائزہ دیا گیا ہے، جن کے مختلف املا مروج ہیں، پھر ان کے لئے قاعدے بنا کر کسی ایک املا کو دلائل کے ساتھ صحیح قرار دیا گیا ہے، فاضل مرتب نے جدت طرازی سے کام لینے کے بجائے عموماً اپنے پیشرو محققین کی سفارشوں، تجویزوں اور اردو لغت اور نحو و صرف کی مستند کتابوں میں درج کی ہوئی معلومات کی روشنی میں اصول اور قاعدے متعین کئے ہیں، پہلے الف (بشمول الف ممدودہ و مقصورہ، الف و ہائے مختفی اور الف تنوین) سے بنے مختلف الفاظ

ے املا کی تصحیح کی گئی ہے، پھر ت، ۃ، ت، ط، ذ، ز، ژ، ث، س، ص، ض، ک، گ، ن، و، ہمزہ اور ی لکھے بنے ہوئے ان تمام لفظوں کا ذکر ہے، جن کے املا میں یکسانیت نہیں ہے، حروف کے بعد گنتیوں کے املا، نقطے، شوشے، نشخ اعراب، علامات اور رموز اوقاف کے بارہ میں اصول بتائے گئے ہیں، اور ان لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کو ملا کر لکھا جاتا ہے حالانکہ ان کو منفصل لکھنا چاہئے، جیسے آجکل کے بجائے آج کل وغیرہ، فارسی املا کے ضروری مسائل اور عام قاعدے بھی دو فصلوں میں تحریر کئے گئے ہیں، آخر میں لغت کی تدوین اور متن کی ترتیب کے لئے املا کے اصول اور قاعدے بیان کئے گئے ہیں، شروع میں فاضل مصنف کے قلم سے ایک پرمغز مقدمہ ہے، جس میں املا کی صحت و یکسانیت کی اہمیت اس کے قاعدے منضبط کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، پھر اس کی تعریف اور اس میں اختلاف پائے جانے کی وجہیں بتائی گئی ہیں، املا اور رسم الخط کے دقیق فرق کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کوششوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو املا کے متعلق پہلے کی جا چکی ہیں، لائق مرتب نے اردو رسم الخط کی اصلاح و تبدیلی اور ہم آواز حرفوں میں سے کسی ایک کو باقی اور بقیہ کو اردو کے حروف تہجی سے خارج کئے جانے کی سخت مخالفت کی ہے اور اس تجویز کو سراسر مہمل بتایا ہے، کہ جو حروف پڑھنے میں نہ آئیں ان کو لکھا بھی نہ جائے، جیسے خوش کو خش وغیرہ ممکن ہے ان کی بعض سفارشوں اور تجویزوں سے کسی کو کلی اتفاق نہ ہو تاہم یہ کتاب بڑی محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہے، اردو خواں طبقے کو املا کی بے اعتدالی دور کرنے کے لئے ترقی اردو بورڈ کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے،

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل، از جناب شورش کاشمیری صاحب،

تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۲۵ مع پلاسٹک کور قیمت [illegible]

[illegible] چٹان لمیٹڈ ... میکلوڈ روڈ لاہور [illegible]

یہ جناب شورش کاشمیری کی خود نوشت سوانح عمری ہے، وہ ممتاز ادیب و شاعر، نامور خطیب و صحافی ہی نہیں ہیں، بلکہ شروع سے انقلاب پسند رہے ہیں، سیاسی ہنگاموں اور قید و بند کی صعوبتوں میں ان کی زندگی گذری ہے، اس لئے اس کتاب میں گذشتہ قومی و سیاسی حالات و کوائف، مذہبی و ملی سرگرمیوں اور مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کی داستان بھی آگئی ہے، شروع میں مصنف نے اپنے خاندان، ماحول، بچپن کے بعض واقعات ابتدائی و ثانوی اسکولوں میں تعلیم اور شادی کا ذکر کیا ہے، وہ مجلس احرار کے رکن رکین تھے، اس لئے اس کے خصوصیات اور خط و خال بھی بیان کئے ہیں، اور اس لئے روح رواں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا بھی بہت کچھ ذکر آگیا ہے، ان کی سیاسی و ملی سرگرمیوں کا اصل مرکز پنجاب تھا، اس لئے یہاں کے اکثر مشاہیر سیاست بھی زیر بحث آگئے ہیں، تقسیم کے بعد نواکھالی، بہار، دہلی اور پنجاب میں جو ہیبتناک فسادات ہوئے اس کی پُردرد داستان سے مصنف کی دلسوزی، دردمندی اور انسانیت دوستی کی تصویر سامنے آگئی ہے، شورش صاحب جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس سے زیادہ قریب تھے، اس لئے انھوں نے ان جماعتوں کے اکابر کا عقیدت و احترام سے ذکر کیا ہے، تاثرات میں مصنف کے سیاسی مسلک اور نظریہ کی جھلک آگئی ہے، جس سے کہیں کہیں ان کی غیر جانبداری باقی نہیں رہتی ہے، گفتنی کے ساتھ ناگفتنی اور رمز و کنایہ کی باتیں تصریح و وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہیں، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے مداح ہیں، اس مداحی اور عقیدت مندی کے سلسلہ میں اور دوسرے اکابر کے ذکر میں ان کے قلم میں احتیاط باقی نہیں رہی، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں ہندوستان میں معاصرت کی تیغ بران بڑے بڑے عابدوں اور فقیہوں کے

سینہ میں گولی ماری، سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے جیبوں کی تلاش میں سرگرداں رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا آزاد کے کفن نوچنے میں حیا نہ کی، علامہ انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی کی قبروں پر اعتبار دیکھا، اول الذکر کا مزار ٹوٹ پھوٹ کر بیٹھ گیا؟ (ص ۱۳۱) اس قسم کی تحریر ادب شناس، ادیب کے لئے موزوں نہیں، ایک جگہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے پہنچے توڑے جانے اور شاہ عبد العزیز کے بدن پر چھپکلی کا تیل ملے جانے کی بے سروپا روایت بھی نقل ہو گئی ہے، ازدحام کا املا کئی جگہ اژدہام لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، ان باتوں سے قطع نظر اس کتاب میں بعض ایسے مفید اور دلچسپ سیاسی واقعات قلم بند ہوئے ہیں، جن کے مطالعہ سے عام ناظرین کو دلچسپی ہوگی، کتاب کے نام رکھنے میں مصنف نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے،

تذکرہ حضرت رفاعیؒ، مرتبہ جناب مولوی شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی ندوی،

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی، صفحات ۱۰۲ مجلد، قیمت صہ پتہ:۔

شفیع اسٹور، آر، آر مارکٹ، جی۔پی اسٹریٹ، بنگلور۔

حضرت شیخ سید احمد کبیر رفاعی، مشہور عارف باللہ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے ہمعصر تھے، عرب ملکوں میں ان کے سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، ہندوستان میں جنوبی ہند اور گجرات وغیرہ میں بھی اس کو زیادہ فروغ ہوا، مصنف کا خاندان بھی رفاعی سلسلہ سے وابستہ ہے، اس لئے انھوں نے بڑی عقیدت سے حضرت شیخ کے فضائل و مناقب تحریر کئے ہیں، ان کا اصل مقصد شیخ کے اتباعِ سنت، ذوقِ عبادت، جذبہ خدمت اور حسنِ اخلاق وغیرہ کو بیان کرنا ہے، خوارق و کرامات کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے، یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے اس لئے

اس کی ترتیب و تبویب، انداز بیان اور طرز نگارش وغیرہ میں جو کمی رہ گئی ہے، امید کہ آئندہ دور ہو جائے گی،

فکر جمیل اور تاریخ مدرسہ بدر الاسلام، مرتبہ مولوی عثمان احمد قاسمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی، صفحات ۱۱۰، مجلد ۹۶، ۴۰، قیمت ے، و عہ، پتے، (۱) مدرسہ بدر الاسلام، شاہ گنج، ضلع جون پور، (۲) علمی کتاب گھر شاہ گنج، جون پور،

اوّل الذکر کتاب شاہ گنج ضلع جونپور کے مدرسہ بدر الاسلام کے روح رواں مولانا جمیل احمد مرحوم کی مذہبی و ملی نظموں، غزلوں، مرثیوں اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے، اس کے شروع میں استاذ محترم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی مختصر تقریظ اور مرتب کا عقیدت مندانہ مقدمہ ہے، اسی عقیدت میں ہر دور اور سب ہی طرح کا کلام شائع کر دیا گیا ہے، ادبی و فنی حیثیت سے قطع نظر حضرت شاہ صاحبؒ کے بقول "دینی روح اور افکار و تصورات کی صحت و صداقت اور مولانا کے سادہ اور بے تکلف انداز بیان کی وجہ سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے، دوسرے کتابچہ میں مولانا جمیل احمد اور ان کے بزرگوں کے قائم کردہ مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج کا مختصر تعارف اور اس کے متعلق قوم و ملت کے اکابر کے تاثرات شامل ہیں، اس سے مدرسہ کی گذشتہ کارگذاری کے علاوہ اس کے کارکنوں، خصوصاً مولانا جمیل احمد مرحوم کے اخلاص اور خاموش خدمت کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دین رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے۔ وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسانوں کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیز

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکات خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالات زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت:- للعہ ر

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت:- ۱۰ روپیہ ۵۰ پیسہ

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

نئی کتب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین مدت سے انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی یہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملّی، سیاسی حالات و واقعات و کارناموں کا ایک مرقع اور پوری تاریخ ہے جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ کو محیط تھا، تمام ملّی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ جنگِ آزادی، مسئلۂ ملوکیتِ حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، [illegible] سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترکِ قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرتِ پاکستان، اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ۔

قیمت ۱۷ روپے۔

مؤلفہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

جلد ۱۱۵ نمبر ۵ — مئی سنہ ۱۹۷۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن — عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلسِ ادارت

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ

۳۔ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی لکھنؤ

۴۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ⁂ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزمِ تیموریہ جلد اول

بزمِ تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء و فضلاء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء، و شعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۴ روپئے ۵۰

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۵ ماہ مئی ۱۹۷۵ء مطابق ماہ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ عدد ۵

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۲۴-۳۲۲

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۴۸-۳۲۵
اردو ادب کے تنقیدی اصول میں تنظیم و انضباط	جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہجہاں پور	۳۵۷-۳۴۹
اسلام ایک خیالی خاکہ ہے یا عملی مثال	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	۳۶۸-۳۵۸
النقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب (ایک قدیم عربی مخطوطہ)	جناب جلال الدین صاحب (شعبۂ عربی، پٹنہ کالج پٹنہ)	۳۸۲-۳۶۹
مکتوبات مدینہ منورہ	حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدفیوضہم	۳۸۶-۳۸۳

تلخیص وتبصرہ

گذشتہ عرب اسرائیل جنگ اور نہر سویز	محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم اے علیگ	۳۹۳-۳۸۷

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم (انگریزی) (مترجمہ جناب محی الدین احمد ندوی)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۹۶-۳۹۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۰۰-۳۹۷

شذرات

ڈاکٹر رادھا کرشنن گذشتہ ماہ اس دارِ فانی کو چھوڑ گئے، علم و فن کے فروغ دینے میں اُن کا نام رابندر ناتھ ٹیگور، جے۔ سی۔ بوس اور سی۔ وی۔ رمن جیسی قد آور شخصیتوں کے ساتھ لیا جائے گا، اُن کی وفات سے اس ملک میں بیسویں صدی کا ایک زریں علمی عہد ختم ہو گیا،

وہ ہندو مذہب کے بہت بڑے شارح تھے، فلسفہ میں بھی ان کا علم بہت گہرا تھا، اسلئے ہندو مذہب کے عقائد و تفکرات میں فلسفیانہ موشگافی کرتے رہے، وہ برگسان جیمس وارڈ، ولیم جیمس، اور برٹرنڈ رسل کے فلسفے سے متاثر تھے، تو خود انکی علمی گہرائی اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ٹامس مین اور اچ جی۔ ویلس جیسے ماہرین نے کیا، کلکتہ میسور اور مدراس کی یونیورسٹیوں میں استاد رہنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے بھی پروفیسر رہے، اندھرا اور بنارس یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی بنائے گئے، بیرونی ممالک نے بھی مختلف قسم کے اعزاز اور انعامات سے نوازا جس سے ہندوستان کی عظمت و فضیلت میں بھی اضافہ ہوا، ان کی متعدد تصانیف میں ایک کتاب "مذہب کی حکومت جدید فلسفہ پر" ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ جدید فلسفہ خود مذاہب سے متاثر رہے، وہ بڑے خوش بیان اور باوقار مقرر بھی تھے بولتے تو معلوم ہوتا کہ فضا میں سیم و زر کی آواز کھنک رہی ہے اسی کے ساتھ سامعین محسوس کرتے کہ ان سے اخلاق اور روحانیت کا پیام مل رہا ہے،

پنڈت جواہر لال نہرو اُن کی قابلیت اور اعلیٰ سیرت سے متاثر تھے، اسلئے ان کو علم کی مسند سے اٹھا کر سیاست کی مسند اعلیٰ پر لا بٹھایا، وہ پہلے نائب صدر جمہوریہ ہند پھر صدر بنائے گئے جس سے خود ان دونوں عہدوں میں وزن اور وقار پیدا ہو گیا، افلاطون فلسفی حکمراں کو پسند کرتا تھا، ڈاکٹر رادھا کرشنن افلاطون کے سیاسی خواب کی تعبیر تھے، بلند پایہ فلسفی، مخلص محب وطن، اور مدبر ہونے کے ساتھ مذہب کو اپنی

زندگی کی بیساکھی بنانے میں شرمندگی محسوس نہیں کی، ظاہری وضع قطع ہی سے مذہبی معلوم ہوتے، قشقہ بھی لگاتے، تقریروں میں بلاتکلف وید کے اشلوکوں کے حوالے بھی دیتے رہتے، اُن کی زندگی یہ پیام چھوڑ گئی ہے، کہ مذہب سیاست میں مشکلیں پیدا نہیں کرتا، بلکہ اس سے سیاست میں روحانیت اور حقانیت پیدا ہو جاتی ہے، البتہ مذہب میں سیاست لائی جاتی ہے تو مذہب اور سیاست دونوں میں ریاکاری اور عیاری آجاتی ہے،

مذہب کے منکرین اسی کو ہر قسم کے جنگ و جدل کا سبب قرار دیتے ہیں مگر سیاست سے مذہب کو الگ کرنے کے بعد سیاست کے دیوِ بے زنجیر کی بدولت ہیروشیما، برلن، ہنگری، چیلی، بنگلہ دیش، ویت نام اور کمبوڈیا میں کیا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا، سیاسی سامریوں ہی کے لئے تو طرح طرح کے اسلحہ کی ایجاد ہو رہی ہے جن کے استعمال سے چنگیز اور ہلاکو کی ساری وحشت اور بربریت ماند پڑ گئی ہے گران میں :- ع ایک مجرم نہیں مذہب کی طرفداری کا، سیاست کی جادوگری میں اخلاق کی بلندی کے بجائے سیاسی چال بازیوں اور فریب کاریوں کے ایسے نمونے ملتے ہیں :

ع :- فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

میکاولی کی مکارانہ سیاست سے یورپ پہلے تو چیخ اٹھا تھا، مگر یورپ ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ کی سیاست کی ہر موڑ پر میکاولی دکھائی دیتے ہیں، کیا انسانیت کی نجات ان میکاولیوں ہی سے ہے ؟

انفرادی یا قومی زندگی اعلیٰ اخلاق کے بغیر راکھ کا ڈھیر ہے، آلات، بخارات امریکی، اور روسی تمدنیت کے فتوحات سے انسان چاند اور مریخ تک پہونچ سکتا ہے، مگر ان سے اعلیٰ اخلاق کی تعمیر اور ترویج نہیں ہو سکتی، اس کی تعمیر ملک یا ضمیر یا عقل کے قانون سے بھی نہیں ہو سکتی، ملک کا قانون انسان کو اپنے نفس کی برائیوں پر ملامت کرنا نہیں سکھا سکتا، ضمیر یا عقل کے قانون سے فہم و ادراک کی انارکی کا اندیشہ لاحق رہتا ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک جو کچھ اپنی عقل یا ضمیر کے مطابق کرے، دوسرا بھی وہی کرے، جب تک یہ احساس نہ ہو کہ کوئی قوت پنہاں یا مواخذہ اور بازپرس کرنے والی ہستی ضمیر یا عقل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، یا دل کی تہ کے ہزار پردوں کو بھی دیکھ رہی ہے، وجدان، ضمیر کی آواز اور حاسہ کے تقاضے کا نام لیکر کیا

کچھ نہیں کیا جاسکتا ہے جس کے بعد حسن و قبح، خیر و شر اور نیک و بد کا معیار قائم کر کے اس میں یکسانیت پیدا کرنا آسان نہیں، مثلاً اگر کمیونزم کے حامی اس کو انسانی عقل کے مطابق قرار دیتے ہیں، تو بہی یازم کے موید اس کو خارج از عقل و حاسہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں،

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

اسی لئے اخلاق کا اصلی ماخذ خدا کا قانون قرار دیا گیا ہے، ع :- ہے وہ قوت کہ حریف اسکی نہیں عقل حکیم

خدا کے قانون ہی کا نام مذہب ہے، اور بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو اخلاق کی صراط مستقیم سے بھٹکنے نہ دے، اسی لئے اخلاق کی موثر تعلیم سیاستدانوں کے بجائے ان مذہبی پیشواؤں اور روحانی ہادیوں کے یہاں ملتی ہے جن کے اخلاق حسنہ کو اُن کے ایمان کی پہچان قرار دی گئی ہے، اور جن کی زبان پر نہیں، بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ قیامت کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی اور وہی قوم کی ذہنیت کی روح میں عفت اور اخلاق میں طہارت پیدا کر کے اس کو تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکتی ہے،

مہاتما گاندھی کی وفات ہوئی تو دارالمصنفین کے ایک رکن رکین مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم بیساختہ کہہ اٹھے تھے کہ آہ! اب اُن کے ساتھ ہندوستان کی پالٹکس سے ایتھکس بھی جاتا رہا، کیا ان کا یہ کہنا کچھ نہیں تھا؟ بھاکڑ ننگل اور دامودر دیلی کے بند سے ہمارے ملک میں بڑی مادی ترقی ہوئی، کاش یہاں کے لوگوں کے اخلاق کے بھاکڑ ننگل اور دامودر دیلی کے بند کی بھی تعمیر ہوتی رہتی تو آج یہ ملک اس بحران میں مبتلا نہ ہوتا جس سے حکومت کے مخالفین فائدے اٹھا کر اس کے خلاف تحریکیں چلا رہے ہیں، مگر ان مخالفوں کو بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ وہ پالٹکس میں ایتھکس لا رہے ہیں، یا محض اقتدار کا ایک ہنگامہ ہے جس میں دراصل ع :-

نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۴)

ہندو راجاؤں کی تعریف اس عہد کی ایک تصنیف میں

مملوک سلاطین اپنے سپاہیانہ کمالات کا جوہر اپنی سلطنت کا دائرہ بڑھا کر تو ضرور دکھا رہے تھے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ ان کی سپہگری ان کے لئے باعث فخر رہی، مگر یہاں کے باشندے ان کی فاتحانہ تلواروں سے ضرور سراسیمہ اور وحشت زدہ رہے، لیکن اسی زمانے میں سدید الدین محمد عوفی اپنی کتاب جوامع الحکایات و لوامع الروایات میں نہروالہ کے ایک ہندو راجہ جے سنگھ کی عدل پسندی اور مذہبی رواداری اور دوسرے راجہ گورپال نامی کے بلند اخلاق اور اونچے کردار اور اسی شہر کے ہندو سوداگروں کی دیانتداری کی دلآویز تاریخی کہانیوں کو سنا کر اپنے ہم مذہبوں کو یہاں کے لوگوں سے گویا شیر و شکر ہونے کی دعوت دے رہا تھا، یہ قصے تو ایسے ہیں، جو باہمی یگانگت اور موانست پیدا کرنے کی خاطر نصاب میں داخل کئے جا سکتے ہیں، ان ہی میں سے ایک قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کھنبایت کی ایک جامع مسجد کو ہندوؤں نے نقصان پہنچایا، مسجد کے خطیب نے نہروالہ کے

حکمراں راستے سے گزرے کے پاس پہنچ کر اس کی فریاد کرنی چاہی، لیکن درباریوں نے اس کی رسائی نہ ہونے دی، خطیب موقع پاکر راجہ کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ شکار کھیلنے جا رہا تھا، اس نے اپنی سرگذشت سنائی، راجہ شکار سے واپس آیا، تو کئی روز تک روپوش رہا، اس اثنا میں بھیس بدل کر کھنبایت پہنچ گیا، اور سب سے پوچھ گچھ کی، ہر ایک کی زبانی اس کو یہی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے، اس تفتیش کے بعد اپنی راجدھانی میں واپس آیا، تو خطیب کو دربار میں طلب کیا، استغاثہ پیش ہوا تو درباریوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش کی، لیکن راجہ نے اپنی ذاتی تفتیش کا حال سنایا، پھر اس نے حکم دیا کہ کھنبایت کے برہمنوں، پانگوں اور آتش پرستوں کے سرداروں کو سزا دی جائے، اور اپنی طرف سے ایک لاکھ بالوترے (اس زمانے کے سکے) عنایت کئے کہ مسجد اور مینار از سر نو تیار کئے جائیں، خطیب کو چار چتر بخشے، جو بڑے قیمتی اور رنگین ریشمی کپڑے سے تیار کئے گئے تھے، (جوامع الحکایات و لوامع الروایات قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۱۸۸ اور اردو ترجمہ ص ۱۴۔۱۵ انجمن ترقی اردو)

سدید الدین عوفی نے نہروالہ کے ایک دوسرے ہندو راجہ کی پاک نفسی کا ایک واقعہ بیان کرکے گویا اس کی تلقین کی ہے کہ اس کے کردار کی بلندی دوسرے حکمرانوں کے لئے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے، اس کے بیان کے مطابق نہروالہ کا ایک راجہ گوپال بہت ہی انصاف پسند، نیک اور عقلمند تھا، گدی پر بیٹھنے سے پہلے وہ برسوں سادھوؤں کی صحبت میں رہ چکا تھا، اس لئے اس میں بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں راجہ ہونے کے بعد ایک دن وہ ہاتھی پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا کہ ایک خوبصورت دھوبن پر اس کی نظر پڑی، اس کو دیکھ کر اس کی نفسانی خواہش ابھری، اس نے ہاتھی اس کی طرف بڑھایا، مگر یکایک اس کو خیال آیا کہ پرائی عورت سے ملنے کا خیال بڑا پاپ

ہے، اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے محل میں واپس آیا، برہمنوں کو بلایا، ان سے کہا کہ میں لکڑیاں اکٹھی کرکے آگ جلاؤں گا، اور پھر جل مروں گا، برہمنوں نے پوچھا آپ نے ایسا کون سا پاپ کیا ہے؟ راجہ نے دھوبن پر بری نظر ڈالنے کا واقعہ سنایا، تو برہمنوں نے فیصلہ دیا کہ بیشک راجہ کے لئے پرجا کی بہو بیٹیوں کو بری نظر سے دیکھنا بڑا پاپ ہے، اس کے بعد آگ جلائی گئی، راجہ آگ میں کودنے کے خیال سے آگے بڑھا، تو برہمنوں نے اس کا دامن تھام لیا، اور بولے بس کیجئے مہاراج! آپ کا پاپ مٹ چکا، آپ نے اس کا بدلہ چکا دیا، کیونکہ پاپ جو کچھ کیا آپ کے من نے کیا، بدن نے نہیں کیا، آپ کا بدن اگر پاپ کرتا، تو ہم اسے جلا دیتے، چونکہ من نے پاپ کیا تھا، اور وہ اب تک برائی کے احساس کی آگ میں جلتا رہا، اس لئے اس کی سزا ختم ہوئی، برہمن راجہ کو آگ کے پاس سے ہٹا لے گئے، پھر بھی راجہ نے اپنے نفس کو دھونے کے لئے ایک لاکھ بالو ترے دان کئے، (جوامع الحکایات ولوامع الروایات قلمی نسخہ دارالمصنفین ورق ۹۳، اردو ترجمہ ص ۳۰-۳۶، انجمن ترقی اردو)

مورخ ضیاء الدین برنی کی اشتعال انگیز تحریریں

ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان ہندوؤں کے خلاف بہت ہی سخت اور ناخوش گوار باتیں لکھی ہیں، جو سلاطین دہلی سے برسرپیکار رہتے، اور ان کے خلاف باغیانہ روش اختیار کئے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مولانا ضیاء الدین برنی کے اپنے کچھ ذاتی خیالات تھے، جن کا اظہار وہ مختلف پیرایہ میں کرتے رہے، ان کے بعض جملے اور بیانات ایسے ضرور ہیں، جن کو پڑھ کر غیر مسلموں میں بڑا اشتعال پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ اشتعال ایسے لوگوں ہی میں پیدا ہوتا ہے، جو قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرنا گوارا نہیں کرتے، اگر وہ ان تعلیمات کا گہرا مطالعہ کریں اور انہی کے مطابق کسی مورخ یا کسی حکمراں کا نارو قول یا فعل پائیں تو ان کا

حکمران راسے جے سنگھ کے پاس پہنچ کر اس کی فریاد کرنی چاہی، لیکن وہ بار یاب نہ ہو سکی
رسائی نہ ہونے دی، خطیب موقع پاکر راجہ کے پاس اُس وقت پہنچا جب وہ شکار کھیلنے
جا رہا تھا، اس نے اپنی سرگزشت سنائی، راجہ شکار سے واپس آیا، تو کئی روز تک روپوش
رہا، اس اثنا میں بھیس بدل کر کھمبایت پہنچ گیا، اور سب سے پوچھ گچھ کی، ہر ایک کی زبانی اس
کو یہی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے، اس تفتیش کے بعد اپنی راجدھانی
میں واپس آیا، تو خطیب کو دربار میں طلب کیا، استغاثہ پیش ہوا تو درباریوں نے اس کو جھٹلانے
کی کوشش کی، لیکن راجہ نے اپنی ذاتی تفتیش کا حال سنایا، پھر اس نے حکم دیا کہ کھمبایت
کے برہمنوں، پانگوں اور آتش پرستوں کے سرداروں کو سزا دی جائے اور اپنی طرف سے
ایک لاکھ بالوترے (اس زمانے کے سکے) عنایت کئے کہ مسجد اور مینار از سر نو تیار کئے جائیں
خطیب کو چار چتر بخشے، جو بڑے قیمتی اور رنگین ریشمی کپڑے سے تیار کئے گئے تھے، (جوامع الحکایات
ولوامع الروایات قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۱۵۵ اور اردو ترجمہ ص ۱۴۔ ۱۵ انجمن ترقی اردو)

سدید الدین عوفی نے نہر والہ کے ایک دوسرے ہندو راجہ کی پاک نفسی کا
ایک واقعہ بیان کرکے گویا اس کی تلقین کی ہے کہ اس کے کردار کی بلندی دوسرے
حکمرانوں کے لئے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے، اس کے بیان کے مطابق نہر والہ کا ایک راجہ
گور پال بہت ہی انصاف پسند، نیک اور عقلمند تھا، گدی پر بیٹھنے سے پہلے وہ برسوں
سادھوؤں کی صحبت میں رہ چکا تھا، اس لئے اس میں بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں
راجہ بننے کے بعد ایک دن وہ ہاتھی پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا کہ ایک خوبصورت
دھوبن پر اس کی نظر پڑی، اس کو دیکھ کر اس کی نفسانی خواہش ابھری، اس نے ہاتھی
اس کی طرف بڑھایا، مگر یکایک اس کو خیال آیا کہ پرائی عورت سے ملنے کا خیال بڑا پاپ

ہے" اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے محل میں واپس آیا، برہمنوں کو بلایا، ان سے کہا کہ میں لکڑیاں اکٹھا کرکے آگ جلاؤں گا، اور پھر جل مروں گا، برہمنوں نے پوچھا آپ نے ایسا کون سا پاپ کیا ہے" راجہ نے دھومن پر بُری نظر ڈالنے کا واقعہ سنایا، تو برہمنوں نے فیصلہ دیا کہ بیشک راجہ کے لئے پرجا کی بہو بیٹیوں کو بُری نظر سے دیکھنا بڑا پاپ ہے، اس کے بعد آگ جلائی گئی، راجہ آگ میں کودنے کے خیال سے آگے بڑھا، تو برہمنوں نے اس کا دامن تھام لیا، اور بولے بس کیجئے مہاراج! آپ کا پاپ مٹ چکا، آپ نے اس کا بدلہ چکا دیا، کیونکہ پاپ جو کچھ کیا آپ کے من نے کیا، بدن نے نہیں کیا، آپ کا بدن اگر پاپ کرتا، تو ہم اسے جلا دیتے، چونکہ من نے پاپ کیا تھا، اور وہ اب تک بُرائی کے احساس کی آگ میں جلتا رہا، اس لئے اس کی سزا ختم ہوئی، برہمن راجہ کو آگ کے پاس سے ہٹا لے گئے، پھر بھی راجہ نے اپنے نفس کو دھونے کے لئے ایک لاکھ بالوتر سے دان کئے، (جوامع الحکایات ولوامع الروایات قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۹۳، اردو ترجمہ ص ۳۶-۳۴، انجمن ترقی اردو)

مورخ ضیاء الدین برنی کی اشتعال انگیز تحریریں

ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان ہندوؤں کے خلاف بہت ہی سخت اور ناخوش گوار باتیں لکھی ہیں، جو سلاطین دہلی سے برسرپیکار رہتے، اور ان کے خلاف باغیانہ روش اختیار کئے ہوئے تھے، اس کے علاوہ مولانا ضیاء الدین برنی کے اپنے کچھ ذاتی خیالات تھے، جن کا اظہار وہ مختلف پیرایہ میں کرتے رہے، ان کے بعض جملے اور بیانات ایسے ضرور ہیں، جن کو پڑھ کر غیر مسلموں میں بڑا اشتعال پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ اشتعال ایسے لوگوں ہی میں پیدا ہوتا ہے، جو قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرنا گوارا نہیں کرتے، اگر وہ ان تعلیمات کا گہرا مطالعہ کریں اور انہی کے مطابق کسی مورخ یا کسی حکمران کا ناروا قول یا فعل پائیں تو ان کا

اشتعال بیجا قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن کسی مورخ یا کسی حکمراں کے قول و عمل کو اسلام کا حکم سمجھ کر اسلام سے نفرت کرنا اور پھیلانا تنگ نظری اور تنگ نیتی کی دلیل نہیں ہے؟ کیونکہ بعض مورخوں، فقیہوں اور حکمرانوں نے وقتی مصلحتوں اور شاہی ضرورتوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کی نامناسب تاویلیں کیں، تو وہ اسلام کی اصلی تعلیمات قرار نہیں دی جا سکتی ہیں۔

ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی نے قاضی مغیث الدین سے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہندوؤں کو ذلیل رکھنا دینداری کے لوازم میں سے ہے، کیونکہ وہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اس لیے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوؤں کے قتل کرنے، ان سے مال غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا، (تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰) کون ہندو ہے جو اس کو پڑھ کر مشتعل نہ ہوگا، مگر یہ تمام تر قاضی مغیث کی من گھڑت حدیث ہے، جس کو نقل کرکے ضیاء الدین برنی نے اپنی [illegible] کی انتہا پسندی بلکہ کج فہمی کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ ذیل کی حدیث کے بعد قاضی مغیث کی روایت کو کوئی کیونکر قابل قبول سمجھ سکتا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقم کو جزیہ وصول کرنے پر مقرر کیا، تو ان کو بلا کر فرمایا، جان لو کہ جو شخص کسی معاہد یعنی ذمی پر ظلم کریگا یا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے گا یا اس کو ذلیل کریگا، یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن بنوں گا، (کتاب الخراج از قاضی ابو یوسف ص ۷۲ مصری اڈیشن)

اسلام میں انسانی برادری کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہر حال میں منصفانہ برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے، سورہ مائدہ میں ہے کہ کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف ہر حال میں کرو کہ یہ بات تقویٰ

کے قریب ہے (الاعراف ۔ ۷)، بخاری شریف کی حدیث ہے کہ جو بندوں پر رحم کرنہیں کرتا، اس پر خدا رحم نہیں کرتا، مستدرک حاکم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائیگا، تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری کہ ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو وہ تمہارے ہی لئے ہے، (بقرہ ۔ ۳۷) مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اور لوگوں کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے، (مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرۃ النبی جلد ۶، باب انسانی برادری کا حق)

رحمۃ للعالمین کی شان رحمت کی تعلیم کے باوجود ضیاء الدین برنی نے ہندوؤں کے خلاف اشتعال انگیز باتیں لکھ کر اس عہد کی تاریخ بلکہ اسلام کو نقصان پہنچایا ہے، مگر اس سلسلہ میں یہ لکھے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس دور کے مورخین اور فقہا تو بہت کچھ باتیں اپنی نسلی برتری یا فتح و تسخیر کے غرور میں کہہ گئے، جو ان کو نہ کہنا چاہئے تھا، اور جن سے موجودہ دور کے مسلمانوں کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے، لیکن اس بیسویں صدی کے اس روشن خیالی دور میں ہندوستان کے کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو ازمنہ وسطیٰ کے سپاہیانہ تعصب سے بھی زیادہ سبقت لیجانا چاہتے ہیں، مثلاً آجکل کے ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ آر سی موزمدار سمجھے جاتے ہیں، وہ ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیپل کی جلد پنجم کی تمہید (ص ۰۰۷) میں لکھتے ہیں:-

گیا، یہ پہلا ملک تھا جو ہندوستان کے لئے ایک دروازہ بنا ہوا
بنا ہوا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے۔ اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت اور انسان کی قوت جاتی رہی بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقے سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا، جہاں سے ان کو اندرون ملک کے لئے ایک شاہراہ مل گئی۔ .....

یوں ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو شکست دی، اور ان کی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا ان ہی راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں یعنی مسلمانوں کو نکال باہر کیا ہے، تاکہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو اور یہ آریوں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اس لئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے، ہندو راجاؤں نے مل کر اس کی کوشش نہیں کی، کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال دے اپنے گوشت سے کانٹا نکال پھینکے، بہت سے مواقع آئے، جب کہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا..... لیکن طاقتور ہندوستانی راجاؤں نے ڈیڑھ صدی تک ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے ہمسایہ راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرے کی توسیع کی فکر میں لگے رہے، اور انھوں نے اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی، کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کراتے۔"

قاضی مغیث الدین یا ضیاء الدین برنی نے جو تلخ باتیں کہیں وہ تو وقتی غیظ وغضب کی پر محمول کیجا سکتی ہیں، لیکن مذکورۂ بالا تحریر تو صدیوں کے بعد لکھی گئی ہے، اگر قاضی مغیث کی باتیں قابل مذمت ہیں، تو مذکورۂ بالا اس سے زیادہ قابل مذمت قرار دیجانی چاہئے، اسکے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایسی جو تحریریں نکلیں یا نکلتی رہی ہیں، ان کو قابل اعتنا ہرگز نہیں

سمجھنا چاہئے کیونکہ اگر اسی دور کی تحریروں سے دل شکنی ہوتی ہے تو اسی دور میں بہت سی ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی ہیں، جن سے باہمی موافقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اگر ضیاء الدین برنی کے بعض بیانات سے دل آزاری ہوتی ہے، تو اسی دور میں ایسے تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں، جن سے قاضی مغیث الدین کی تلقین بے معنی نظر آتی ہے، بلکہ بعض ہندو راجاؤں کے متعلق امیر خسرو، عصامی اور خود ضیاء الدین برنی نے بہت اچھے الفاظ استعمال کئے ہیں، اور ان سے جو خوشگوار تعلقات پیدا ہوئے، اس کا ذکر لطف و لذت سے کیا ہے، جیسا کہ ابھی ذکر آئیگا، اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا قاضی مغیث الدین کی تلقین پر کبھی عمل ہوا، حجاج بن یوسف بڑا جابر حاکم گذرا ہے، گذشتہ اوراق میں اس کے احکام کا ذکر آچکا ہے، اس نے کبھی محمد بن قاسم کو وہ تلقین نہیں کی جو قاضی مغیث الدین نے کی، اور جس کو ضیاء الدین برنی نے قلم بند کرکے بظاہر ایک فرض ادا کیا، مگر خود ضیاء الدین برنی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا، کہ اس تلقین پر کبھی عمل نہیں ہوا، اور اگر ہوتا تو مسلمانوں کی حکومت دیرپا نہ ہوتی، فاتح اور مفتوح کے درمیان ضرور تلخیاں رہیں، لیکن فاتح کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ان تلخیوں کو جلد از جلد دور کرے، اور ایسی تلخیاں دور ہوتی رہیں

غیاث الدین بلبن کے عہد کی رواداری

غیاث الدین بلبن (۱۲۶۵ء-۱۲۸۷ء) کے عہد تک آتے آتے تو تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو گئی تھی، اس دور کی رعایا پروری، عدل گستری، اور رواداری کا اندازہ سنسکرت کے اس کتبہ سے بھی ہوتا ہے جو پالم میں پایا گیا، اور دہلی کے آثار قدیمہ کی عجائب گاہ میں موجود ہے، اس میں تاریخ ۱۳۳۷ بکرمی (مطابق ۱۲۸۰-۸۱ء) درج ہے، اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کے متعلق ہے، کہ اس بادشاہ کی حکومت شاندار اور قابل تعریف ہے ...... اس بادشاہ کی خدمت میں جو متعدد راجے آتے جاتے ہیں، ان کے مکٹوں سے گرے ہوئے

اہرات کی چمک دمک کی بجائے سارا ملک جگمگا رہا ہے .... جب سے ... دنیا
نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے، دنیا کو سہارا دینے والے شیش ناگ دھرتی کے نیچے
ایک دو شن بیٹھے ہیں، اور وشنو بھگوان اس کی نگہبانی کا خیال چھوڑ کر اطمینان سے دودھ
کے سمندر پر محو استراحت ہیں..... اس سلطان کے عہد عدالت میں..... دہلی کا شہر
خوش حال اور فارغ البال ہے، یہ شہر دھرتی ماتا کی طرح بے شمار جواہرات کا خزانہ ہے،
سورگ دھام کی طرح عیش و عشرت کا ٹھکانہ ہے، پاتال کے مانند شہزوروں کا مسکن ہے،
اور مایا کی طرح دل کش و دل فریب ہے" (بحوالہ ہندوستان کے معاشرتی حالات ازمنۂ وسطیٰ
میں از عبداللہ یوسف علی ص ۱۰۰-۹۸)

ہندو راجاؤں کا احترام اوپر کے کتبہ سے ظاہر ہے کہ بلبن کے دربار کی زینت و آرائش بڑھانے
میں ہندو راجاؤں کا بھی حصہ تھا، خود ضیاء الدین برنی نے بلبن کے حالات کے سلسلہ میں لکھا ہے

"و رسولان دور دست و رایان و راؤزادگان و مقدمان آمدہ درگاہ را خاکبوس
کنانندے (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۱)"

بلبن جب طغرل کی بغاوت کے لئے لکھنوتی گیا، تو رائے دنوج نے طغرل کے خلاف اس کی
ہر قسم کی مدد کی، رائے دنوج جب اس سے ملنے آیا تو تاریخ مبارک شاہی کے مصنف کا بیان
ہے کہ وہ رائے دنوج سے بڑے احترام سے پیش آیا،

"و چون رسید ..... تشریفات گران مایہ سرفراز گردانید (ص ۴۳-۴۲)

راقم کا یہ خیال ہے کہ سلاطین دہلی کے زمانے میں ہندو امراء دربار سے علٰحدہ ہونے
کے بجائے ان سے برابر وابستہ رہے، مگر اس عہد کے مورخوں نے ان کا ذکر اس انداز
میں نہیں کیا ہے، جس طرح کہ ان کا مغلوں کے زمانے میں ہوا، مثلاً بلبن کے جانشین

سی ـــ

معزالدین کیقباد کے دربار کے ہندوؤں کا ذکر امیر خسرو نے قران السعدین میں اس طرح کیا ہے!

راوت ہندو میاں زن رخار اشگاف	بشت بہ پشت از پے روے مصاف

راوت سے یہاں مراد غالباً راجپوت ہی ہیں، معزالدین کیقباد کے بعد کڑہ کے ملک چھجو اور جلال الدین خلجی سے لڑائی ہوئی تو کوتلہ کے پرم دیو اور رائے بھیم دیو نے ملک چھجو کا ساتھ دیا، (تاریخ مبارک شاہی ص ۶۴-۶۳)

علاء الدین خلجی کے عہد میں ہندو راجاؤں کی قدر و منزلت

اور یہ مطالعہ کر کے تعجب ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) نے جب جنوبی ہند کی تسخیر کی تو ان علاقوں کی فتوحات کے سلسلہ میں ہندو راجاؤں کا بھی تعاون رہا، علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۶ء میں دیوگیر فتح کیا، اس کا راجہ رام دیو علاء الدین خلجی کا ہر طرح وفادار رہا، اس کے لڑکے بھیلم نے اس کے خلاف سرکشی کی، تو اس نے علاء الدین خلجی سے امداد طلب کی، فتوح السلاطین میں عصامی نے رام دیو کا ذکر "سرفراز ہنود" اور "بندہ خاص درگاہ شاہ" لکھ کر کیا ہے، رام دیو نے جس طرح مدد مانگی اور پھر یہ جس طرح دی گئی، اس کو عصامی جس طرح بیان کرتا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ رام دیو سلطان علاء الدین خلجی کو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا،

ہم آخر شنیدم کہ از رام دیو	یکے پیکے آمد بہ کیہان خدیو
نہانی بہ شہ گفت کاے شہریار	جہاں باد بر نام تو پائیدار
مرا رائے بہ شہ فرستاد زود	چنیں گفت آں سرفراز ہنود
کہ بھیلم ابا جملہ اہل دیار	سرے تافت از طاعت شہریار
مرا ہم بہ تکلیف از راہ برد	عنانم بدہ جوانان سپرد
من از بیم جاں داوم او را رضا	ہمہ حال گشت از در پادشاہ

منم بندۂ خاص درگاہ شاہ　　　ثنا ہم سرادم ز ...

بجاں عہد کا دل بہ شہ کردہ ام　　　بہ صد عجز سوگند ہا خوردہ ام

چو حاکم دہد دور گیتی بباد　　　روان مرا باشد آں عہد یاد

گر آں مفخر خسروان سلف　　　فرستد یکے بندہ ایں طرف

بر آرد دیارے ز برگشتگاں　　　برو بستہ شاں پیش شاہ جہاں

چو ایں قصہ را جملہ گیہاں خدیو　　　شنید از فرستادۂ رام دیو

ملک نائب آنکہ بہ فرمان شاہ　　　بہ ملت بزد خیمہ در بارگاہ

سپہ راند در جانب دیوگیر　　　ہمی رفت ہر روز با دار و گیر

ملک کافور کی نگرانی میں یہ فوج دیوگیر کی طرف بھیجی گئی اور وہاں اس کو فتح حاصل ہوئی عصامی کا بیان ہے کہ اس کے بعد رام دیو علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا، تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اس پر موتی نچھاور کئے گئے، دو لاکھ تنکے نذر دیئے گئے، رائے رایان کا خطاب عطا کیا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کو چتر بھی دیا گیا، (ص ۲۷۶)

شنیدم کہ آں خسرو نیک نام　　　بداد اندراں روز خوش بار عام

ہماں رام دیو گزیں را بخواند　　　بفرقش بسے در و گوہر فشاند

دو لک تنکۂ زر ہماں شاہ داد　　　بداں آہر مرتبہ انعام داد

بکرد آنکہش رائے رایاں خطاب　　　کہ اہل وفا یافتش کامیاب

دگر بار آں خسرو کامگار　　　یکے چتر دادش دراں روزگار

اور جب ۷۰۹ھ میں دہلی سے کافور کی فوج ارنگل کی طرف بڑھی، تو رام دیو نے شاہی فوج کی ہر طرح مدد کی، یہ فوج دیوگیر ہوتی ہوئی ارنگل پہنچی، تو رام دیو نے

بڑھ کر اس کا استقبال کیا، ملک کافور اور اس کے امرار کی خدمت طرح طرح سے کی، روزانہ لشکر کی دیکھ بھال کے لیے آتا، اس کے لئے علوفے فراہم کئے، دیوگیر کا بازار کھول دیا، دکانداروں کو تاکید کی کہ وہ اپنی چیزوں کو سستی قیمت پر فروخت کریں، جب لشکر دیوگیر سے آگے بڑھا تو رام دیو نے اپنے آدمی اونٹگل تک ساتھ کر دیئے کہ وہ لشکر کو علوفہ، غلہ اور دوسری چیزیں فراہم کرتے رہیں، اور لشکر سے پورا تعاون کریں، اس نے ملک کافور کے ساتھ "بان لعل" کی محافظت کے لئے مرہٹہ سوار اور پیادے بھی نامزد کئے، خود ملک کافور کو رخصت کرنے دور تک گیا، مولانا ضیار الدین برنی جو قاضی مغیث الدین کی تلقین کے حامی تھے، رام دیو کی اطاعت، فرماں برداری اخلاص اور خیر خواہی کے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :-

"می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بر سر کارے کردن ہمیں بار آرد کہ از رام دیو معائنہ می شود (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۲۹)

مولانا ضیار الدین برنی ہی کا بیان ہے، کہ رام دیو آخر وقت تک علار الدین خلجی کا بہی خواہ رہا (ص ۳۲۶) عصامی کی روایت کے مطابق رام دیو کی ایک لڑکی سلطان علار الدین خلجی کے حرم میں بھی داخل ہو گئی تھی اور اس سے شہاب الدین خلجی پیدا ہوا، جس کو علار الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک نائب کافور نے کچھ دنوں تخت پر بٹھایا (ص ۳۲۲-۳۲۵)

۱۳۱۲ء میں شہزادہ خضر خاں کی شادی الپ خاں کی لڑکی سے ہوئی تو اس تقریب کے جشن میں رام دیو بھی مدعو کیا گیا، وہ اور ہندو راجاؤں کے ساتھ اس میں شریک ہوا، فتوح السلاطین میں ہے (ص ۳۱۶)

ز گجرات آمد الپ خاں زراد — بفرماں سہ سر بہ حضرت نہاد
شنیدم کہ آورد بس برگ و ساز — پے کار دخت خود آں سرفراز
ہماں رام دیو آمد از دیوگیر — کہ مر شاہ را بود فرماں پذیر
دگر مرزبانان اتسلیم دار — خراماں رسیدند از ہر دیار

اسی سال یعنی ۱۳۱۲ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر بھی ایک فوج بھیجی تو رائے رایان رام دیو نے شاہی لشکر کی پھر ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں اس کی تعریف رائے اجل برائے اصیل اور رائے نیک اصل کہ نہال کردۂ درگاہ خلافت پناہ است لکھ کر کی ہے، اور لکھا ہے کہ جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے ہوئے دیوگیر سے گذرا تو رام دیو نے پورے اخلاص سے شہر دیوگیر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا، اور حکم دیا کہ لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود رہیں، اور اگر شاہی لشکر کے پہلوانوں کو اپنے تیروں کے لئے سیمرغ کے پروں کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں، تاکہ دھور سمندر اور معبر کے دیووں کو زیر کیا جاسکے، دیوگیر کا بازار بوستان ارم کی طرح آراستہ کیا گیا، جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذرے تو ان کو معلوم ہو کہ بہشت شداد سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے سجایا گیا تھا صراف سونے اور چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں کی دکانیں لگا رکھی تھیں پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ان میں بعض پھل تو انار سے زیادہ شیریں اور آم سے زیادہ بہتر تھے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے، نیل اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی ہوئی تھیں، کہ مناسب قیمتوں پر خریدی جاسکیں، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے   نہ ہندو را مخالف بود رائے

رائے رایان رام دیو نے اپنے ایک فوجی سردار پرسو رام دلوی (پرس دیو دلوی) کو ہدایت دی کہ وہ شاہی لشکر کو دھورسمندر تک پہنچانے میں ہر قسم کی مدد کرے، دلوی نے اس حکم کی تعمیل کی، شاہی لشکر پانچ منزل کر کے دیوگیر سے دلوی کے پاس پہنچا، امیر خسرو کا بیان ہے کہ

"آں دلوی کہ ....، از سرگردش چرخ در طالع خود سعادتے دید برج خود ثباتے تمام دید و در زمان باستقبال انجم مسعود اسلام آمد" (خزائن الفتوح ص ۱۲۸)

دھورسمندر کی طرف شاہی فوج بڑھی، تو وہاں کے راجہ کے خاندان میں اختلاف تھا، دو بھائی سندر پانڈیا اور ویر پانڈیا تھے، دونوں تخت کے دعویدار ہوئے تو سندر پانڈیا نے سلطان علاء الدین خلجی سے امداد طلب کی، اور ویر پانڈیا نے شاہی لشکر کا مقابلہ کیا، لیکن بعد صلح کر لی اور شاہی لشکر کا بہت بڑا معاون ہو گیا، جب فوج نے معبر کی طرف کوچ کیا تو ویر پانڈیا نے اس کی رہبری کی، عصامی ویر پانڈیا کو بلال (ویر بلال دیو) لکھا ہے، اور اس کو "فخر رایان ہندوستان" بتاتا ہے، اس سے صلح ہوتی ہے، تو عصامی لکھتا ہے (ص ۲۸۲)

بسے خدمتے پیش کردہ بلال   چہ اسپ و چہ گوہر چہ پیل و چہ مال
روان شد سوے نائب خاص شاہ   ببوسید پایش در اثنائے راہ

ملک کافور بھی اس کے ساتھ بڑی عنایتوں سے پیش آیا، اور خلعت عطا کی،

چو دیدش مالک نائب سرفراز   کہ دشمن شکن بود و مہمان نواز
بصد پرسش و عذر بنواختش   چو صاحب کلاہان سرافراختش
پذیرفت ازو خدمتیہا تمام   بگردش ز بس وعدہا شادکام

بکے خلعت زر دیگر ارتا یہ داد ــ ــ بہ نعمت بدا کام برلشکرش

کچھ دنوں کے بعد راجہ بلال سے کہا گیا جبکہ وہ شاہی لشکر کا دل و جان سے یار ہو گیا ہے تو وہ معبر کی طرف لشکر کشی میں شاہی فوج سے تعاون کرے، وہ اس کے لئے راضی ہو گیا، عصامی نے اس تعاون کی تفصیل اس طرح قلم بند کی ہے، (صفحہ ۲۸۰)

پس از ہفتہ گفتش آں کامراں ــ ــ کہ اے فخر رایان ہندوستاں
تو چوں از دل و جاں شدی یار ما ــ ــ دل و جان تو باد عشرت گرا
کنوں بشنو اے فخر ہندوستاں ــ ــ چنین است فرمان شاہ جہاں
کہ ایں بار ہمراہ لشکر شوی ــ ــ ز بی کوس و در سمت معبر شوی
کہ آگہ نگردد کس از اہل راہ ــ ــ کشند ناگہاں سر بہ معبر سپاہ
بہ سمع بلال ایں سخن چوں رسید ــ ــ گریزے دگر جز اطاعت ندید
پذیرفت فرمان شاہ جہاں ــ ــ پے رہبری بست محکم میاں
بروز دگر نائب بادشاہ ــ ــ رواں کرد در سمت معبر سپاہ

معبر بھی فتح ہو گیا، اس طرح ارنگل، دھور سمندر، اور معبر کی فتح میں راجہ رام دایاں، رام دیو، پرس دلو دلوے اور راجہ دیر بلال کا بھی تعاون رہا،

ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی توقیر

کے، ایم پنیکر نے اپنی کتاب "اے سروے آف انڈیا" میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی..... ایک متعصب حکمراں سمجھا جاتا ہے لیکن اس نے ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی، جینیوں کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے آچاریہ مہا سین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا اس سے مذہبی مناظرے کئے، یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ فرقہ دیگمبر کے پیشوا پورنا چندر جو دہلی میں رہتے تھے،

اور سوئمبر دیگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت تھی، (ص ۱۳۱)

ضیاء الدین برنی اور قاضی مغیث الدین دونوں کو ضرور معلوم رہا ہوگا کہ علاء الدین خلجی نے ہندو راجاؤں کی تعظیم و تکریم میں ان کے ساتھ راے رایاں، فخر رایان ہندوستان سرفراز ہنود، بندہ خاص درگاہ شاہ، دل و جان یار اور فخر ہندوستان کی طرح پیش آتا رہا، جینیوں اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی بھی عزت و توقیر کی، جس کے بعد . . . . انھوں نے جن کثرت حدیث کے ذریعہ ہندوؤں کو دشمن اسلام سمجھ کر ذلیل و خوار رکھنے کی جو تلقین کی تھی، وہ عملی حیثیت سے بیکار اور بے معنی تھی، البتہ اس تلقین کو اپنی زبان سے نکال کر نہ صرف اپنے کو بدنام کیا، بلکہ مسلمانوں کے اس دور کی تاریخ کو بھی داغدار کیا، کسی زمانے میں بھی سلاطین دہلی کا رویہ قاضی مغیث الدین کی تلقین کے مطابق نہ رہ سکے، ایم مینکر کا بیان ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عمال میں دو جین تھے، جن کا اثر سلطان پر بہت تھا (اے سروے آف انڈیا ص ۱۳۱)

ابن بطوطہ (المتوفی ۱۳۷۷ء) نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق (المتوفی ۱۳۵۱ء) کے خلاف ایک ہندو امیر نے دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا ہے، قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں طلب کیا، وہ بغیر کسی ہتھیار کے قاضی کی عدالت میں گیا، اور وہاں جاکر سلام و تعظیم کی، قاضی کو پہلے کہلا بھیجا تھا، کہ وہ عدالت میں آئے، تو اس کی تعظیم نہ کی جائے، وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا، قاضی نے حکم دیا، کہ سلطان مدعی کو راضی کرے، ورنہ قصاص کا حکم ہوگا، سلطان نے مدعی کو راضی کیا، تو اس کی گلو خلاصی ہوئی، (سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۲۸-۱۳۷)

اس سے یہ ظاہر ہے کہ قاضی اور سلطان دونوں کو اس ہندو امیر کے ساتھ خلاف

سلوک کرنے کے بجائے شفقت و برتاؤ کرنے پر مجبور تھے اور یہ تاثر تو اب کوئی ابھی نہیں
کر سکتا کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں عدل و انصاف کرنے میں ہندو مسلمانوں کی تفریق
کی جاتی تھی، جیسے جیسے نئی تحقیقات سامنے آرہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین
دہلی کے عہد میں بھی ہندو ذمہ دار عہدوں پر مامور ہوتے رہے، سلطان محمد تغلق کے عہد
میں تو نظام سلطنت چلانے میں بہت سے ہندو شریک کئے گئے، بہار کے ایک کتبہ سے
معلوم ہوا کہ اس سلطان کا ایک ہندو وزیر سلے راج تھا، خود ضیاء الدین برنی کے بیان
سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے دیوگیر کا وزیر عماد الملک کو بنایا، تو اس کا نائب
وزیر دھارا کو مقرر کیا، (ص ۵۰۱) برنی ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیرا مالی کو
دیوان وزارت کے عہدہ پر مامور کیا گیا (ص ۵۰۵) سیروان کا حاکم رتن بنایا گیا، بھیران رائے
گلبرگہ کا مقطع مامور ہوا، اور اس کو ہیر کا اقطاع دیا گیا، ابن بطوطہ اور عصامی دونوں
کا بیان ہے کہ وہ جوگیوں سے بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے
شائع کردہ انڈین ہسٹری کانگریس A compren hoive hioloey of Indie
میں لکھا ہے کہ جینیوں کے ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان جینی فضلاء سے تعلق رکھتا
تھا، ان میں سے ایک جینا پربھا سوری نے اس سے آدھی رات تک مذہبی گفتگو کی،
جس کے بعد سلطان نے اس کو ایک ہزار گائیں اور دوسرے تحفوں کے ساتھ دیں، سلطان
نے دوسرے جین فضلاء میں راجہ سیکھار اور جینا پربھا سوری کی بھی سرپرستی کی،
سلطان ہندوؤں کے تہواروں ہولی سے بھی دلچسپی لیتا رہا، (ص ۲۹۳) سلطان کی یہ رواداری
اور فراخ دلی بعض حلقہ میں غالباً پسند نہیں کی گئی، اسی لئے عصامی نے اس کا ذکر کرتے
ہوئے لکھا ہے، (فتوح السلاطین ص ۵۱۵ مدراس اڈیشن)

از اندیشۂ اسلام سر تافتہ — ابا زمرۂ کفر در باختہ
برانداختہ رسم بانگ نماز — شب و روز نہ از دو اہل دیں درگذا
جماعت پہ جمعہ در انداختہ — ابا ہندوان ہوسے باختہ
ابا جوگیان گشتہ خلوت گرائے — بہ دل راہ کفار دادہ زجائے

اوپر کے اشعار سے تو ظاہر ہے کہ محمد بن تغلق نماز وغیرہ چھوڑ کر جوگیوں اور ہندوؤں کی طرف مائل ہو گیا تھا، اور اس کو اسلام سے دوری ہو گئی تھی لیکن یہ کیسے یقین کیا جائے، جب ابن بطوطہ کی چشم دید روایت ہے کہ یہ بادشاہ نماز کے معاملہ میں بہت تاکید کرتا تھا، اس کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے، (اردو ترجمہ ص ۹-۱۳۸) خود شریعت کا پابند تھا، احکام شرع کی پابندی کی سخت تاکید کرتا تھا (ایضاً ص ۱۲۹-۱۵۰) خود برنی کا بیان ہے کہ جب وہ اذان کی آواز سنتا تو کود کر کھڑا ہو جاتا، اور اذان کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا، صبح کی نماز کے بعد اوراد بھی پڑھتا، (تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۷) بیماری میں بھی روزہ قضا نہ کرتا، یوم عاشورہ کا بھی روزہ رکھتا (ایضاً ص ۵۲۲) وہ تو سلطنت چھوڑ کر مکہ ہجرت کر جانے کا بھی کبھی کبھی ارادہ کرتا، (ایضاً ص ۵۰۴) فسق و فجور سے ہمیشہ پرہیز کرتا رہا (ایضاً ص ۵۲۲) وہ تو کلام پاک کا حافظ بھی تھا، وغیرہ، وغیرہ، پھر اس پر انحراف اسلام اور کفر کا الزام عصامی نے کیسے رکھدیا، مورخ کا قلم بھی عجیب و غریب ہوتا ہے، اس کے قلم کا حسن کرشمہ ساز جو چاہے کر سکتا ہے، بات یہ ہے کہ سلطان میں غیر معمولی ذہانت تھی اس کا علم بھی وسیع تھا، قرآن، حدیث، فقہ، کلام، اور فلسفہ وغیرہ سب پر اس کی نظر تھی، اس لئے اپنی مجلسوں میں کبھی خالق کائنات، کبھی واجب الوجود کی وحدت، کبھی نبوت

کی صداقت پر بحث ہوا کرتی ہوتی، جس میں متعصبانہ اور متشددانہ رنگ پیدا ہوجاتا ہے
پسند علماء کے حلقہ میں کسی طرح پسند نہیں کیا جاتا، اس لئے سلطان محمد تغلق سے علماء میں بدظنی پیدا ہوگئی
یہ محض اس کی رواداری تھی، کہ وہ ہندو اور جین مذہب سے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہا، ان مذاہب کے فضلاء کو بھی اپنی مجلسوں میں مدعو کرتا رہا، سولہویں صدی کے ایک پرتگالی مصنف نونیز نے لکھا ہے کہ سلطان نے گجرات کی مہم کے زمانے میں ایک شوالہ بھی بنایا تھا، (بحوالہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از پروفیسر خلیق احمد نظامی

(ص ۳۴۶)۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد جب الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے تو انھوں نے اپنی اور تصانیف کے ساتھ ہسٹری آف دی قرونہ ٹرکس بھی لکھی، اس میں سلطان محمد بن تغلق کے مختلف کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسی دور میں مسالک الابصار قلم بند ہوئی اس کا مصنف سلطان کے ظلم وستم کا ذکر نہیں کرتا، وہ ہندوؤں کے سفاکانہ قتل کا اشارہ بھی نہیں کرتا، حالانکہ اس عہد میں ہندوؤں کے ساتھ جو نا روا حرکت کیجاتی، اس کا ذکر مسلمانوں کا مذہبی طبقہ بڑی مسرت کے ساتھ کرتا ہے، (ص ۲۱۶) ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے مولانا ضیاء الدین برنی اور قاضی مغیث الدین جیسے علماء ہی کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے مذہبی طبقہ پر الزام رکھدیا ہے، ان کا یہ الزام ایک حد تک صحیح ہے، جب یہ دونوں علماء کا لباس پہنے ہوئے تھے، تو ان کو ایسی نا روا باتیں زبان یا قلم سے نکالتے وقت سوچ لینا چاہئے تھا کہ ان کے کہنے یا لکھنے کا رد عمل کیا ہو سکتا ہے، ضیاء الدین برنی تاریخ لکھ رہے تھے، جس کے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ نہ صرف ان ہی کے دور میں بلکہ ہر زمانہ میں پڑھی جائیگی، ان کو ہر بات سوچ کر قلم بند کرنا چاہئے تھا، اور جب

وہ علماء کے نمائندے بن رہے تھے تو جن باتوں سے علماء سے سوء ظن پیدا ہو سکتا تھا، ان کو قلم بند کرنے میں احتراز ضروری تھا، اس لحاظ سے ڈاکٹر ایشوری پرشاد سے تو شکایت نہیں پیدا ہونی چاہئے کہ انھوں نے مذہبی طبقہ پر یہ الزام کیوں رکھ دیا، بلکہ مولانا ضیاء الدین برنی مورد الزام ہیں کہ انھوں نے مذہبی طبقہ کے متعلق یہ رائے قائم کرنے کا موقع دیا،

اور جو باتیں ضیاء الدین برنی کو لکھنا چاہئے تھا، ان کو پروفیسر ایشوری پرشاد نے لکھ کر اپنی حقیقت پسندی کا اظہار کیا، وہ اپنی کتاب ہسٹری آف قرونہ ترکس میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"پورے نظام سلطنت کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی حکومت اب مرتب شکل میں ہو گئی تھی، مسلمانوں کی فوج سے کوچ کرتے وقت وہ پہلا سا متعصبانہ جوش و خروش بھی جاتا رہا تھا، ان کے برتاؤ میں پہلی سی سختی باقی نہیں رہ گئی تھی، زندگی جب پُر امن ہو گئی تو سیاسی فرائض کی نوعیت بھی بدل گئی، اور ترقی پسند خیالات بھی پیدا ہوتے گئے، ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جانے لگا، اور حکمراں طبقہ کو بھی رواداری اور معاشرتی یگانگت کا احساس پیدا ہوتا گیا، خواہ یہ کتنا ہی کم کیوں نہ رہا ہو، ایک ترقی یافتہ سلطنت میں طرح طرح کے مسائل اٹھتے رہے جس کی وجہ سے ایک حکمراں کو ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑی کہ وہ خود بھی رہے اور دوسروں کو بھی رہنے دے، اسی لئے سلطان محمد بن تغلق نے ہندوؤں کے خلاف کوئی نازیبا روش نہیں اختیار کی، بلکہ اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، اور ان کو عہدے دیئے، اس نے ستی کی رسم پر بھی قدغن لگایا، جو اس کی روشن خیالی کی دلیل ہے، (ص ۳۴۴)

فیروز شاہ تغلق (   ) بڑا مذہبی قسم کا حکمراں گذرا ہے ضیاء الدین

برنی اس سے بہت خوش نظر آتے ہیں، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"...... وحدہ اسلام و مسلمانی پاکیزہ اعتقاد تر از سلطان محمد و سلطان فیروز شاہ

السلطان پیش برتخت گاہ دہلی نہ نہادہ است (ص ۵۶۳)

در اجرائے احکام شرع محمدی بادشاہی دیگر ندیدہ ام (ص ۶۰۰)"

مگر کیا اس نے قاضی مغیث الدین کی نصیحتوں پر عمل کیا؟ ہرگز نہیں، اس دور کا مورخ شمس سراج عفیف بھی فیروز شاہ کا بڑا مداح ہے، وہ پہلے تو یہ لکھتا ہے، کہ ایک بادشاہ کو ملک کی خاطر کیسا ہونا چاہئے، اس پر بحث کرتے ہوئے اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی سند میں کلام پاک کی آیتیں، حدیث کی روایتیں، مشائخ اور گذشتہ فرماں رواؤں کی رائیں بھی نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تمام مخلوق کے ساتھ قلبی شفقت رکھتا ہے (ص ۴) عامہ خلائق کو اپنے باران کرم سے فیضیاب کرتا ہے، اور ابر بار اں کی طرح خلقت پر احسان کے موتی برساتا ہے، بیگانہ افراد کو دائرۂ یگانگت میں داخل کرتا ہے، اپنے لطف و کرم اور مہر و محبت سے یگانوں کی کثرت میں روزافزوں اضافہ کرتا رہتا ہے، بہتر فرقے اس کے سائے میں آرام پاتے ہیں (ص ۵) اس کے قلب میں جس قدر مادۂ شفقت ہوگا، اسی قدر اس کی نیک نامی کی شہرت پھیلے گی، اس کا گوہر شفقت وہ دولت ہے، جس کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے (ص ۶) وہ عفو کو اپنا شعار بناتا ہے، حلم و بردباری کے گیند سے اپنی ہمت کے میدان میں کھیلتا رہتا ہے، اس کی شفقت کے دربار میں حلم کے موتی پائے جاتے ہیں، (ص ۷) وہ اپنے عدل سے مظلوم کی داد خواہی کرتا ہے، مسکینوں اور محتاجوں کو نوازتا رہتا ہے (ص ۸) وہ اپنے ایام حکومت میں ایثار سے کام لیتا ہے، اور جو نقد و مال اس کے یہاں جمع ہوتا ہے، اس کو

دہ سختوں تک پہنچا آمادہ ہتا ہے، (ص ۱۱) ظاہر ہے کہ تمام مخلوق، عامۂ خلائق، مظلوموں اور محکوموں میں ہندو و مسلمان دونوں رعایا داخل ہیں، رعایا پروری میں یہی اسلام کی صحیح تعلیم ہے شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق فیروز شاہ تغلق ان تمام اوصاف کا حامل تھا، اسی لئے اس دور کی خوبیاں لکھنے میں اس کا قلم بڑا رواں دواں ہوگیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق اپنے ملک کے لوگوں پر اسی طرح مہربان تھا جس طرح ماں اپنے بچوں پر رہتی ہے، اسی لئے اس نے اپنی سلطنت کے لوگوں سے پیش آنے میں اپنا دستور العمل یہ بنایا تھا،

نگہ کن کہ چوں مادر مہر سنج   بر آں طفل خود چند بر داشت رنج

وہ لوگوں کے بہت سے قصور اور جرم کو معاف کرتا رہتا، لیکن چوری اور قتل کے جرم کو معاف نہیں کرتا کیونکہ اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی، (ص ۲۲-۲۱-۲۰) اس نے تخت پر بیٹھتے ہی وہ تمام بھاری محاصل جو کسانوں اور کاشت کاروں کے ذمہ تھے معاف کر دیئے، تاکہ لوگوں میں بے چینی کے بجائے خوش حالی پیدا ہو، (ص ۹) تمام غیر شرعی محاصل بھی منسوخ کر دیئے گئے، اور اگر کوئی عامل مقرر کردہ محصول سے زیادہ وصول کرتا تو اس کا شدید تدارک کیا جاتا، اسباب و اجناس کی قیمتیں مقرر کر دی گئیں، ان ہی کے مطابق خرید و فروخت ہوتا، اس میں کوئی بے اعتدالی نہ ہوتی، اس طرح اہل بازار بھی خوش تھے، اور پھر عام لوگ بھی مطمئن رہے، اور آسودہ رہے، آبادی بڑھنے لگی، اور ہر چار کوس پر ایک گاؤں آباد ہو گیا (ص ۱۰۰-۹۹) عفیف نے اس عہد کی بہت سی اور تفصیلات لکھی ہیں، ظاہر ہے کہ کسان کاشت کار، بازار اور گاؤں والے تو اس زمانے میں زیادہ تر ہندو ہی تھے، فیروز شاہ نے اپنی رعایا کی فارغ البالی کی کوشش میں قاضی مغیث الدین کی طرح ہندوؤں کو دشمن اسلام نہیں قرار دیا، بلکہ عام ہندو

رعایا کی خوشحالی اور فلاح وبہبود کے لئے کوشاں رہا، اسی لئے عفیف کو لکھنے میں یہ خوشی ہوئی ہے کہ تمام غیر مسلم رعایا رفاہیت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، سوداگر بھی فارغ البال اور خوشحال تھے، وہ دوسرے ممالک میں جاکر تین تین چار چار برس رہتے اور بے شمار منافع حاصل کرکے واپس آتے، (ص ۱۰۰) عفیف کے کچھ الفاظ یہ ہیں۔

"از طائفۂ ذمیان و امثال ایشاں زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی بہ رفاہیت می گذرانیدند (ص ۱۰۰)

اس کی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے موجودہ دور کے مورخوں میں ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے حکمرانی میں اشوک کے اصولوں کو اختیار کیا، تاکہ سیاست کے برے اثرات زائل ہو کر عام لوگوں کو فلاح وبہبود کا ایک نیا معاشرتی اور سیاسی نظام قائم ہو جائے، اس کی حکمرانی کی بنیادی باتوں میں انسانیت کے اچھے پہلو زیادہ نمایاں کئے، یعنی اس کی سیاست میں نرمی، لطف وکرم اور رحم دلی غالب رہی، اس نے اپنی بادشاہت کا اولین فرض یہ قرار دیا تھا کہ انسانوں کو غیر معمولی سزائیں نہ دی جائیں اور ان کو غیر قانونی طور پر قتل نہ کیا جائے، اس کے عہد سلطنت میں انسانیت کو بہیمانہ قوتوں پر غلبہ حاصل ہوا، خود اس نے انسانوں کی خاطر سیاست کی تمام غیر منطقیانہ باتوں اور لاقانونیت کے خلاف جنگ اور ان کے پیدائشی حقوق کی حفاظت کی، اس طرح وہ اپنی رعایا کا سچا محافظ بن گیا تھا، انسانی خدمت اور انسانی فلاح کا جو تخیل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تھا، اسی کو اس نے عملی جامہ پہنایا، اس کی دلی خواہش ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی تھی، مگر اسی کے ساتھ سیاست کے اخلاقی اور ثقافتی عناصر کو بھی نمایاں رکھنے کی فکر میں رہا، اس کی حکومت عملی اور نظری حیثیت سے اسلامی طرز کی تھی، مگر

اس کی اصل غرض ثابت رعایا کی فلاح و بہبود تھی، تمام امور اسلامی نقطۂ نظر سے طے پاتے تھے لیکن ایسے تمام جبری قوانین ختم کردیئے گئے تھے، جن سے لوگ پریشان اور عاجز تھے، اور ان قوانین کو غیر اسلامی قرار دیا گیا، اسلامی قوانین کے ذریعہ رعایا کی فلاح اور خوشحالی میں اضافہ کیا، سیاست میں اسلامی اور اخلاقی روح پھونکی گئی اور سزائیں محض اس لئے دیجاتی تھیں کہ وہ اسلامی قوانین جن سے فلاح ہوتی تھی برقرار رہیں، اور جو شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا تھا، اسکو کلام پاک اور قاضیوں کے فیصلے کے مطابق سزا دیجاتی۔۔۔ فیروز شاہی عہد میں عدل و انصاف کی حکومت تھی اور کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں مکمل امن و سکون تھا اسکیلئے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ لوگوں کی زندگی میں خود بخود ترقی ہوتی گئی، اور اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرنے لگے، چیزوں کی فراوانی تھی اور وہ سستے داموں ملتی تھیں، اسلئے عام رعایا فارغ اور دولت مند ہوگئی، فیروز شاہ کا یہ کارنامہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قوانین کی بدولت تھا، جو اس نے اپنی ریاست اور بادشاہت کے لئے اختیار کئے تھے، (ہائی لائٹس ان میڈیول ہسٹری ص ۲۱۱) مگر اتنی تعریف کرنے کے بعد ایشور ٹوپا نے یہ بھی لکھا ہوا۔

کہ امن پسند فیروز شاہ عوام کا نگہبان اور بہی خواہ ضرور تھا، لیکن اپنے مذہبی تعلقات میں رجعت پسند تھا، اس میں سلطان محمد بن تغلق کی طرح مذہبی رواداری نہ تھی، وہ اسلام کے راسخ العقیدہ گروہ کو پسند کرتا تھا، اسلئے مذہبی خیالات و اعتقادات میں آزادی کا قائل نہ تھا (ایضاً ص ۲۱۲) ایشور ٹوپا نے سلطان کی رجعت پسندی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اسکے ذہن و تخیل پر علما بہت حاوی تھے، اسلئے اسکی بادشاہت بھی ان کے اثرات کی تابع رہی (ایضاً ص ۲۱۲) لیکن اچھے علماء کی اچھی صلاح سے رجعت پسند ہو جانے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں، اچھے علما کبھی غلط اور بیجا رائے نہیں دے سکتے تھے، سلطان کی رجعت پسندی کی دلیل میں یہ تفصیل بتائی گئی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے بدعتی گروہ کو

سخت سزائیں دیں، کیونکہ علماء کے نقطۂ نظر سے اس گروہ سے غیر اسلامی رسم [illegible] کی وجہ سے مسلمانوں کی بنیاد کمزور ہوتی جا رہی تھی، جس مسلمان کے خیالات میں کفر یا گمراہی نظر آتی، یا جو لوگوں کو الحاد و اباحت کی طرف مائل کرتا یا خدائی اور پیغمبری کا دعوی کرتا یا بد اخلاقی اور ضلالت کی طرف رجحان رکھتا، اسکو بھی غیر معمولی سزائیں دیجاتیں، چنانچہ گمراہ پیشوا یا تو جلاوطن کر دیئے گئے، یا علماء کے فیصلے کے مطابق سولی پر چڑھا دیئے گئے، اور تمام ملحدانہ تحریریں جلا کر ضائع کر دی گئیں، کوئی فعل ایسا نہ ہونے دیا جاتا جو اسلامی قوانین و روایات کے خلاف ہوتا، ایشوری ٹوپا کو یہ بھی اعتراف ہے کہ سلطان نے یہ ساری باتیں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی اصلاح کے خاطر کیں، مصلحانہ جذبہ میں کبھی کبھی جابرانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اگر نیت بخیر ہو تو اس کو رجعت پسندانہ رویہ نہیں کہا جا سکتا، جو ایک مسلمان فرمانروا کو مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو سنوارنے کا پورا حق حاصل ہے، اسلئے سلطان نے مسلمانوں کی اصلاح کے خاطر جو کچھ کیا، وہ اسکی مذہبی غیر رواداری پر محمول نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس نے جو سزائیں دیں، انکی نوعیت زیر بحث آسکتی ہے، مثلاً فتوحات فیروز شاہی میں ذکر ہے کہ ایک بزرگ احمد بہاری تھے، انکے مریدین انکو خدا سمجھتے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے، انکے ایک دوست شیخ عز کاکوی بھی تھے، ان پر بھی شطحیات کا الزام آیا، دونوں علماء کے فتوی پر قتل کر دیئے گئے، بہار شریف (ضلع پٹنہ) میں اس زمانہ کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحیی منیری بھی تھے، انکو ان دونوں کے قتل کی خبر ملی تو انکو بڑا دکھ ہوا، کیونکہ وہ ان دونوں کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا عامل سمجھتے تھے، ان کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کرتے تھے، اسی لئے ان دونوں کے قتل پر یہ فرمایا جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے، اگر وہ آباد رہے، ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ فیروز شاہ کے بعد دہلی جو تیمور کے ہاتھوں برباد ہوئی، وہ گویا ان ہی بزرگوں کا خون رنگ لایا تھا،

(باقی)

اردو ادب کے تنقیدی اصول
میں
تنظیم و انضباط

از

جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہجہاں پور

علوم میں اسکی اہمیت تخلیق و تکوین کے اعتبار سے انسان دنیا کی ابتدا اور اپنی پیدایش کے وقت سے انسان ہے، اور اس کو اسی وقت سے انسانی خصوصیات ملی ہیں، لیکن انسان کی انسانیت اور اس کی انسانی خصوصیات کامل اسی وقت ہوتی ہیں، جب اس تخلیق و تکوین کے ضابطوں پر وہ اپنے دماغ کے اختراع کردہ مصنوعی ضابطوں کی تہ بھی جسے تہذیب کہتے ہیں، چڑھا دیتا ہے۔

یہی حال انسانی علوم کا ہے، تمام علوم کی ابتدا اصل میں اسی وقت ہو جاتی ہے جب دماغ وجود میں آتا ہے، آج جتنے علوم ہیں، ان کی ابتدا انسانی دماغ کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوئی، مگر ان علوم کی تکمیل اسی وقت ہوئی جب ان کی اس قدرتی مقدار اور ضابطوں پر جو دماغ میں تکوینی حیثیت سے پہلے سے موجود تھے، انسان اپنے ان مصنوعی ضابطوں کا اضافہ کر سکا، جو اس کے دماغ نے اپنے بلوغ کے بعد اپنے گرد و پیش کے تجربات و مشاہدات کی مدد سے مرتب کئے،

نفسیات، منطق، معاشیات، فلسفہ، سائنس، غرض تمام طبیعی اور مابعد الطبیعی علوم کسی نہ کسی مقدار اور کسی نہ کسی ضابطہ کے ساتھ ہمارے نفس میں انسانیت کی ابتداء سے ودیعت ہوتے ہیں، لیکن وہ باقاعدہ علوم اس وقت ہوئے، جب ہم نے اپنی عقل کی مدد سے ان پر مزید غور و فکر کر کے اُن کو بے ترتیبی کے عالم سے نکالا اور ترتیب و تنظیم اور انضباط کے دائرے میں منظم (Systematize) کیا، اس حد پر آ کر ہر علم اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے، یہ درجہ کسی علم کے مکمل ہونے کا درجہ ہے، کوئی علم مکمل اس وقت ہوتا ہے جب وہ منظم ہو جائے، اس جگہ پہنچ کے بعد ہر علم کی حیثیت ایک سائنس کی ہے، یہ علم کو سائنس بنانے والا ترتیب و تنظیم اور انضباط کا عمل علم کی تعریفات و اصطلاحات، اور قواعد و ضوابط" وضع کرنے کے کاموں پر مشتمل ہے، میں نے اس عمل کے لئے یہاں "تنظیم و انضباط" کا نام اختیار کیا ہے،

علم و فن کیلئے ایک فائدہ | تعریفات و اصطلاحات، اور قواعد و ضوابط وضع کرنے سے جہاں علم و فن کی تکمیل ہوتی ہے، یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی مدد سے علم و فن کے تقاضوں پر عمل آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے،

ایک اور فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی مدد سے بہت سے ذکر مختصر، جامع اور یقینی ہو جاتے ہیں، اور بہت سی تفصیلات تھوڑے سے وقت، اور تھوڑے سے الفاظ میں، اور تعین کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہیں، اور یہ طریقۂ کار بالاتفاق سب کے لئے قابل قبول ہو جاتا ہے، ایک لمبی حقیقت کے لئے ایک لفظ یا چند الفاظ کافی ہو جاتے ہیں، کسی حقیقت کو بار بار بیان کرنے کیلئے کئی کئی جملوں کا اعادہ کرنا ضروری نہیں رہتا، بلکہ ایک یا چند لفظوں کے اعادہ سے کام چل جاتا ہے، مثلاً علم الکیمیا میں عناصر کی ترکیبی حیثیت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے فارمولے (ضابطے اور قاعدے) وضع کئے گئے ہیں، اور ان کے لئے عناصر کے مخصوص ناموں اور علامتوں پر اتفاق کر لیا گیا ہے، بعد کے بڑے بڑے مسائل ان فارمولوں کو بنیاد مان کر اور

اُن کے آگے قدم بڑھا کر حل کئے جاتے ہیں ، اگر یہ فارمولے نہ بنائے جائیں تو ایک طرف تو خود ان میں مضمر تفصیلات کو یاد رکھنا اور ان کو تقریر اور تحریر کی گرفت میں لانا ایک دشوار عمل ہو جائے ، اور دوسری طرف اُن کے آگے کے مسائل تک پہنچنا اور بھی زیادہ دشوار ہو جائے یہ صورتِ حال یقیناً علم الکیمیا کی ترقی میں حائل ہوگی ،

ادب میں تنظیم و انضباط کی اہمیت

ادب بھی علم ہے ، اس لئے وہ بھی اس اصولِ ارتقاء اور اصول تنظیم سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا ، ادب (نظم و نثر) بھی گو اپنی ابتدا کے اعتبار سے تکوینی علم ہے ، مگر اسکی اور اس کے ہر شعبہ کی تکمیل بھی اسی وقت ہو سکتی ہے ، جب ہم اس کے قاعدے اور ضابطے بنانے کے لئے بالارادہ مکلّف ہو کر بیٹھیں ، اور اپنی عقل کی مدد سے انھیں بنا کر اسکی تنظیم (Systematization) کریں ، لہٰذا اور علوم کی طرح ادب کو بھی اپنی تکمیل کے لئے تعریفات و اصطلاحات اور قاعدے اور ضابطے اختیار کرنے سے مفر نہیں ،

جس طرح علم و ادب کا کمال ان کی تنظیم و انضباط میں ہے اسی طرح ان کی بے نظمی ، اور بے ضابطگی و بے قاعدگی ان کے ابتدائی ، اور غیر ترقی یافتہ حالات میں ہونے کی علامت ہے لہٰذا علم و ادب میں ضابطے اور قاعدے وغیرہ انتہائی اہمیت رکھتے ہیں ، جہالت اور علمیت کے درمیان حدِ فاصل ہیں ،

نقادوں کا رجحان

اس ناقابلِ انکار حقیقت کے باوجود اردو کے بعض نقادوں کا یہ رجحان حیرت انگیز ہے ، کہ وہ تنقید میں تعریفات و اصطلاحات اور قاعدوں اور ضابطوں کی دریافت ان کی تعیین و ترتیب ، ان پر عمل درآمد اور ان کے ذکر سے گھبراتے ہیں ، وہ اُن کے علم و عمل کی پابندی سے آزاد رہنا چاہتے ہیں ، وہ حقائق کے مختصر اور مخصوص نام (اصطلاحات) استعمال کرنے کے بجائے اپنی اپنی پسند کے مطابق ان حقائق کی لمبی چوڑی تعبیریں اپنی اپنی زبان میں کرنا

پسند کرتے ہیں، وہ تعریفات واصطلاحات کے علم سے زیادہ تر بے خبر ہیں، اور بے خبر رہنے پر فخر کرتے ہیں، ان کا یہی طرزِ عمل [illegible] اعمال (قواعد وضوابط) کے ساتھ ہے، وہ ان سے بے خبر رہنے کو بھی اپنا کمال سمجھتے ہیں، اور مسلّمہ قواعد کی جگہ اپنے انفرادی اور خود خواستہ قاعدوں پر چلنا چاہتے ہیں، جہاں تعریفات واصطلاحات اور قواعد وضوابط کا خلا ہے، اُسے قائم رکھنا، اور ان مقامات کے لئے قواعد وغیرہ وضع کر کے اُس خلا کو پُر کرنے کے خلاف ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علم وادب کی مزید شیرازہ بندی نہ ہو سکے گی، اور جو کچھ ہو چکی ہے، وہ منتشر ہو جائے گی، اس طرزِ عمل سے ادب اس جگہ پہنچ جائے گا، جہاں اہلِ ادب ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے سے معذور ہوں گے، اور فاضلیت بابلیت (Babelism) میں تبدیل ہو جائے گی،

ادب کے لئے اُن کے فائدے

مثلاً اسم کی تعریف اور اس کا نام مقرر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ دنیا کی لاکھوں چیزوں میں سے ہر چیز کو غیر اسم کے مقابلہ میں پہچاننے اور پہچنوانے کے لئے تعریف کے چند مقررہ ومشترکہ الفاظ اور ایک نام "اسم" یکساں طور پر کافی ہے، اس تعریف اور نام کے ذیل میں آنے والی ہر چیز کا تعارف فقط تعریف کے چند مقررہ الفاظ یا اُس سے بھی زیادہ مختصر طور پر اُس ایک لفظ "اسم" سے کرایا جا سکتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس صورت میں اسم اور غیر اسم کا ایک دوسرے پر دھوکا نہیں ہو سکتا، ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اسم اور اس کی تعریف اپنی جامعیت، مانعیت اور اختصار کی وجہ سے اس قابل ہو گئے، کہ اہلِ ادب نے اُن کی اس حیثیت پر اتفاق کر لیا، کہ وہ چیزوں کی پہچان کی علامت اور ذریعہ ہیں، اس طرح اسم کی تعریف اور نام مقرر کرنے سے کم سے کم اتنے فائدے ہوئے، چیزوں کی پہچان کے ذکر میں الفاظ کا اختصار، جامعیت، مانعیت، اس پہچان کا یقین، اور اسم وتعریف پر چیزوں کی پہچان کی علامت وذریعہ

ہونے کی نسبت اہل ادب کا اتفاق ہو، اس کے برعکس اگر تعریف اور نام مقرر نہ کئے جائیں یا بعد میں ترک کر دیئے جائیں تو چیزوں کی باہم مختلف خصوصیات کے پیش نظر ہر وقت ہر چیز کے تعارف کے لئے مختلف الفاظ اور نام استعمال کرنا پڑیں گے جس سے الفاظ کا صرف زیادہ ہوگا، ان مختلف الفاظ اور ناموں سے ہر شخص مختلف مفہوم سمجھ سکتا ہے، جس سے چیزوں کی پہچان میں باہم التباس رہے گا، اور چیزوں کی کوئی متفق علیہ پہچان مقرر نہ ہو سکے گی، نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان و ادب میں کوئی ایسے معیاری سکے موجود نہ رہیں گے جن کے ذریعہ خیالات کا لین دین ہو سکے،

اسی طرح مثلاً اضافت تشبیہ کا عملی قاعدہ دریافت اور مقرر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے ذریعہ لکھنے والے مشبہ اور مشبہ بہ میں تشبیہ کا رشتہ ایک متفق علیہ طریقہ سے ظاہر کر سکتے ہیں، اس سے پڑھنے والا وہی رشتہ سمجھے گا، جو لکھنے والا سمجھانا چاہتا ہے، اگر یہ قاعدہ مقرر نہ کیا جائے، تو ایک لکھنے والے کا اچھی سے اچھی تشبیہ تلاش کر لینا بھی بیکار ہوگا، کیونکہ اگر اس کی تحریر خصوصاً شعر میں جس کی زمین تنگ ہوتی ہے، اظہار تشبیہ کے کسی اور طریقہ کی گنجایش نہیں ہے، صرف اسی طریقہ کی گنجایش ہے، اور اس طریقہ کو اسکی عدم تعین کی وجہ سے وہ استعمال نہیں کر سکتا، تو اس تشبیہ سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے گا، پھر تشبیہ کے ہر طریقۂ اظہار کا اثر جدا جدا ہے، جہاں پر اضافت تشبیہ کا طریقۂ اظہار ہی زیادہ اچھا اثر پیدا کر سکتا ہے، اس طریقہ کے عدم استعمال سے لکھنے والا وہ مخصوص اثر پیدا کرنے میں ناکام رہے گا، غرض اگر ہم تعریفات، اصطلاحات اور قواعد و ضوابط کی بے قدری کر کے ان سے آزاد ہونا چاہیں تو اتنے ہی نقصانات ہوں گے، جتنے ان کی پابندی سے فائدے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ علم و ادب کی ترقی

رُک جائے گی نیز ہم عالمیت سے جہالت کی طرف الٹا سفر کرنے لگیں گے،

علم کا تجزیہ اور اقسام
"اصل علم" اور "علم ضوابط"

علم اصل میں چار ذہنی علوم کا مجموعہ ہے،

۱۔ کسی چیز کی ذات و متعلقات (صفات، خصوصیات، تعلقات وغیرہ) کے بارے میں واقفیت (علم) حاصل کرنا،

یہ "اصل علم" (Substantive Knowledge) ہے،

۲۔ ایسے طریقوں کے بارے میں واقفیت (علم) حاصل کرنا جن کے ذریعہ "اصل علم" کو مختصر سی مختصر شکل میں لپیٹ کر دماغ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے،

۳۔ ایسے طریقوں کے بارے میں واقفیت (علم) حاصل کرنا جن کے ذریعہ ضرورت کے وقت "اصل علم" کی لپٹی ہوئی شکل کو کھول کر اس کے جزو یا کل کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جاسکے،

۴۔ اس لپیٹنے اور پھیلانے کے دور (cycle) پر قدرت حاصل کرنا،

آخری تین عمل جن طریقوں کی واقفیت سے انجام پاتے ہیں، وہ وہی طریقے ہیں، جو تعریفات و اصطلاحات اور قواعد و ضوابط کہلاتے ہیں، اور جو عمل تنظیم کے اجزاء ہیں، کسی علم کا وہ حصہ جو ان طریقوں کے علم پر مشتمل ہے، "علم ضوابط" (Procedural Knowledge) ہے،

ہر علم اور اسی طرح ادب بھی ان دونوں علوم یعنی "اصل علم" اور "علم ضوابط" پر مشتمل ہے، زبان باقی علوم کے لئے "علم ضوابط" کی حیثیت رکھتی ہے، اور خود اس کے لئے اس کے اپنے "قواعد و ضوابط" "علم ضوابط" کی حیثیت رکھتے ہیں، اس طرح زبان باقی علوم کے لحاظ سے "علم ضوابط" میں شامل ہے، اور خود اپنے لحاظ سے اس کا کچھ حصہ "اصل علم" میں اور کچھ "علم ضوابط" میں شامل ہے،

بیشک کسی علم سے اصل مقصود اس کا وہ حصہ ہوتا ہے، جسے میں نے "اصل علم" کہا ہے، لیکن یہ مقصود اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ "اصل علم" کو "علم ضوابط" کی شکل میں ڈھالا جائے، "اصل علم" اور "علم ضوابط" میں وہی رشتہ ہے، جو مظروف اور ظرف میں، جس طرح مظروف و ظرف باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ کسی مظروف کا قیام، استعمال، اور تعارف ظرف کے بغیر یا ظرف کے باہر ممکن نہیں، اور جب بھی مظروف کو رکھنا، پہنچانا یا برتنا مقصود ہوگا تو یہ کام کسی ظرف ہی کے ذریعہ ہوں گے، جس طرح روح کا قیام، استعمال، اور تعارف بدن سے علیحدہ ناممکن ہے، اور اپنے ان مظاہر کے لئے وہ بدن کی محتاج ہے، اسی طرح "اصل علم" اپنے قیام، استعمال، اور تعارف کے لئے "علم ضوابط" پر منحصر، اور اس کا محتاج ہے، اور چونکہ "اصل علم" کا قیام، استعمال، اور تعارف اس کے عملی و ظاہری وجود کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا "اصل علم" کا عملی و ظاہری وجود "علم ضوابط" کے وجود پر منحصر ہے، بیشک تکوین کے لحاظ سے "اصل علم" پہلے اور "علم ضوابط" بعد میں وجود میں آتا ہے لیکن عملی و ظاہری وجود کے لحاظ سے علم ضوابط پہلے سامنے آتا ہے، اور "اصل علم" بعد میں، مظروف کے ظرف پر، جان کے بدن پر، اور اصل علم کے علم ضوابط پر اس انحصار کے دو سبب ہیں، ایک تو وہی مظروف ظرف کا فطری رشتہ، اور دوسرا انسانی دماغ کی یہ فطری خاصیت کہ وہ حقائق کی گرفت بغیر ان کی ظاہری شکل کے اچھی طرح نہیں کر پاتا ہے،

فلسفۂ اسمیت | "علم ضوابط" کی اسی ظرفیت و اہمیت کی وجہ سے کہ "اصل علم" اپنے عملی و ظاہری وجود کے لئے اس کا محتاج ہے بعض مفکرین کا خیال فلسفۂ اسمیت (Nominalism) کی طرف گیا، "علم ضوابط" پر "اصل علم" کے عملی و ظاہری وجود کے اس انحصار کے پیش نظر جو اتنا ہی حقیقی ہے، جتنا اصل علم کا تخلیقی وجود، اسمیت ایک

قابل انکار حقیقت ہے، اس لحاظ سے دنیا کے تمام علوم و حقائق کی عملی و ظاہری شکل اور عملی و ظاہری انتہا اسمیت (Nominalism) ہے، ہر علم عملاً اور اپنے ظاہر کے اعتبار سے آخر میں جاکر اسم الاسمار بن جاتا ہے، اور ہر عالم اپنے کمال پر پہنچنے کے بعد عملاً فقط چند اسمار کا عالم رہ جاتا ہے، علم کی ابتدا، حقائق کی وسعت و کثرت اور اسمار حقائق کی قلت سے ہوتی ہے، اور اس کی انتہا اس پر ہوتی ہے، کہ وسیع و کثیر حقائق کی جگہ ایک فہرست اسمار لے لیتی ہے، جو علما، کی الگ الگ مقدار علم کے مطابق طویل یا قلیل ہوتی ہے،

اسمیت و حقیقت کے اس رشتہ کے پیش نظر کہ اسمیت حقیقت کے ظاہری وجود کا ظرف اور عملی ذریعہ ہے، اور جس طرح جان کے مظاہر بدن کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتے، حقیقت بھی بغیر اسمیت کے قوت سے فعل میں نہیں آتی، میں اسمیت کو حقیقت پسندی (Realism) لا مذہبیت اور مذہبیت کسی کے بھی خلاف نہیں سمجھتا، یہ اُن کے خلاف نہیں بلکہ ان کا عنوان ہے، اس میں اور اُن میں اجمال و تفصیل اور ظاہر و باطن کا تعلق ہے، تضاد کا نہیں، اسمیت کا حقیقت پسندی (Realism) اور لا مذہبیت کے خلاف نہ ہونا تو میری اس عقلی دلیل سے ظاہر ہے، جو میں نے رشتہ کے متعلق پیش کی ہے، مذہب کے خلاف نہ ہونے کی دلیل چونکہ مذہب کے باہر کی نہیں، بلکہ مذہب کے اندر کی ہونی چاہئیے، لہذا وہ یہ ہے کہ دنیا کے ایک عالمگیر مذہب "اسلام" نے یہ واضح اعلان کر کے کہ "علم آدم الاسما، کلھا" اسمیت کو حقیقت کا قائم مقام بنایا ہے، اور اس کے خلافِ حقیقت ہونے کی کھلی تردید کی ہے،

جو لوگ اسمیت (Nominalism) کو حقیقت پسندی (Realism) کے خلاف یا اس کے مدِ مقابل سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں، ان کی اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ

ہیئت اور حقیقت کے درمیان فرق و مغائرت اور جان و بدن کے رشتہ پر ان کی نظر نہیں جاتی ہے،

اردو ادب میں تنظیم و انضباط کی ضرورت

ان تفصیلات کے پیش نظر ہمارے نقادوں کو اردو ادب میں عمل تنظیم اور علم ضوابط کی اہمیت کا پوری طرح لحاظ کرنا چاہئے، ان کو چاہئے کہ وہ قواعد و ضوابط اور تعریفات اور اصطلاحات کے استعمال میں اپنی آزادہ روی کی خواہش اور اُن کی پابندی سے اپنی گھبراہٹ پر نظر ثانی کریں، ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، ان کا استعمال فیاضی سے اپنی تحریروں میں کریں، اور دوسروں کی تحریروں میں اُن کے استعمال سے اپنے ذوق کو مانوس کریں، اُن کے استعمال کو بیکار یا حقیر نہیں، بلکہ کارآمد اور قابل فخر سمجھیں، نیز جن حقائق و خصوصیات اور مقامات کے لئے ضرورت نظر آئے، جیسا کہ میں نے "تنقید کا تعارف اور اس کی بنیادی ضرورتیں" کے عنوان سے ظاہر کی ہے، مزید قواعد و ضوابط اور تعریفات و اصطلاحات وضع کریں، (باقی)

اسلام ایک خیالی خاکہ ہے یا عملی مثال

عبدالسلام قدوائی ندوی

"شبہات حول الاسلام" کے نام سے استاد محمد قطب نے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور چند برس میں اس کے چھ ایڈیشن نکل گئے، اس کے افادہ کو وسیع کرنے کے لیے حکومت کویت کی وزارت اوقاف و شؤن اسلامیہ نے اس کا انگریزی ترجمہ "ISLAM THE MISUNDESTOOD RELIGION" کے نام سے شائع کیا۔ جو بے حد پسند کیا گیا۔

دار المصنفین کے قدر دانوں کی خواہش ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جائے، ان کی اس فرمائش کی تعمیل شروع کر دی گئی ہے، ذیل کی سطور میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، انشاء اللہ جلد ہی پوری کتاب کا ترجمہ شائع ہو جائے گا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ اے مسلمانو! وہ اسلام کہاں ہے؟ جس کا تم ہم سے ذکر کرتے رہتے ہو، وہ اپنی صحیح صورت میں کب نافذ ہوا ہے؟ تم لوگ ہم سے ہمیشہ ایک ایسے مثالی نظام کا تذکرہ کیا کرتے ہو جو بہت ہی شاندار ہے، لیکن جس شکل میں تم لوگ بیان کرتے ہو، حقیقی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جب ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ اس نے عمل کا قالب کب اختیار کیا تو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مختصر دور کے سوا اس کا وجود ثابت نہیں کر پاتے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے پورے عہد کے بجائے صرف پہلے دو خلفاء کا نام لینا زیادہ

صحیح ہے۔ تم خصوصیت سے حضرت عمرؓ بن خطاب کا ذکر کرتے ہو اور ان کی ذات میں اسلام کی عملی تصویر دکھاتے ہو۔ تم اسے اس طرح پیش کرتے ہو کہ نگاہیں اس کی چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب اس سے ہٹ کر ہم اسلامی نظام کو تلاش کرتے ہیں تو ہمیں ظلم، استبداد، رجعت پسندی، پس روی، اور جاگیرداری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ قوم حکام کی تادیب کرتی تھی۔ بتاؤ تو صحیح یہ خلفاء راشدین کے عہد کے سوا اور کب ہوا ہے؟ سزا دینا تو بڑی بات ہے قوم کو تو یہ حق بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے حکمرانوں کا انتخاب کر سکے۔ تم یہ کہتے ہو کہ اسلام میں منصفانہ معاشی نظام موجود ہے۔ حالانکہ لوگوں کے درمیان فرق مدارج کبھی ختم نہیں ہوا۔ ایسی مساوات تو خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی نظر نہیں آتی۔ تم یہ کہتے ہو کہ ہر باشندہ کو روزگار دینا حکومت کا فرض تھا۔ پھر ان ہزاروں، لاکھوں بیکاروں کے متعلق کیا کہتے ہو؟ جو لوگوں کی داد و دہش پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور یہ بھی کبھی کبھار ہی ہوا ہے ورنہ ہمیشہ تنگدستی اور حرماں نصیبی ہی میں لوگ مبتلا رہے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ اسلام میں عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں بھلا یہ حقوق ان بیچاریوں کو کب حاصل ہوئے ہیں۔ اور کب انھیں ظالمانہ روایات اور اجتماعی و معاشی حالات نے ان حقوق کے استعمال کا موقع دیا ہے، تم اسلامی تربیت کی باتیں کرتے ہو۔ جو نفوس انسانی کو مہذب بناتی تھی، دلوں میں اللہ کا خوف پیدا ہوتا تھا اور اسکے اثر سے حاکموں اور محکوموں اور امت کے مختلف طبقوں کے درمیان خیر و فلاح کی راہ میں خوشگوار تعلقات پیدا ہو جاتے تھے۔ ذرا بتاؤ تو کہ یہ صورت حال تھوڑے سے زمانہ کے سوا جسکو تم بطور مثال پیش کرتے ہو کب پیش آئی۔ اللہ کے خوف نے حاجتمندوں کے حقوق ہضم کرنے سے کب روکا۔ ان پر ظلم کب بند ہوا۔ حاکموں نے دولت کے حصول میں کب اپنے کو مقدم نہیں رکھا۔ اور کب امت کو ذلیل اور اسکی آزادی کو پامال نہیں کیا گیا؟ سچ تو یہ ہے کہ تم ہمیشہ بھولوں کی داستان سناتے ہو جسکا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف چند شخصی مثالیں ہیں، جو تاریخ میں پھر نمودار نہیں ہوئیں،

یہ اشتراکیوں اور ان ہی جیسے دوسرے لوگوں کے اعتراضات ہیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ خود

ان مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ شبہ جڑ پکڑ چکا ہے جنھوں نے اسلامی تاریخ ان ہی مستشرقین سے پڑھی ہو۔

اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم دو باتوں کے درمیان پورے طور پر تفریق کریں، ایک تو نظام کی بذات خود مثالیت ہے اور دوسرے اس مثالی نظام کی تطبیق کا معاملہ ہے۔ پس کیا اسلام کے مثالی نظام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ عملی طور پر دنیا میں نافذ کیا جا سکے یا ناقابل عمل خیالی عناصر پر اس کی بنیاد ہے یا وہ عمل میں آسکنے والا نظام تو ہے، لیکن مدتوں سے اپنی مکمل صورت میں نافذ نہیں ہو سکا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بہت بڑا فرق ہے، اگر اسکی مثالیت محض خیالی ہے تو حالات اور ظروف خواہ کتنے ہی بدل جائیں اس کے نفاذ کی کبھی امید نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر وہ قابل عمل نظام ہے، لیکن حالات اس کے نفاذ میں حائل ہیں تو گو آج وہ نافذ نہیں ہے لیکن جب بھی یہ عوارض اس کی راہ سے ہٹ جائیں گے اس کے نفاذ کی پوری توقع کی جا سکتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے اسلام پر کون سی صورت منطبق ہوتی ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ معاملہ اتنا واضح ہے کہ اس بارے میں کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اگر انسانی تاریخ کے کسی دور میں ایک بار بھی یہ نظام نافذ ہو چکا ہے تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس نظام میں نفاذ کی صلاحیت ہے اور وہ محض دور از کار خیالی باتوں پر مشتمل نہیں ہے جو بات ایک مرتبہ واقع ہو چکی اس کا دوسری بار بھی واقع ہونا ممکن ہے، ورنہ ان ترقی پسند معترضین کو یہ کہنا پڑے گا کہ آغاز اسلام کے زمانہ میں لوگ اس درجہ بلندی تک پہونچ چکے تھے کہ انسانیت اس حد تک پہونچنے سے عاجز ہے، یہ ان کی اس رائے کے خلاف ہے کہ حالات انسانیت کو ہمیشہ آگے کی طرف بڑھاتے ہیں۔

یہ سوال کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی مختصر مدت کے علاوہ خلافت راشدہ کا دور تاریخ میں پھر کیوں نہیں آیا۔ اہم ہے، لیکن اس کا جواب تاریخ کے اوراق میں موجود ہے

ہم دو باتوں کیطرف توجہ کریں کہ اسلامی تاریخ کے کسی حصہ میں ہو یا عمومی انسانی زندگی میں فقہوی ہو ب ہے وہ اسلامی ارتقا نہیں تھا بلکہ اسلام کا وہ معجزہ تھا، جسے اس نے واقعی بلندی پہونچادیا تھا۔ یہ کوئی معمولی ارتقا نہیں تھا بلکہ اسلام کا وہ معجزہ تھا، جسے اس نے واقعی زمین میں کر دکھایا۔ ایسا معجزہ دکھانے کے لیے ایک طویل تیاری اور غیر معمولی شخصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اسلام ایسی تیزی سے پھیلا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے تاریخ میں ملتی ہے اور نہ بعد کو۔ یہ تیزرفتاری خود ایک اسلامی معجزہ ہے جس کی مادی اور اقتصادی تشریح و توجیہ ممکن نہیں ہے جو اشتراکی انسانی تاریخ کی کرتے ہیں۔ اس تیزرفتاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں اسلام کے دائرہ میں بہت سی قومیں داخل ہوگئیں، جن کے اندر اسلامی روح پورے طور پر سرایت نہیں کر پائی تھی۔ نہ انھوں نے اسلام کے سیاسی معاشی اور اجتماعی نظام کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ ان سب کی ویسی تربیت ممکن نہیں تھی جیسی کہ ابتدائی مسلمانوں کی ہو چکی تھی، ان قوموں کے اسلام میں داخل ہونے اور مسلمانوں کی آبادی میں شامل ہونے کی وجہ سے اسلام کا رقبہ وسیع ہوگیا لیکن اس کے اصول ان لوگوں کے دلوں میں پورے طور پر داخل نہیں ہو سکے، ایسی صورت میں ان اسلامی اصولوں سے انحراف بہت آسان تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اموی، عباسی، ترک اور مملوک وغیرہ ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں اسلامی اصولوں کو کھیل بنا دینا ممکن ہوگیا کیونکہ یہ فرمانروا اسلامی خصوصیات کے پورے طور پر حامل نہ تھے، دوسری بات اس سلسلہ میں یہ بھی قابل غور ہے کہ انسانی ارتقا کی راہ میں اسلام کا یہ تیزرفتار انقلاب طبعی بات نہیں تھی لوگ ایک رنگی غلامی کی حالت سے نکل کر ایسے اجتماعی عدل کی دنیا میں آگئے۔ جو ان تمام نظاموں سے برتر تھا۔ جن کا انسانیت تجربہ کر چکی ہے اسلامی تقدم ہمیشہ

ایسا اونچا قدم سمجھا جائے گا جس نے خواہشات میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو پستی کے غار سے نکال کر ایسی بلند چوٹیوں پر پہونچا دیا جس پر انسانیت ہر زمانہ میں فخر کرے گی نہایت اتنی خلاف توقع ایسی سربلندی اس وجہ سے ہو سکی کہ رسول اللہ صلعم کی ذات اور آپ کے اصحاب کی زندگی میں جو روحانی طاقت تھی وہ جادو کی طرح انسان کو بلندی پر پہونچا دیتی تھی، وہ کوئی معمولی طاقت نہ تھی۔ وہ انسان سے ایسے اعمال صادر کراتی تھی، جو معجزات کے مانند تھے۔ پھر جب یہ زبردست قوت باقی نہ رہی تو لوگ اس بلندی سے نیچے آگئے" اگرچہ حالات کے اس تغیر کے باوجود انھوں نے روح اسلام سے وہ تابناک روشنی اپنے پاس محفوظ کر لی تھی، جس کے عملی آثار انسانی تاریخ میں ظاہر ہوئے، ان کے بارے میں ہم آگے چلکر بیان کریں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مادی اور روحانی ترقی کے لیے ...... ہمیں ہمیشہ رسول اللہ صلعم اور صحابہ کی شخصیت کی ضرورت ہے تاکہ آغاز اسلام کے زمانہ میں لوگ جو مرتبہ حاصل کر سکے وہ ہم حاصل کر لیں۔ کیونکہ تیرہ چودہ سو برس پہلے جو معجزہ اقتصادی، سیاسی اور سوسائٹی کے باہمی روابط کے بارے میں ظہور پذیر ہوا تھا، وہ اس طویل زمانہ اور ان تجربوں کے بعد جو نسل انسانی نے کئے ہیں (جن میں سرفہرست خود اسلامی تجربہ ہے) اب ویسا محیر العقول نہیں رہا بلکہ زمین کے اکثر حصوں میں آج ممکن العمل نظر آتا ہے، یہ سچ ہے کہ اسلام کی اخلاقی بلندی سے ابھی لوگ بہت دور ہیں اس خامی کی وجہ سے نیت کا خلوص اور عمل کی پاکیزگی مفقود ہے اس کی بنا پر انسان خیر وفلاح اور سکون و اطمینان سے ہنوز محروم ہے، لیکن اگر آج اسلامی نظام کو ہم نافذ کر سکیں تو ایسا نہ معلوم ہوگا کہ نوابوں کی طرح کسی معجزہ کا ظہور ہو رہا ہے اور ہم خلاف توقع کوئی بڑی چھلانگ لگا رہے ہیں، کیونکہ تجربوں نے ہمیں اس بلند چوٹی سے قریب کر دیا ہے اب وہاں تک پہونچنا

آسان ہو گیا ہے اور پہلے کے مقابلہ میں اس کے لیے جدوجہد دشوار نہیں رہی، جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس کے ثبوت کے لیے چند مثالیں بیان کر رہے ہیں۔

آج قومیں انتخاب عام کے ذریعہ اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرتی ہیں اور جب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر نہیں چل رہے ہیں تو معزول کر دیتی ہیں، یہ وہی بات تو ہے جو اسلام کے دور اول میں حکومت کی عملی شکل تھی، یہ نظام جمہوری حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے زمانہ میں ایک معجزہ تھا۔ لیکن آج جب بھی ہم چاہیں ہماری دسترس میں ہے، اور جب ہمارے اندر بیداری پیدا ہو جائے جو ان قوموں کے اندر ہے تو یہ جمہوری نظام ہم اپنے ملکوں میں نافذ کر سکتے ہیں، اگر انگلستان اور امریکہ کی نقل میں ہم ایسا کر سکتے ہیں تو اسلام کے نام سے ایسا کرنے میں کیا مانع ہے۔ حالانکہ اسلام میں اس کا سارا مواد موجود ہے، اسی طرح سرکاری ملازمین اور عمال کے لیے ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کی تصریح رسول اللہ صلعم کے مقرر کردہ قوانین میں موجود ہے۔ آج بیسویں صدی میں اشتراکیت نے اسی پر عمل کیا ہے، تو اگر ہم چاہیں تو اس کا نفاذ ہم بھی کر سکتے ہیں، اور اشتراکیت کی دریوزہ گری کے بجائے ہم اسے اسلامی احکام سے اخذ کر سکتے ہیں، اشتراکیت تو اس ضمانت کیساتھ حکومتی ڈکٹیٹر شپ کو لازمی قرار دیتی ہے لیکن اسلام لوگوں کو آزاد رکھکر ایسا کرتا ہے، اسی طرح ہر مسئلہ کے بارے میں مثالیں دی جا سکتی ہیں، اگرچہ کامل شکل میں یہ نظام اب تک رائج نہیں ہو سکا ہے، مگر انسانی تجربوں نے ہمیں اس کے قریب پہونچا دیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ جب یورپ اسے عمل میں لانے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ حقیقی عملی نظام سمجھا جاتا ہے، اور جب اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے نفاذ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے دور از کار خیالی مثالی کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ پوچھے کو جی چاہتا ہے کہ کیا یہ سیاسی معاشی اور اجتماعی نظام ممکن ہیں یا غیر ممکن ہو اگر کسی جگہ یا کسی نظام میں ان پر عمل ممکن ہے تو پھر اسلام میں کیوں ناممکن ہو

کیونکہ وہ سب سے پہلا نظام تھا جو سطح ارض پر نافذ ہوا، اشتراکی اور ان کے ہم خیال اصحاب کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ جدید نظام علمی بنیادوں پر قائم ہے، اور اسلامی نظام جذبات اور خوش خیالی پر قائم ہے۔ کیونکہ اسلامی قوانین جذبات کی بنیاد پر نہیں وضع کیے گئے ہیں خلفاء راشدین جب ان کے نفاذ کے بارے میں مشورہ کرتے تھے، اور انکی قانونی تشریح کرتے تھے تو وہ عالم خواب میں نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ لوگوں کے حسن نیت پر اس کی بنیاد رکھتے تھے۔ بات صرف یہ ہے کہ اسلام محض قانون پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ قانون سازی کے ساتھ اس کے لیے فضا بھی تیار کرتا ہے، وہ لوگوں کو برائیوں سے پاک کرکے ان کی پاکیزہ تربیت کرتا ہے پھر ان کے دل میں خدا کا خوف اور پرہیزگاری کا جذبہ پیدا کرتا ہے تاکہ محض قانونی طور پر ہی نہیں بلکہ دل سے احکام الہی کی اطاعت کریں، اور جس وقت اس کا نفاذ کریں تو محض حاکم کے دبدبہ اور دہشت کی وجہ سے اس کی تعمیل نہ کریں بلکہ اندرونی جذبہ کے ساتھ اس پر عمل کریں یہی وہ بہترین سیاست ہے، جو عالم انسانی پر نافذ کی جاسکتی ہے لیکن صرف نیک ارادوں اور پاکیزہ جذبات پر اکتفا نہیں کی گئی۔ لوگوں کے ارادے اور خواہشیں چاہے جو کچھ بھی رہی ہوں قانون بہرحال موجود رہا اور ہمیشہ نافذ ہوتا رہا، اور حکومت کی قوت نافذہ اور قانون کی سطوت کی ضرورت ہر حال میں محسوس کی گئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اللہ قرآن کے ذریعہ وہ نہیں کرتا ہے۔ جو طاقت کے ذریعہ نافذ کر دیتا ہے۔

بعض اہل قلم محسوس کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو یہ کہکر بڑی مشکل میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے حضرت عمرؓ کو دلیل کے طور پر نہ پیش کرو کیونکہ حضرت عمرؓ تاریخ میں بار بار نہیں آتے لیکن یہ ایک فکری مغالطہ ہے، یقیناً حضرت عمرؓ اسلام کے ساختہ پرداختہ ہیں، اور اس تربیت کا نمونہ ہیں، جو اسلام نفوس انسانی کی اصلاح و درستی کے لیے کرتا ہے۔

لیکن با ایں ہمہ ہم حضرت عمرؓ کی ذات کو ان کے سامنے دلیل کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ ان قوانین سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے اسلامی شریعت سے اخذ کئے تھے مثلاً حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اجتماعی یا اقتصادی پریشانی کی وجہ سے کوئی شخص مجبور ہو کر چوری کا ارتکاب کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس قانون کا حضرت عمرؓ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ انھوں نے اسلام کے اس ثابت شدہ اصول کی روشنی میں یہ قانون بنایا ہے کہ حدود (سزا) کو شبہات سے دور کر دو یعنی اگر کسی جرم کے بارہ میں شبہ پیدا ہو جائے تو مجرم کو سزا نہیں دی جائے گی یہ بات آج بھی ہے، موجودہ زمانہ میں بھی شبہہ کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے، مذکورہ بالا صورت میں چوری درحقیقت چوری نہیں ہے بلکہ شدت احتیاج کی بنا پر اس سے یہ اضطراری حرکت ہو گئی ہے، لہذا اگر ان ہی حالات میں آج ہم یہ اصول نافذ کریں تو کوئی ہمارا ہاتھ نہیں پکڑے گا۔ اور یہ نہیں کہے گا کہ یہ بات جو حضرت عمرؓ کے ساتھ مخصوص تھی۔ جب وہ نہیں رہے تو یہ اصول بھی نہیں رہا، اسی طرح ضرورت کے موقع پر حضرت عمرؓ یہ امام کا اختیار سمجھتے تھے کہ سرمایہ داروں سے ان کا زائد مال لیکر اہل حاجت کے درمیان تقسیم کر دے، جیسا کہ آج کل انگلستان وغیرہ ممالک میں امیروں پر زائد ٹیکس لگا کر غریبوں کی مدد کی جاتی ہے، اسلامی حکومت ضرورت کے موقع پر اس قانون کو آج بھی نافذ کر سکتی ہے، یہ حضرت عمرؓ کا شخصی خیال نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہاں بھی اسلام کا ثابت شدہ قاعدہ موجود ہے۔ کیلا دولۃ بین الأغنیاء منکم (مال کی یہ عموی تقسیم اور گردش اس لیے ضروری ہے) کہ دولت تمھارے امیروں ہی کے درمیان گھومتی نہ رہے۔ (قرآن مجید پارہ ۲۸) ہمیں اس نفاذ کے لیے حضرت عمرؓ کی ذات کی ضرورت نہیں ہے دیکھو نہ انگلستان نے اسے نافذ کر دیا اس کے پاس

حضرت عمرؓ کہاں تھے یہی حال حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل کا ہے جو وہ حاکموں اور والیوں سے پوچھ گچھ کیا کرتے تھے کہ تمھارے پاس یہ مال اور سامان کہاں سے آگیا، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ ان حکام کا مال ہے یا قوم کا تو یہ قانونی مسئلہ ہر وقت نافذ ہو سکتا ہے، خواہ حضرت عمرؓ ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ یہ کہتے تھے، کہ جو لاوارث بچے پڑے ہوئے ملیں ان کی پرورش بیت المال سے کی جائے کیونکہ والدین کے جرم کے وہ ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس اصول سے آج بیسویں صدی میں یورپ و امریکہ واقف ہوئے ہیں اور اسے عملی شکل دی ہے، ہم اس پر عمل کریں تو ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ اس کا ثبوت اسلامی قانون کے اندر موجود ہے، یہی حال اس سارے استدلال کا ہے جو ہم حضرت عمرؓ کے عمل سے کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے ابتدائی دور میں، بڑے ممتاز قانون داں تھے قانونی نکات، پر ان کی گہری نظر تھی، اور وہ اسلامی روح کے رمز آشنا تھے، ان معترض اہلِ قلم کی باتیں ہمیں حضرت عمرؓ کی مثال کو بار بار پیش کرنے سے نہیں روک سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی وہ شخصی مثالیں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں جو لازمی قانون کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں لیکن انھوں نے بطور خود ان پر عمل کیا تاکہ ایک ایسی بلند مثال ہمیشہ موجود رہے جس تک پہونچنے کی مسلمان نسلاً بعد نسلٍ کوشش کرتے رہیں اگر اس درجہ کو پہونچ جائیں تو کیا کہنا اور نہ ان کے لیے ان کی وہ عملی قانون سازی کافی ہوگی جسے وہ نافذ کرتے تھے۔ اس طرح انھیں موجودہ حکومتوں کے دروازوں پر دستِ سوال نہیں دراز کرنا ہوگا۔ نہ قوانینِ عالم سے دریوزہ گری کی حاجت ہوگی۔

اس موقع پر ایک بڑا مغالطہ اور ہے سمجھا جاتا ہے کہ اسلام عہدِ خلفائے راشدین کے علاوہ اور کبھی نہیں پایا گیا۔ یہ شبہہ بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں بھی جاگزیں ہے، یہ صحیح ہے کہ خلفاء راشدینؓ اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے تھوڑے سے زمانہ کے علاوہ اسلام اپنی کامل

صورت میں کبھی نافذ نہیں ہوا لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اسلام اس کے بعد ختم ہوگیا، حکومتیں اگر کسی حد تک یا پورے طور پر خراب ہوئیں تو ان کے دائرہ اقتدار سے ہٹ کر مسلم سوسائٹی برابر حقیقی اسلامی سوسائٹی رہی، اس کے اندر اسلام کی پھرپور روح باقی رہی جو غلام و آقا کی تقسیم سے ناآشنا تھی، ان کے درمیان رشتۂ اخوت قائم رہا، اور علم اور اس کی جزا میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، اور عالم اسلامی کے ہر حصہ میں اسلام کا عمومی قانون نافذ رہا۔ جاگیرداری دور کی طرح خصوصی عدالتیں قائم نہیں کی گئیں۔ جیسا کہ تاریخ کے ان ہی زمانوں میں یورپ میں ہوتا رہا، دشمنان اسلام کے ساتھ جنگوں میں بھی اسلامی روایات باقی رہیں۔ جس کے گواہ خود صلیبی ہیں، خصوصاً سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں۔

مسلمانوں کی وفاداری اپنے معاہدوں کیساتھ اقوام عالم میں ضرب المثل ہے، مسلمانوں کو علم اور تہذیب سے جو محبت رہی ہے اس نے اندلس وغیرہ ممالک اسلامی کو مختلف علوم و فنون حاصل کرنے والوں کے لیے کعبۂ مقصود بنا دیا تھا۔ الغرض اسلام وہ مشعل نور تھا۔ جس سے یورپ علم و تنظیم کی راہ میں فائدہ اٹھاتا رہا۔ اور پوری کوشش کرتا رہا کہ اس معیار اعلیٰ تک پہونچ سکے، اگرچہ آگے چلکر اس کی دناوت طبع ابھری، اور اس نے اندلس میں اسلام کی مشعل کو بجھا دیا، اور اسلام کے فیض سے ترقی کے مدارج تک پہونچ جانے کے بعد اب یہ اسلام کو مٹانے اور سارے عالم میں اس کی صورت مسخ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

خوب سمجھ لو کہ اسلام ایسا مثالی نظام نہیں ہے، جو محض خیالی ہے بلکہ وہ خالص عملی نظام ہے، جس کو ایک بار انسانیت برت چکی ہے، اور آج اس کے نفاذ کی اس سے زیادہ قدرت و صلاحیت رکھتی ہے جتنی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اسے تھی، کیونکہ طویل تجربوں نے اس کے

[illegible] کی راہ ہموار کر دی ہے۔ خیالی مثالیت کے سلسلہ میں بہتر ہو گا کہ ہم اشتراکیت کی طرف خیال کریں، اشتراکی یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ابھی حقیقی اشتراکیت تک نہیں پہونچے ہیں بلکہ ہنوز اس کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ جب پیداوار درجۂ کمال کو پہونچ جائے گی، ایک عالمی حکومت کے ماتحت سارا عالم متحد ہو جائے گا، اور ناکافی پیداوار کی وجہ سے جو کشمکش آج برپا ہے، وہ ختم ہو جائے گی تو وہ اشتراکیت وجود میں آئے گی جو انسانی مساوات کی قائل ہو، اس مثالی اشتراکیت کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے، اس کی بنیاد محال خیالی عناصر پر قائم ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں، کہ ممکن ہے ایک دن انسان کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں حالانکہ انسانی طبیعت کا یہ حال ہے کہ اگر آج ان کے تمام مطالبات پورے ہو جائیں تو وہ کل ایک نئے مقصد کی طرف بڑھیں گے۔ پیداوار اگر یکساں طور پر سب کے لیے کافی ہو جائے تب بھی یہ مقابلہ کی گرم بازاری ختم نہیں ہو گی، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے یہ مفید بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر امتیاز و سربلندی کا جذبہ ختم ہو جائے تو ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف قدم کس طرح اٹھیں گے۔

پرانے چراغ

(مولفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

نئی زندگی کے مختلف شعبوں کے چند مشاہیر اور ارباب علم و دانش مثلاً مولانا تھانوی، ڈاکٹر فریدی، اور جگر مراد آبادی وغیرہ کے حالات، سوانح اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع جسکو پڑھ کر علم میں اضافہ، ذوق میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی کے لمحات انہی ارباب طریقت، انہی بخوردان [illegible] انہی بزرگوں اور علم و فن کو ساتھ گذر رہے ہیں [illegible] قیمت ۱۶ روپے

العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب

ایک قدیم عربی مخطوطہ

از

جناب جلال الدین صاحب شعبۂ عربی پٹنہ کالج پٹنہ

ابن الملقن کا پورا نام عمر بن علی بن احمد الانصاری الشافعی الاندلسی المصری سراج الدین ابو حفص، المعروف بابن الملقن و ابن النحوی، (سنہ ۷۲۳ھ – سنہ ۸۰۴ھ)

یہ اپنے زمانہ کے جید عالم تھے، حدیث و فقہ میں مہارت کے ساتھ دوسرے علوم میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، اساتذہ اور معاصرین کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی، ان کے درس میں چاروں مسلک کے ماننے والے بیک وقت شریک ہوتے اور ہر شخص ان کی رواداری اور وسعتِ نظر کا قائل تھا، درس و تدریس کے بعد ایک مدت تک مصر میں قضا کے عہدے پر فائز رہے، پھر اس سے سبکدوش ہو کر تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے، اور تقریباً تین سو کتابیں تصنیف کیں، اکثر کتابیں کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں، ان کی تصنیفات کا بڑا حصہ نذرِ ایام ہو گیا، اور اب صرف چند کتابیں مشرق و مغرب کے مختلف کتب خانوں کی زیب و زینت کا کام دے رہی ہیں، انہی کتابوں میں زیرِ بحث کتاب "العقد المذہب" (طبقات الشافعیہ) بھی ہے، یہ کتاب شافعی المسلک فقہاء کے حالات اور تذکرے سے متعلق ہے، سطورِ ذیل میں کسی قدر تفصیل سے ہم اس کا جائزہ لیں گے، تاکہ اس کی اہمیت سامنے آ جائے، اور اس کی تصحیح

تعلیق کے سلسلہ میں جو محنت کی گئی ہے، وہ بھی واضح ہو جائے،

مصادر و مآخذ | مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں مختلف علوم کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان میں سے بہت سی ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں، ان کتابوں میں امام الحرمین (م ۴۷۸ھ) کی "النہایۃ"، "الارشاد" اور "غیاث الامم" (الغیاثی) ذہبی (م ۷۴۸ھ) کی "سیر النبلاء"، "کتاب العبر فی من غبر" اور "میزان الاعتدال"، امام رافعی (م ۶۲۳ھ) کی "تذنیب الامالی" اور "الشرح الکبیر" امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی "تہذیب الاسماء واللغات"، "کتاب الروضہ" و "طبقات الشافعیہ" ابن الرفعہ (م ۷۱۰ھ) کی "کتاب الکفایۃ" ابن السمعانی (م ۵۶۲ھ) کی "الانساب" اور خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" کا "ذیل" ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) کی "شرح المہذب"، ابو اسحاق شیرازی (م ۴۷۶ھ) کی "المہذب"، "التنبیہ" اور "طبقات الفقہاء" عبد الغافر الفارسی (م ۵۲۹ھ) کی "کتاب السیاق"، اور سہمی (م ۴۲۷ھ) کی "تاریخ جرجان" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں،

مؤلف نے بہت سی جگہوں پر صرف مصنفین کے نام دیئے ہیں اور شہرت کی بنا پر ان کی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، جیسے تفلیسی (م ۶۷۲ھ) خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) دارقطنی (م ۳۸۵ھ) امام بخاری (م ۲۵۶ھ) حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) سلفی (م ۵۷۶ھ) الماوردی (م ۴۵۰ھ) المطوعی (م ۴۴۰ھ) العبادی (م ۴۵۸ھ) المتولی (م ۴۷۸ھ) المنذری (م ۶۵۶ھ) ابن ابی عصرون (م ۵۸۵ھ) ابن الصلاح (م ۶۴۳ھ) ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) ابن النجار (م ۶۴۳ھ)، ابن نقطۃ (م ۶۲۹ھ) ابن یونس (م ۳۴۷ھ) ابو شامۃ المقدسی (م ۶۶۵ھ) قاضی ابو طیب طبری (م ۴۵۰ھ) اور ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) وغیرہ،

ان کے علاوہ مختلف علماء اور فضلاء کے جو اقوال نقل کئے ہیں، اُن میں سے تھوڑے ہی ایسے ہیں جن کے متعلق اصلی مصادر کی طرف مراجعت کی جا سکتی ہے، کیونکہ ان کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں، مگر یہ اقوال تاریخ کی دوسری کتابوں میں جن کو ابن الملقن نے مصادر و مراجع کے طور پر استعمال کیا ہے، تھوڑی بہت کوشش کے بعد مل جاتے ہیں، اور اُن کی طرف مناسب مقامات پر حاشیے میں اشارے بھی کر دیئے ہیں، وہ عظیم شخصیتیں جن کے اقوال سے یہ کتاب آراستہ ہے، ان میں بانی متوفی ۲۹۵ھ، ابن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ، ابن سریج متوفی ۳۰۶ھ، ابو اسحاق المزکی متوفی ۳۶۲ھ، ابو بکر الصیرفی متوفی ۳۳۰ھ، ابو حازم عبدوی متوفی ۴۱۷ھ، استاذ ابو اسحاق اسفرائنی متوفی ۴۱۸ھ، ابو صالح مؤذن متوفی ۴۷۰ھ، ابو علی ثقفی متوفی ۳۲۸ھ، فرغانی، اور احمد اسواری وغیرہ کی ذات گرامی ہیں،

اس کتاب پر گہری نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ ابن الملقن نے اپنی کتاب کی تالیف میں اپنے استاذ شیخ جمال الدین الاسنوی متوفی ۷۷۲ھ کی کتاب طبقات الشافعیہ اور اپنے معاصر تاج الدین سبکی کی کتاب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سے بھی مدد لی ہے، لیکن ان دونوں کے ذکر سے بالکل اجتناب کیا ہے، حالانکہ بعض تذکروں کی بعض عبارتیں ٹھیک وہی ہیں، جو اسنوی یا سبکی کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ بعض فضلاء کے اقوال بھی انہی دو کتابوں سے ماخوذ ہیں، مثال کے طور پر ابو علی البیہقی (رقم ۲۵۷) کے حالات سے متعلق عبارتیں بعینہ وہی ہیں جو طبقات السبکی میں موجود ہیں، ابو الفتوح ابن ابی عقامہ (رقم ۱۹۱۵) کے حالات کے ضمن میں ابن سمرۃ الجعدی متوفی ۵۸۶ھ کی کتاب طبقات فقہاء الیمن سے سبکی نے بعض عبارتیں نقل کی ہیں، اور یہی عبارتیں ابن الملقن نے بھی اپنی کتاب میں طبقات ابن سمرہ کے حوالہ سے نقل کی ہیں، لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جب میں نے اصل کتاب یعنی طبقات

ابن سمرۃ کی طرف رجوع کیا تو اس کی عبارتیں دونوں کتابوں کی عبارتوں سے مختلف ہیں، مزید براں کچھ ایسے اقوال بھی ہیں جن کے اصل مصادر کی طرف میں نے رجوع کیا تو ان کے اندر وہ اقوال نہیں ملے، مگر طبقات الاسنوی یا طبقات السبکی میں موجود ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سبکی اور اسنوی کی کتابیں ابن الملقن کے پیش نظر تھیں، اور ان کے اعتماد پر انھوں نے اصل کتابوں کے حوالے دیئے ہیں،

کتاب کی تدوین | مؤلف نے تیسرے طبقہ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ ۷۶۲ھ میں ۱۳ ذو القعدہ چہارشنبہ کی شام کو اس کتاب کی تبییض سے فراغت حاصل ہوئی، اور اس کے مسودہ کی ابتداء ۱۲ شوال ۷۵۳ھ کو چہارشنبہ کے دن ہوئی تھی لیکن تبییض کے بعد بھی اضافہ کا سلسلہ جاری رہا، جس نے بڑھتے بڑھتے اس کتاب کے ذیل کی شکل اختیار کی، "تذکرۃ النوادر" کے مولف نے اس کا بھی تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے، اور کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے، کہ ابن ملقن اس کی تبییض سے ۷۷۰ھ میں فارغ ہوئے،[1] نہ معلوم ان کی اس تحریر کی بنیاد کوئی دوسری کتاب ہے یا مولف کی کوئی اور عبارت جو میری نظر سے اب تک پوشیدہ ہے، بہت ممکن ہے کہ ثانی الذکر کتاب میں طباعت کی غلطی ہو،

ترتیب | مؤلف نے کتاب کے خطبہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب تین طبقات میں منقسم ہے، پہلا طبقہ عظیم المرتبت فقہاء کے حالات پر مشتمل ہے، پھر یہ طبقہ ۳ طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اور ہر طبقہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے، اس حصہ میں ۶۶۲ افراد کے حالات مذکور ہیں آخری طبقہ ایسے فقہاء کے حالات پر مشتمل ہے جو کسی کنیت یا لقب وغیرہ سے زیادہ مشہور ہیں جن کی تو سے بعض کے حالات دو مرتبہ بلکہ تین مرتبہ آ گئے ہیں لیکن مولف نے اس تکرار کو شمار نہیں کیا ہے، اسی لئے انھوں نے ایک جگہ تحریر کیا ہے، کہ اس حصہ میں پانچ سو سے کچھ زائد

زائد فقہا کے حالات ذکر کیے ہیں بعض فقہا کا فصل الکنی اور فصل الانساب میں دوبارہ ذکر کرتے وقت محض اُن کے طبقہ کا حوالہ دیا ہے، اور بعض کے بارے میں کچھ نئی باتیں تحریر کی ہیں، دوسرا طبقہ دو طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر طبقہ حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب ہے، مؤلف کی تحریر کے موافق اس حصہ میں سات سو سے زائد فقہاء کے حالات ہیں، اور اس میں ایسے افراد کو شامل کیا گیا ہے جو مرتبہ کے اعتبار سے پہلے حصہ میں ذکر کردہ افراد سے کمتر ہیں،

تیسرا طبقہ ۷۰۰ھ سے کچھ زائد تک کے معاصرین کے حالات پر مشتمل ہے، ان میں سے بعض ابن الملقن کے شیوخ بھی ہیں، یہ طبقہ بھی حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے، مگر یہ حصہ پہلے دونوں حصوں کی طرح سے ذیلی طبقات میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے، اس میں تقریباً ایک سو افراد مذکور ہیں،

اس کتاب کے آخر میں کتاب الذیل ہے، اور یہ بھی حروف تہجی کے موافق مرتب ہے، مگر تبرکاً محمد نام کے اشخاص کا سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے،

خصوصیات

(۱) پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لئے اس میں ادبا، حکما، اطبا، محدثین، مفسرین، متکلمین، مورخین، اصحاب لغت اور اصحاب تصوف وغیرہ سب یکجا جمع ہو گئے ہیں،

(۲) مؤلف نے کوشش کی ہے کہ فقہاء کے حالات کے ساتھ اُن کے ایسے اقوال بھی ذکر کر دیئے جائیں، جن میں وہ منفرد ہیں، اس لئے اُن کے تفردات اور نادر اقوال کی اچھی خاصی تعداد اس کتاب میں جمع ہو گئی ہے،

(۳) مؤلف نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ اس کتاب میں شافعی المسلک فقہاء کے علاوہ دوسرے مسلک کے افراد کو شامل نہ کیا جائے، جب کہ شیخ ابو اسحاق شیرازی متوفی

[illegible]

[illegible] طبقات [illegible] میں سبکی [illegible]

کے علاوہ فقہاء اہل [illegible] کے حالات بھی مذکور ہیں [illegible] کی کتاب [illegible]

کے اختصار اور [illegible] الدین سبکی متوفی [illegible] کی طبقات سے بھی کم انتخاب کیا ہے [illegible]

تینوں کی کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور کارآمد ہو گئی ہے

نقائص | (۱) مؤلف نے پہلے اور دوسرے طبقات کو چند ذیلی طبقات میں تقسیم کیا ہے لیکن یہ تقسیم مراتب کے لحاظ سے ہے نہ کہ وفیات کے اعتبار سے، جیسا کہ سبکی نے کیا ہے، اور نہ حروف تہجی کے اعتبار سے، جیسا کہ بعض مؤلفین نے کیا ہے، اس لئے حالات کا تلاش کرنا قدرے مشکل ہو گیا ہے،

(۲) طبقۂ اولیٰ کے تمام طبقات حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہونے کے باوجود بعض مقامات پر یہ ترتیب برقرار نہیں رہ سکی ہے، مثال کے طور پر یعقوب سلار اردبیلی (رقم ۵۰۴) کا نام ابو نصر قشیری (رقم ۴۳۶) کے پہلے آ گیا ہے، حسین بن علی (رقم ۸۰) کا نام حسن بن محمد (رقم ۸۱) کے پہلے درج ہے، اور یوسف بن یحییٰ (رقم ۱۰۹) کا نام حمیدی (رقم ۱۲۹) کے پہلے مذکور ہے، اور اس نوع کی تقدیم و تاخیر "تفصیل عبادی" اور "فصل الانساب" میں بھی موجود ہے، مگر نسبتاً کم،

(۳) مؤلف نے انساب بیان کرتے وقت کہیں کہیں غیر ضروری اختصار سے کام لیا ہے، اور بعض فقہاء کے اجداد کا ذکر کیا ہے اور نہ ان کی کنیتوں اور القاب کا، مزید برآں بعض فقہاء کے نسب نامے میں اولاً ایک شخص کا نام لکھا جاتا ہے یا کوئی کنیت بیان کی گئی پھر وہ دوبارہ ان کا تذکرہ کرتے وقت اس میں ترمیم کر دی گئی ہے، غنجار بخاری کے والد کا نام رقم ۲۱۳ کے تحت "حسن" لکھا ہے اور رقم ۱۴۶ کے تحت "حسین" تحریر کیا ہے، ابو الفضل النسوی کے والد کا نام رقم ۲۱۳ کے تحت "احمد" مذکور ہے، اور ابو الحسین النسوی رقم ۱۷۴ کے ذیل میں "محمد" تحریر کیا ہے، ابو علی الفارقی رقم ۳۱۲ کے تذکرہ کے ضمن میں ابو الغنائم الفارقی کے والد کا نام ابو الفرج لکھا ہے، اور پھر رقم ۵۱۶ کے تحت ان کا تذکرہ مستقلاً کرتے وقت ابو الفتوح لکھا ہے، اسی طرح ابن السمعانی نے

بارے میں بھی بحث کی جاتی ہیں اختلاف پایا جاتا ہے کہیں کہتے ہیں:۔

قال ابن السمعانی فی الانسابہ اور کہیں کہتے ہیں:۔ قال السمعانی فی انسابہ۔

قلمی نسخے مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں اس کتاب کے چند نسخے محفوظ ہیں، جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک مخطوطہ حیدرآباد میں مولانا خلیل اللہ مدراسی کے ذاتی کتب خانہ میں ہے اس کی کتابت عبداللہ بن محمد النشائی نے کی ہے، سن کتابت ۸۵۶ھ ہے اور اوراق ۲۰۵ ہیں۔ ٹائٹل پیج خود مؤلف نے تحریر کیا ہے، جس کی پوری عبارت یہ ہے:۔

"العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب"

تالیف فقیر رحمۃ ربہ،

عمر بن ابی الحسن علی بن احمد الانصاری الشافعی عفا اللہ عنہ

اس نسخہ کے حواشی میں اکثر مقامات پر اضافے ہیں، اور یہ اضافے کاتب کے قلم سے ہیں نہ کہ مؤلف کے قلم سے جیسا کہ صاحب تذکرۃ النوادر نے تحریر کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان کو کتاب الذیل کے آخری صفحہ کی اس عبارت سے دھوکا ہوا ہو:۔

"ھذہ النسخۃ علی نسخہ	یہ نسخہ مصنف کے نسخہ کے مقابلہ میں اکثر
المصنف متفرقۃ کل موضع	مقامات پر ایک صفحہ یا اس سے کچھ
قدر صفحۃ و دونہا و ثلث	کم مقدار میں مختلف ہے، اور
من زیادات المصنف بعد	یہ مصنف کے اضافے ہیں، اس کی
فراغھا"	تالیف سے فراغت کے بعد"

لہذا یہ تحریر عبداللہ بن محمد النشائی کے علاوہ کسی اور صاحب کی ہے، بظاہر ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ بعض عبارتیں حاشیہ میں اس وقت اضافہ کی گئیں جب یہ نسخہ ... چک ہو گئی، اور بعض عبارتیں مصنف کے اضافہ کرنے کے بعد حاشیہ میں نقل کی گئیں، اس نسخہ کے حاشیہ پر القاسم بن ابی بکر الشاشی (رقم ۵۰۰) کے تذکرہ کے سامنے مؤلف کی یہ تحریر پائی جاتی ہے:۔

"بلغ قراءة علي ومقابلة بالأصل مؤلفه عفا الله عنه" — یہاں تک مجھ کو پڑھ کر سنایا گیا، اور میرے اصل سے مقابلہ کیا گیا

چند صفحات پہلے یا بعد میں ایک جگہ اور یہی تحریر موجود ہے، اس کے باوجود یہ نسخہ اغلاط سے کلیۃً محفوظ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ مؤلف نے مقابلہ کرتے وقت پوری توجہ نہ دی ہو، یہ نسخہ بہت ہی قدیم ہے، بلکہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ قدیم یہی نسخہ ہے بعض مقامات سے اس کے کلمات و حروف مٹ چکے ہیں، مجموعی طور پر یہ نسخہ اچھی حالت میں محفوظ ہے۔

(۲) دوسرا نسخہ بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ میں ۸۰۰ نمبر کے ذیل میں محفوظ ہے، اس کی کتابت بھی مؤلف کی زندگی میں سنہ ۸۳۰ھ میں کی گئی، اس کے کاتب احمد بن الفقیہ عمر بن احمد ہیں، اس کی حالت بہت اچھی ہے جیسا کہ اس کے عکس سے معلوم ہوتا ہے، اس نسخہ کے ٹائٹل پیج پر کتاب کا نام "طبقات الفقہاء الشافعیۃ" درج ہے،

(۳) تیسرا نسخہ لیڈن کی یونیورسٹی لائبریری میں ۳۲۰۵ نمبر کے تحت محفوظ ہے، اس مخطوطہ کے طبقۂ اولیٰ کے پورے حصہ کا اور تیسرے حصہ کے آخری چند صفحات اور پھر کتاب الذیل کے آخری صفحہ کا عکس میرے پاس موجود تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے طبقہ کے کچھ حصہ کی اور کتاب الذیل کے تمام حصہ کی کتابت سنہ ۸۵۵ھ میں محمد بن محمد بن بہادر ابو الفضل المومنی الطرابلسی القاہری نے کی ہے، اور کہیں کہیں مفید حاشیے بھی تحریر کئے ہیں

…نے مصر کے بیماری نے لکھا ہو ساتھ نقل کر دی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، تیسرے طبقہ کے ترقیمہ
… عبارت ملاحظہ کیجیے،

تمت طبقات الشافعية بحمد	اللہ کی مدد سے طبقات الشافعیہ پوری
الله وعونه، نقلت هذه التكملة	ہو گئی، میں نے اسے ایک معتبر نسخہ سے
من نسخة معتمدة منقولة	نقل کیا ہے، جو مصنف کے ہاتھ کے لکھے
من خط المصنف، نقلها احد	ہوئے ایک نسخہ سے منقول ہے، اسے
تلامیذہ صدر الدین	اُن کے ایک شاگرد صدر الدین محمد
محمد المصطفى شيخ رباط	مصطفی شیخ رباط آثار نبویہ نے لکھا، جس کی
الآثار النبوية، وتاريخ فراغها	تاریخ فراغ، ربیع الآخر ۷۹۲ھ
فی ربيع الآخر سنة اثنتين	ہے، اسی سال رمضان میں اسے
وتسعين وسبع مائة - وعليها	مصنف کے سامنے پڑھا گیا، میں نے
خط المصنف اقرء ت علیه بعضها	اس تکلمہ کی نقل سے ۸۵۵ھ میں
علیه فی رمضان من السنة	فراغت پائی، فقیر ابو الفضل محمد بن محمد
المذکورة وکان الفراغ	بن بہادر مومنی طرابلسی نے اس پر تعلیق
من هذه التكملة فی اول	لکھی،
سنة خمس وخمسين وثمان	
مائة بالقاهرة - علقها العبد	
الفقير الى رحمة ربه الغنی	
ابو الفضل محمد بن محمد بن بهادر	

الحموی البعلی الحنفی

اور کتاب الذیل کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے۔

وکان الفراغ من نسخ هذه التکملة سنة ۶۵۵ھ بالقاهرة علقها الفقیر ابو الفضل محمد.... الطرابلسی"	۶۵۵ھ میں قاہرہ میں تکملہ کی نقل سے فراغت ہوئی، ابو الفضل محمد بن محمد بن بہادر طرابلسی نے یہ تعلیق لکھی،

"اصل نسخ اور طبقہ اولیٰ کی تحریر مذکورہ بالا تحریروں سے بہت مختلف ہے، اسی لئے یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کاتب دوسرے ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ اس کی کتابت بھی مصنف کی زندگی ہی میں کی گئی ہو، اور آخر کا کچھ حصہ لکھنے سے رہ گیا ہو یا تلف ہو گیا ہو جس کی تکمیل طرابلسی نے کی ہو، یہ نسخہ سابق الذکر دونوں نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے،

(۴) چوتھا نسخہ کتبہ شیخ الاسلام، مدینہ منورہ میں محفوظ ہے، اس کی کتابت بھی ۷۶۹ھ میں طرابلسی ہی نے کی ہے، حیدرآباد والے نسخہ کے کتاب الذیل کے آخری صفحہ پر طرابلسی کی یہ تحریر موجود ہے:-

"الحمد لله نقل من هذه الطبقات نسخة واحدة العبد الفقیر الی رحمة ربه الغنی ابو الفضل محمد بن محمد بن بهادر المومنی الطرابلسی فی اواخر سنة تسع وستین وثمان مائة بالقاهرة"

اس تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کتبہ شیخ الاسلام کا نسخہ حیدرآباد ہی کے نسخہ سے منقول ہے۔

ل تذکرۃ النوادر: ۱۰۳

(۵) یہ نسخہ قاہرہ لائبریری میں ۹۶۹ نمبر تاریخ کے تحت محفوظ ہے، اور مدینہ میں وہیں کے نسخہ سے ۱۲۹۰ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے[1]

(۶) یہ نسخہ معہد المخطوطات قاہرہ میں ۳۹، نمبر کے تحت محفوظ ہے، اور یہ قاہرہ کے مذکورہ بالا نسخہ کا عکس ہے[2]

(۷) یہ نسخہ بھی معہد المخطوطات، قاہرہ ہی میں ۱۱۳۹ نمبر کے تحت محفوظ ہے، یہ حیدرآباد کے نسخہ کا عکس ہے[3]

(۸) یہ نسخہ خدابخش لائبریری، پٹنہ میں ۴۷۷ نمبر کے تحت محفوظ ہے، خدابخش خاں مرحوم کی تحریک پر سید محمد قاسمی نے ۱۳۱۲ھ میں حیدرآباد کے نسخہ سے اس کو نقل کیا تھا،

مذکورہ بالا نسخوں میں آخری پانچ نسخے کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ تمام نسخے بلا واسطہ یا ایک یا دو واسطوں سے حیدرآباد ہی کے نسخہ سے منقول ہیں یا اُس کا عکس ہیں،

(۹) یہ نسخہ بھی معہد المخطوطات قاہرہ ہی میں، ۲۳ نمبر کے تحت محفوظ ہے، اس کی کتابت ۱۲۹۴ھ میں قاہرہ کی پبلک لائبریری کے نسخہ سے کی گئی ہے، اور یہ نسخہ ۱۰۸ اوراق پر مشتمل ہے[4]، اس نسخہ کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں، اور نہ قاہرہ کی پبلک لائبریری کے نسخہ کے متعلق تفصیلات معلوم ہو سکیں، ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ حیدرآباد ہی والا نسخہ ہو۔ اس لئے کہ حیدرآباد کا نسخہ قاہرہ ہی کا نسخہ ہے، جس پر مصنف کی تحریر موجود ہے، نیز یہاں کتاب الذیل کے آخری صفحہ پر طرابلسی کی تحریر بھی اس پر شاہد ہے،

---

[1] فہرست دار الکتب المصریہ ج ۵ ص ۲۰۰ [2] یہ معلومات معہد کے انچارج کے خط کے ذریعہ مجھ کو حاصل ہوئیں، [3] ابن الصمد کا خط، [4] ایضاً،

(۳) برلن رائل لائبریری میں ۲۹۰۰۱ نمبر کے تحت محفوظ ہے، یہ نسخہ ناقص ہے، اس کا پہلا طبقہ تو بالکل نہیں ہے، دوسرے طبقہ کے طبقۂ ثالث میں، محمد بن محمد ... کے حالات سے اس کی ابتدا ہوتی ہے[1]۔

طریقۂ تصحیح: اس کتاب کے طبقۂ اولیٰ کے ۳۴ طبقات کو پہلے میں نے خدا بخش لائبریری کے نسخہ سے نقل کیا، پھر اس کا مقابلہ اس کے اصل یعنی حیدرآباد کے نسخہ سے کیا، جس سے معلوم ہوا کہ محمد الرفاعی نے چند دوسرے نسخوں میں اپنی طرف سے خوب اضافے کئے ہیں، اور پوری کتاب اغلاط سے پُر ہے، پھر بوڈلین اور لیڈن کے نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا، اور انہی تین نسخوں پر مجھ کو اکتفا کرنا پڑا، اس لئے کہ قاہرہ کا وہ نسخہ جو ۷۹۳ھ کا منقول ہے، پوری کوشش کے باوجود اس کا عکس حاصل نہ ہو سکا، اور برلن کے نسخہ سے یہ حصہ غائب ہے، ان کے علاوہ دوسرے پانچ نسخے حیدرآباد ہی کے نسخہ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ منقول ہیں یا مصور ہیں،

حیدرآباد کا نسخہ چونکہ قدیم ترین ہے اور اس کے حاشیہ پر دو جگہ مصنف کی تحریر موجود ہے کہ یہ نسخہ ان کو پڑھ کر سنایا گیا ہے، اور ان کے نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا گیا ہے، مزید براں اس کا صفحۂ عنوان بھی مؤلف ہی کے قلم سے مذکور ہے، اس لئے اس نسخہ کو میں نے اصل قرار دیا ہے، اور اس کے الفاظ کو متن میں لانے کی پوری کوشش کی ہے، اور باقی دو نسخوں کے اختلافات کو حواشی میں ذکر کر دیا ہے، اصل کی جو عبارتیں بالکل ہی غیر واضح تھیں، یا ان کے حروف مٹ چکے تھے، یا صراحۃً غلط تھیں، تو ایسی عبارتوں کو حواشی میں ذکر کر دیا ہے، اور متن میں قوسین کے درمیان بوڈلین یا لیڈن کے کسی ایک نسخہ یا دونوں نسخوں کی صحیح عبارتوں کو ذکر کر دیا ہے، اصل کے چند الفاظ اگرچہ بظاہر غلط نہ تھے، پھر بھی ان کو میں نے حواشی میں

---

[1] فہرست برلن لائبریری ۹/۲۴۴،

ذکر کیا ہے، اس لیے جن کلمات کو متن میں قوسین کے درمیان ثبت کیا ہے وہ دوسرے نسخوں کے علاوہ اکثر مصادر میں پائے جاتے ہیں، اور یہی کلمات زیادہ مناسب تھے، اور جب کسی چیز کو تینوں نسخوں میں غلط پایا، تو پھر بعض مقامات پر تو جوں کا توں نقل کر دیا ہے، اور حاشیہ میں اس کی غلطی کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور بعض مقامات پر کتاب کے مصادر سے متن میں قوسین کے درمیان صحیح لفظ تحریر کر دیا ہے اور اس کے مراجع کی طرف حاشیہ میں تینوں نسخوں کے لفظ کو نقل کرتے وقت اشارہ کر دیا ہے،

تعلیقات اصحاب تراجم اور تعلیقات کی طرف مراجعت کو آسان بنانے کی غرض سے تمام اصحاب تراجم کو ترتیب وار نمبروں کے تحت ذکر کیا ہے، پھر ہر تذکرہ کے اندر واقع اشخاص وامکن وغیرہ کے متعلق نوٹ دیتے وقت ان کے لئے الگ نمبروں کا تعین کیا ہے، اور تعلیقات میں حسب ذیل امور کی رعایت کی گئی ہے،

(۱) ہر تذکرہ کے ذیل میں صاحب تذکرہ سے متعلق اکثر و بیشتر مصادر کا ذکر کر دیا گیا ہے، تاکہ کسی مخصوص فرد پر کام کرنے والے اصحاب کو یکجا طور پر اس سے متعلق حوالے مل جائیں، اور جہاں جہاں فقہا کے القاب اور کنیتوں کا تذکرہ مؤلف نے نہیں کیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اُن کی طرف پوری توجہ دی جائے، اسی طرح اُن کی بعض اہم تصنیفات اور تاریخ پیدائش وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، جن کی طرف اصل کتاب میں کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، وفات سے متعلق مختلف اقوال کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے علاوہ دوسری قابل ذکر باتوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے،

(۲) مؤلف نے جن مصادر کے حوالے دیئے ہیں، اُن سے تصدیق کرنے کی حتی الوسع

ھ فہرست پٹنہ لائبریری ۹/۲۴۴،

کوشش کی گئی ہے، اگر کہیں پر اختلاف پایا گیا ہے تو اس کی طرف حواشی میں اشارہ کر دیا گیا، چونکہ حوالجات کی اکثر و بیشتر کتابیں اب تک غیر مطبوعہ ہیں، اس لئے جن امور کے متعلق حوالے دیئے گئے ہیں، اگر وہ حوالے کی دوسری کتابوں میں بعینہٖ یا صرف الفاظ میں مختصر ترمیم کے ساتھ موجود ہیں تو ان کے حوالے بھی دیدیئے گئے ہیں، اور اگر لفظی اختلاف کے ساتھ معنوی اختلاف بھی پائے جاتے ہیں، تو ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے،

(۳) اعلام و اماکن پر نوٹ دینے کی پوری کوشش کی گئی ہے، بعض مقامات پر مؤلف نے بعض فقہاء کا تذکرہ صرف کنیت یا انساب سے کیا ہے، جیسے فرغانی نے کہا، ابوبکر نے کہا اور ایک ہی عصر میں ایک ہی کنیت یا ایک ہی نسبی نام سے بہت سے افراد مشہور ہیں، تو اس صورت میں اکثر کی طرف کتاب کے مصادر کی مدد سے رہنمائی مل گئی ہے، اور ان کے مختصر حالات قلمبند کر دیئے گئے ہیں،

(۴) احادیث، آیاتِ قرآنی اور اشعار کی تخریج کی طرف پوری توجہ دی گئی ہے،

تعلیقات کے علاوہ کتاب کی ابتداء میں ایک مبسوط مقدمہ بھی موجود ہے جس میں "طبقات الشافعیہ اور ان کے مؤلفین" پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، نیز اس کتاب کے مؤلف کے حالات، تالیفات اور تلامذہ و اساتذہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے،

جب ایمان کی بہار آئی

رائے بریلی کی روحانی تربیت گاہ سے کربالا کوٹ کی جنگ گاہ تک جہاد و قربانی کی ایک روح پرور اور ایمان افروز داستان، سید احمد شہید کی مختصر سیرت اور شہادت گاہ بالاکوٹ کے اثر انگیز واقعات، مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی قیمت: ۱۲ روپیہ،

مکتبۂ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ نمبر ۳ "منیجر"

مکتوبات مدینہ منورہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدفیوضہم

باسمہ سبحانہ

مکرم و محترم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدفیوضکم ، بعد سلام مسنون ،

جناب کا گرامی نامہ بھی مولانا عبدالسلام صاحب کے خط کے ساتھ پہنچا، اس سے بہت مسرت ہوئی، آپ کو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں چالیس ۴۰ سال رفاقت کا فخر حاصل رہا، اللہ تعالیٰ بہت مبارک کرے، جناب نے اس ناکارہ کے متعلق جو الفاظ لکھے وہ آپ کی محبت کا ثمرہ ہے جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں سے پیدا ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کی اس محبت کو طرفین کے لئے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے، یہ ناکارہ آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہے، اللہ جل شانہٗ اپنی رضا و محبت عطا فرمائے، مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، نامرضیات سے حفاظت فرمائے، آپ نے تحریر فرمایا کہ شاہ صاحب کا حادثہ ایسا اچانک ہوا، یہ تو واقعی دفعۃً سنکر طبیعت پر بہت ہی چوٹ لگی، مرحوم نے تو کہا تھا کہ تیری واپسی پر آکر طویل قیام کرونگا اس مرتبہ ہیں بہت جی لگا، میں نے کہا کہ اس ہجوم میں آپ کا کیا جی لگے گا یہاں تو ہر وقت بڑا مجمع رہتا ہے تو مرحوم نے فرمایا تھا کہ میرا ہرج نہیں ہوتا، آپ نے لکھا کہ مرحوم کے فراق کے بعد سارے حوصلے پست ہو گئے، یہ تو فطری چیز ہے اور جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے، اس کے فراق کے بعد اتنی ہی افسردگی طاری ہوا کرتی ہے، مگر ہم لوگوں

تعلیقات کے علاوہ

طبقات الشافعیہ اور اُن کے

حالات تالیفات اور تلامذ

ذات بریلی کی روحانی

ایک مدوح پرور اور اجال

کے اثر انگیز واقعات، مؤلفہ

گمشدہ فرد

مکتوبات مدینہ منورہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدفیوضہم

باسمہ سبحانہ

[illegible] صلاح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدفیوضکم، بعد سلام مسنون،

[illegible] مولانا عبدالسلام صاحب کے خط کے ساتھ پہنچا، اس سے بہت مسرت

[illegible] صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں چالیس ۴۰ سال رفاقت کا فخر حاصل رہا،

[illegible] آنجناب نے اس ناکارہ کے متعلق جو الفاظ لکھے وہ آپ کی محبت

[illegible] رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ دل سے پیدا ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کی

[illegible] نجات کا ذریعہ بنائے، یہ ناکارہ آپ کے لئے دل سے دعا

[illegible] عطا فرمائے، مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق

[illegible] فرمائے، آپ نے تحریر فرمایا کہ شاہ صاحب کا حادثہ

[illegible] طبیعت پر بہت ہی چوٹ لگی، مرحوم نے تو کہا تھا کہ

[illegible] قیام کروں گا اس تحریر پر بہت جی لگا، میں نے کہا کہ اس ہجوم میں آپ کا

[illegible] وقت بڑا مجمع رہتا ہے تو مرحوم نے فرمایا تھا کہ میرا ہرج نہیں ہوتا، آپ نے

[illegible] فراق کے بعد سارے حوصلے پست ہوگئے، یہ تو فطری چیز ہے، اور جس سے جتنا

اس کے فراق کے بعد اتنی ہی افسردگی طاری ہوا کرتی ہے مگر ہم لوگوں

کوشش کی گئی ہے، اگر کہیں پر اختلاف پایا گیا ہے تو اُس کی طرف حواشی میں اشارہ کر دیا گیا ہے،
چونکہ حوالجات کی اکثر و بیشتر کتابیں اب تک غیر مطبوعہ ہیں، اس لئے جن امور کے متعلق حوالے
دیئے گئے ہیں، اگر وہ حوالے کی دوسری کتابوں میں بعینہٖ یا صرف الفاظ میں مختصر ترمیم کے
ساتھ موجود ہیں تو اُن کے حوالے بھی دیدیئے گئے ہیں، اور اگر لفظی اختلاف کے ساتھ معنوی
اختلاف بھی پائے جاتے ہیں، تو اُن کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے،

(۳) اعلام و اماکن پر نوٹ دینے کی پوری کوشش کی گئی ہے، بعض مقامات پر مؤلف
نے بعض فقہاء کا تذکرہ صرف کنیت یا انساب سے کیا ہے، جیسے فرغانی نے کہا، ابو بکر نے کہا
اور ایک ہی عصر میں ایک ہی کنیت یا ایک ہی نسبی نام سے بہت سے افراد مشہور ہیں، تو اس
صورت میں اکثر کی طرف کتاب کے مصادر کی مدد سے رہنمائی مل گئی ہے، اور اُن کے مختصر حالات
قلمبند کر دیئے گئے ہیں،

(۴) احادیث، آیاتِ قرآنی اور اشعار کی تخریج کی طرف پوری توجہ دی گئی ہے،

تعلیقات کے علاوہ کتاب کی ابتداء میں ایک مبسوط مقدمہ بھی موجود ہے جس میں
طبقات الشافعیہ اور اُن کے مؤلفین پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، نیز اس کتاب کے مؤلف کے
حالات، تالیفات اور تلامذہ و اساتذہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے،

مکتوبات مدینہ منورہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدفیوضہم

باسمہ سبحانہ

مکرم و محترم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدفیوضکم، بعد سلام مسنون،

جناب کا گرامی نامہ بھی مولانا عبدالسلام صاحب کے خط کے ساتھ پہنچا، اس سے بہت مسرت ہوئی، آپ کو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں چالیس سال رفاقت کا فخر حاصل رہا، اللہ تعالیٰ بہت مبارک کرے، جناب نے اس ناکارہ کے متعلق جو الفاظ لکھے وہ آپ کی محبت کا ثمرہ ہے جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ دل سے پیدا ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کی اس محبت کو طرفین کے لئے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے، یہ ناکارہ آپ کے لئے دل سے دعا کرتا ہے، اللہ جل شانہ اپنی رضا و محبت عطا فرمائے، مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے نامرضیات سے حفاظت فرمائے، آپ نے تحریر فرمایا کہ شاہ صاحب کا حادثہ ایسا اچانک ہوا، یہ تو واقعی دفعۃً سنکر طبیعت پر بہت ہی چوٹ لگی، مرحوم نے تو کہا تھا کہ تری واپسی پر آکر طویل قیام کرونگا اس مرتبہ بہت جی لگا، میں نے کہا کہ اس ہجوم میں آپ کا کیا جی لگتا یہاں تو ہروقت بڑا مجمع رہتا ہے تو مرحوم نے فرمایا تھا کہ میرا حرج نہیں ہوتا، آپ نے لکھا کہ مرحوم کے فراق کے بعد سارے حوصلے پست ہو گئے، یہ تو فطری چیز ہے اور جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے، اس کے فراق کے بعد اتنی ہی افسردگی طاری ہوا کرتی ہے مگر ہم لوگوں

کی غفلتیں ایسی ہیں کہ یہ حالت فوراً زائل ہو جاتی ہے، اللہ جل شانہ آپ کی ہر نوع کی مدد فرمائے اصحت وقوت عطا فرمائے، اور آپ کی مساعی جمیلہ سے دار المصنفین بجائے انحطاط کے مزید ترقیات پر گامزن ہو، جناب نے تحریر فرمایا کہ عمر کی آخری معمول پر ہوں کچھ آخرت کی تیاری بھی کرسکوں، یہ بہت مبارک اور اہم ارادہ ہے، بمقتضائے عمر اللہ مشاغل بندہ کے خیال میں دو چیزوں کا تھوڑا سا اہتمام فرما دیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مفید ہوگا، ایک تو صبح کی نماز کے بعد یا رات کو سوتے وقت دس پندرہ منٹ کے لئے موت کی یاد کہ اکثروا ذکر ھاذم اللذات مامور بہ بھی ہے، اور اس میں یہ مراقبہ کہ اس طویل عمر میں اللہ نے جو احسانات کیے اس کے مقابلہ میں کیا لیجا رہا ہوں کیا کھویا؟ اور دس پندرہ منٹ کسی وقت اہل اللہ کی سوانح، ملفوظات کا مطالعہ، میرے خیال میں اگر اس کی ابتدا عزیزی مولوی یوسف مرحوم کی سوانح سے ہو تو زیادہ اچھا ہے، اگرچہ مرحوم آپ جیسے اکابر کے مقابلہ میں بچہ ہی تھا مگر مالک کی عطا کو کون روک سکتا ہے، اور کون سوچ سکتا ہے، آخر کے دو تین سالوں میں اس کی پرواز بہت ہی اونچی ہو گئی تھی، اس کے بعد پھر دیگر اہل اللہ کے تذکرے جو ان کی صحبت کے قائم مقام ہوتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا، یہ ناکارہ بھی آپ کے لئے بہت اہتمام سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ کا مظہر بنائے، دار المصنفین کی مالی ترقیات کے لئے بھی یہ ناکارہ دعا کرتا ہے، اللہ جل شانہ ہر نوع کی ترقیات سے نوازے آپ کی اور مولانا عبد السلام صاحب کی طرف سے روضہ اقدس پر بھی صلوٰۃ وسلام پیش کر دیا، اپنی دعاؤں میں امت کے لئے دعاؤں کا بہت اہتمام شروع کر دیں کہ احباب کے بہت سے خطوط حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد منانی کے پہنچتے رہتے ہیں، کہ امت کے لئے اہتمام سے دعا کرو، فقط والسلام"

مکرر آنکہ

میرے خیال میں اجتماعات کے علاوہ اگر یکسوئی کے ساتھ علی میاں ایک دو شب کے لئے آپ کے ادارہ میں آ ٹھہر جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا، اجتماعات کی آمد میرے مقصد کے لئے کافی نہیں،

(۲)

باسمہ سبحانہ

عنایت فرمائم جناب الحاج مولانا عبد السلام صاحب سلمہ، بعد سلام مسنون، آپ کا اور جناب صباح الدین صاحب کا مشترکہ لفافہ پہنچا، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ انتقال سے تو جتنا قلق ہو برمحل ہے، اس ناکارہ پر تو جب سے مرحوم کا تعلق ہوا تھا شفقتیں بڑھتی ہی رہیں، اور مرحوم کی شدت تعلق کی باتیں اب یاد آکر اور بھی متاثر کر رہی ہیں، دعائے مغفرت اور ایصال ثواب میں تو حادثہ کی خبر سننے کے بعد سے دریغ نہیں کیا، جناب کا شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اعظم گڈھ آنا تو پہلے کان میں پڑا تھا، لیکن آپ نے تحریر فرمایا کہ شاہ صاحبؒ میں جو وجاہت اور خوبیاں تھیں ان کا عشر عشیر بھی اپنے میں نہیں پاتا، یہ ناکارہ تو ستر سال سے یہی منظر دیکھ رہا ہے، کہ جو بھی جاتا ہے اپنی جگہ خالی چھوڑ کر جاتا ہے مگر کبریٰ موت الکبراء بعد والوں کو جگہ تو پر کرنی ہی پڑتی ہے، جن احباب نے آپ کا انتخاب اس جگہ پر کیا، بہت ہی مناسب کیا، اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل و کرم سے آپ کی ہر نوع کی مدد فرمائے، ادارہ کو ہر نوع کے مکارہ سے محفوظ فرماکر ترقیات سے نوازے، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دین و دنیا کی ترقیات سے نوازے، شاہ صاحبؒ کی شان، ہر دلعزیزی اور خدا ترسی نصیب فرمائے، مرحوم نے تو تھوڑے ہی عرصہ

بہت ہی ترقیات فرمائیں، اس ناکارہ کے سفر حجاز سے تین چار دن پہلے ہی تشریف لائے تھے، اور آتے ہی یہ فرمایا کہ میں ایسی جگہ رہنا چاہتا ہوں جہاں بہت ہی یکسوئی بھی ہو اور تیرا قرب بھی ہو، میں نے کہا کہ دار الطلبہ جدید میں مستقل حجرہ مل سکتا ہے بہت پسند کیا، مگر تھوڑی دیر بعد آکر کہا کہ مدرسہ کے نائب مہتمم نے اپنے حجرہ کی جو تقریباً خالی ہی رہتا ہے وہ مدرسۂ قدیم میں میرے گھر کے قریب ہی ہے، پیشکش کی، میں نے کہا کہ بہت مناسب ہے، اسی میں قیام رہا، صبح کی نماز کے بعد مجلس ذکر میں بہت اہتمام سے شرکت کرتے اور باوجود مہمانوں کے ہجوم اور کثرت کے اکثر اوقات میرے ہی پاس گذارتے، اللہ تعالیٰ بہت ہی درجات بلند فرمائے، مولوی تقی صاحب اگر ابھی تک موجود ہوں تو بعد سلام مسنون فرما دیں کہ آپ کا بہت مفصل خط آیا تھا، اس کا مرونہ جواب آپ کے مکان کے پتہ سے لکھ دیا پہلے سے آپ کا اعظم گڈھ ہونا معلوم ہوتا تو اسی لفافہ میں اس کا بھی جواب بھیجدیتا، خدا کرے کہ مل جائے، ان کی پریشانی سے بہت ہی کلفت ہے، اللہ تعالیٰ ہی ان کی مدد فرمائے، ہر نوع کی پریشانیوں کو دور فرماکر دارین کی ترقیات سے نوازے، یہ ناکارہ بجز دعا کے اور کیا کرے، فقط والسلام

۱۰ اپریل ۷۵ء

مکاتیب شبلی اوّل و دوم

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ یہ درحقیقت مسلمانوں کی ۳۰ سالہ اجتماعی جد وجہد کی مسلسل تاریخ ہے، اوّل ۔/۵، دوم ۔/۴

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

گذشتہ عرب اسرائیل جنگ اور نہر سویز

از محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے (علیگ)

"گذشتہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد کویت کے ایک ممتاز صحافی منیر نصیف نے مصر کا سفر کیا تھا، وہاں انھوں نے نہر سویز کے دونوں کناروں پر متعین ممتاز انجینئروں اور محکمۂ نہر کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقات کی اور ان سے نہر سویز کی صفائی اور جہاز رانی کے لئے اس کے دوبارہ کھولے جانے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا تھا، صحافی مذکور نے وطن واپس آکر اپنی ان ملاقاتوں کی روداد کویت کے ایک ممتاز سرکاری ماہنامہ "العربی" کے فروری ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع کی ہے، جس سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس لئے "معارف" میں اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔" "نعیم"

ان عرب شہداء کی عظیم قربانیوں کی بدولت آج نہر سویز کے دونوں کناروں پر دوبارہ فتح و کامرانی کا پرچم لہرا رہا ہے، جنھوں نے آزادی وطن کی خاطر بڑی سرفروشی سے حق و باطل کے اس عظیم معرکہ میں جام شہادت نوش کیا، بلاشبہہ مصر نے اس معرکہ میں اپنے بہترین فرزندوں اور منتخب نوجوانوں کی قربانی دی ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ باحمیت مجاہد نہ ہوتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا، اور اس خطہ میں اب تک زندگی معمول پر نہ آسکتی جسے دشمنوں نے

پورے طور پر تباہ و برباد کر دیا تھا، سب سے پہلے ۱۹۵۶ء میں نہر سویز اسرائیلی جارحیت کا نشکار ہوئی، پھر دشمنوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد اس کی تباہ کاریوں کو درست کر کے نہر کو جہاز رانی کے لئے دوبارہ کھولا گیا، لیکن ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے دوبارہ سرکشی کی جس کے نتیجہ میں عین ایسے وقت نہر سویز بند ہو گئی، جب اس کے عرض و عمق میں مزید اضافہ کرنے کے لئے ایک وسیع تر منصوبہ شروع کیا جانے والا تھا، ۱۹۶۷ء کی جارحیت کے بعد جب دشمن وہاں سے نکل گیا تو دوبارہ اس کی تعمیر و ترقی کی طرف توجہ کی گئی، لیکن ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی جارحیت میں بڑا فرق ہے، پہلی بار اس نے فرانس و برطانیہ کے بل پر صرف پورٹ سعید پر استیلاء حاصل کر لیا تھا، جہاں تک نہر سویز کا تعلق ہے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، اور پھر دشمن کا یہ استیلاء زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہا، مگر دوسری مرتبہ یعنی ۱۹۶۷ء میں تو اسرائیلیوں نے نہری علاقہ کے تمام شہروں کو ویران اور خود نہر سویز اور اس کے کنارے کی شاندار تعمیرات اور تنصیبات کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا، اور اس کا یہ استیلاء کامل سات سال تک جاری رہا، لہذا اتنے طویل زمانہ تک اس زندہ آبی شہ رگ (نہر سویز) کو مزید کار آمد بنانے اور اس کو کشادہ اور گہری کرنے کا منصوبہ معرض التوا میں پڑا رہا۔

شہر اسماعیلیہ میں محکمۂ نہر سویز کی مرکزی عمارت واقع ہے، یہ عمارت نہایت عالیشان پانچ منزلہ ہے اور ہنوز غیر مکمل ہے، اور شاید محکمہ کی دوسری عمارتوں میں صرف یہی ایک عمارت اسرائیل کی تخریب کاری سے محفوظ رہ گئی ہے، یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ نہر کی صفائی اور رکاوٹوں کے دور کرنے کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے، ڈفرسوار نامی علاقے میں اس بند خیبہ سانی کا کوئی نشان نہیں ملا جس کو اسرائیلیوں نے نہر سویز کے شمالی جانب تعمیر کیا تھا، تاکہ زیادہ سے زیادہ طویل مدت تک نہر سویز میں دوبارہ جہاز رانی ممکن نہ ہو سکے

یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ مصری کاریگروں اور انجینیروں نے پتھروں اور چٹانوں سے بنے ہوئے اس ایک لاکھ اسی ہزار مربع میٹر کے اس بندھ کو ۸۰ سے بھی کم دنوں میں توڑ کر صاف کر دیا تھا، جب کہ عالمی کمپنیوں نے اس کام کے لئے کم از کم ۶ ماہ کا اندازہ لگایا تھا،

نہر سویز کے کنارے بھاری بھاری پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن میں سے ہر ایک دس ٹن سے کم وزنی نہ رہا ہوگا، بندھ ڈفرسوار کی بھاری چٹانوں اور وزنی پتھروں کو سمندر کی تہ صاف کرنے والی مشین کے ذریعہ ہٹایا گیا تھا، اس مشین کے ذریعہ نہر سویز کی گہرائی سے کیچڑ، پتھر روڑے اور تہ بہ تہ ریگ کو بھی صاف کیا جا رہا ہے، نہر کی تہ صاف کرنے والی مشین (Dredging Machine) ہرم اکبر کے بانی فرعون مصر "خوفو" کے نام سے موسوم ہے، دشمن نے ۱۸ فروری ۷۴ء کو ڈفرسوار کے نزدیک سرحدی علاقوں سے پیچھے ہٹتے وقت اسے جلا دیا تھا، بلاشبہ یہ مشین نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کی جدید ترین اور سب سے بھاری بھرکم مشین ہے، اس کی مالیت کا اندازہ پچاس لاکھ جنیہات لگایا جاتا ہے، جب اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ یہ مشین بالکل برباد ہو گئی ہے تو وہ اس مقام سے پیچھے ہٹے، اور ظاہر ہے کہ اس سے دشمن کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کے پیچھے لوٹنے کے بعد نہر دوبارہ جلد بحال ہونے کے قابل نہ رہے،

لیکن سینائی میں دشمنوں کے پیچھے ہٹنے کے صرف چار ماہ کے اندر ہی اس مشین نے از سر نو کام شروع کر دیا، اور اسرائیل نے نہر سویز کو بند کرنے کے لئے جو بندھ تعمیر کیا تھا، وہ اس کے پتھروں اور سیمنٹ کے روڑوں کو صاف کرنے لگی، اور اس مشین کو اس قدر کم وقت میں کام کے قابل بنانے میں مصر کے ماہرین فن نے شب و روز جد و جہد کی ہے،

دشمن نے تنہا خود تہ صفائی مشین (Dredging Machine) ہی کو غرق نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ محکمہ کی ملکیت دس دوسری ایسی ہی مشینوں میں سے پانچ کو اور بھی ڈبو دیا تھا، اب وہ سب کی سب نکال لی گئی ہیں، اور ان کی ہر ممکن درستگی، اور اصلاح و مرمت کی جا رہی ہے، امید ہے کہ وہ جلد ہی استعمال کے قابل ہو جائیں گی، محکمہ نے اس کے علاوہ تہ صاف کرنے والی چار نئی مشینیں بھی تیار کر لی ہیں، اور اس وقت دو اور مشینوں کے بنانے کا کام جاری ہے،

تباہی کی تصویر | نہر سویز کے مغربی کنارے پر پورٹ سعید سے پورٹ توفیق تک منظر کشی کیلئے صرف تباہی، تباہی اور مکمل تباہی کے الفاظ ہی استعمال کئے جا سکتے ہیں، مگر دشمن کی اس تباہی کے پہلو بہ پہلو زندگی کو معمول پر لانے کا عمل بھی تیزی سے جاری ہے، خاص طور سے سویز اور پورٹ سعید کے شہروں میں جو دشمن کے بموں اور توپوں کے گولوں کے خصوصی نشانے تھے، زندگی کی لہر دوبارہ پیدا ہو چلی ہے، ہوائی جارحیت سے کون کون سی عمارتیں تباہ ہوئیں اس کی فہرست بہت طویل ہے، جس میں محکمہ نہر سویز کے دفاتر کی عمارتیں، رہائشی مکانات، ورکشاپ، پانی اور بجلی کے اسٹیشن، پیداواری کارخانے، زرعی اور مواصلاتی وسائل اور نہری تنصیبات سب داخل ہیں، یہ تمام تباہی اس لوٹ کھسوٹ کے علاوہ ہے، جو دشمن نے مقبوضہ علاقے کو مجبوراً خالی کرتے وقت کی تھی،

نہر کی رکاوٹیں | نہر کھولنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ بڑے بڑے جہاز ہیں جو اس آبی گذرگاہ میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور جن کی تعداد دس ہے، ان میں کمہ نامی جہاز بھی شامل ہے، جسے پورٹ سعید شہر کے قریب دشمن نے نہر کے طول میں غرق کر دیا تھا اس کا وزن سات ہزار ٹن ہے، ان تمام رکاوٹوں کو ایک امریکن کمپنی نے محکمہ نہر سویز کے

عداوت صدر کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور گذشتہ سال ۱۹۷۴ کے اواخر میں یہ کام انجام کو پہنچا،

میں اور بارودی سرنگیں | دشمن نے نہر سویز میں جو بارودی سرنگیں بچھادی تھیں، ان کی صفائی کا کام برابر جاری ہے، یہ کام گذشتہ سال فروری کے مہینہ میں شروع کیا گیا تھا، یہ ایک بیحد دشوار کام ہے، بعض امریکی، اور برطانوی کمپنیوں نے بھی اس سلسلہ میں اپنے تعاون کی پیشکش کی جسے محکمے نے اس کانفرنس کے بعد قبول کر لیا جو اس نے عالمی ماہرین فن سے استعانت پر بحث کرنے کے لئے قاہرہ میں منعقد کی تھی، اس موتمر میں غیر ملکی سفارت خانوں کے متعدد وفود نے شرکت کی تھی، اور اس کے بعد ہی مصر، امریکہ اور برطانیہ کے درمیان حکومتی سطح پر رابطہ قائم ہوا، اور پھر امریکہ کے بڑے بڑے طیارے ساز وسامان لے کر مصر پہنچنے لگے، امریکہ برطانیہ اور مصر تینوں اسرائیل کی بچھائی ہوئی بحری سرنگوں کی تلاش کا کام مل کر کر رہے ہیں،

نہر میں دوبارہ جہازرانی | جہانتک نہر سویز میں دوبارہ جہازرانی کے آغاز کا سوال ہے اس میں تقریباً ۲ ماہ لگ جائیں گے کیونکہ جبتک نہر کی تہ کو بحری سرنگوں اور آتش گیر مادوں سے صاف نہیں کر دیا جاتا، جہازوں کے گذرنے میں بڑے خطرات ہیں، لیکن نہر کی تباہ شدہ تنصیبات کی تعمیر اور اس کی سابقہ شکل وہیئت کو بحال کرنے میں بہت وقت لگے گا،

نہر کی صفائی کے سلسلہ میں ہونے والے اخراجات کو حکومت کویت نے بڑی فراخدلی کے ساتھ فراہم کر کے ایک بہت بڑی مشکل کو حل کیا ہے، اور اگر یہ مخلصانہ تعاون

لے مصر کے صدر انور سادات نے حال میں مصری پارلیمنٹ میں اعلان کیا ہے کہ آئندہ ۵ جون سے نہر سویز کو عالمی جہازرانی کے لئے کھول دیا جائیگا، اور فی الحال ایک لاکھ ٹن وزنی مال بردار جہاز اس سے گذر سکے گا، لیکن اسرائیل کو جہازرانی کی اجازت نہیں دی گئی ہے، دنیا کے تمام ملکوں نے اپنے اپنے مفادات کے پیش نظر اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہے، مدنعیم لا

حاصل نہ ہوا ہوتا تو یہ ترقیاتی منصوبہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو پاتا، حکومت نے ایک کروڑ کویتی دینار بطور قرض دیئے، اسی طرح عالمی بینک (World Bank) نے پچاس لاکھ اور بہت سے دوسرے عرب ممالک مثلاً سعودی عرب، قطر اور متحدہ عرب امارات نے گراں قدر عطیے دیئے، کیونکہ نہر سویز کو دوبارہ کھولے جانے کا مسئلہ دنیائے جہازرانی کا اہم موضوع ہے، اسی کے ساتھ امریکی، فرانسیسی اور برطانوی بحریہ کے تعاون کا بھی شکرگزار ہونا ضروری ہے، جن کے آٹھ سو سے زائد انجینیر، ماہرین فن اور غوطہ خور مصری محکمہ نہر کے ذمہ داروں کے ساتھ مل کر پورے اخلاص و ہمدردی کے ساتھ نہر کے پانی اور اس میں چھپی ہوئی بارودی سرنگوں کو صاف کر رہے ہیں،

گذشتہ سات برسوں میں جب سے نہر سویز کی جہاز رانی موقوف ہے، مصر کے تقریباً ۴ کروڑ ڈالر کے نقصانات کا اندازہ لگایا جاتا ہے، پوری دنیا کی جہاز ران حکومتوں کو اس عرصہ میں جو نقصان برداشت کرنا پڑا، ماہرین اس کا تخمینہ بارہ اور چودہ ارب ڈالر لگاتے ہیں، ایک بار ان حکومتوں کے سفارتی نمائندے مصر میں جمع ہوئے تھے تو ان سے کہا گیا تھا کہ نہر سویز کے بند ہو جانے سے ان ملکوں کا اب تک کافی مالی نقصان ہو چکا ہے، اور ہر سال بھاری خسارہ ہو رہا ہے، لہذا اگر وہ کثیر قرضوں سے مدد کریں، تو جلد از جلد نہر سویز کھول کر ان کا خسارہ پورا کیا جا سکتا ہے، جاپان وغیرہ بعض ملکوں نے اس بات کو قابل اعتنا سمجھا اور مدد کرنے میں سبقت کی،

نہر سویز کو مزید گہرا اور وسیع کرنے کا ایک ہمہ گیر اور وسیع پلان بنایا گیا ہے، جس کے مکمل ہونے میں تقریباً ۴ ماہ کا عرصہ لگے گا، اور اس منصوبہ کی تکمیل کے بعد دو لاکھ ساٹھ ہزار ٹن وزنی مال بردار جہاز اس نہر سے بآسانی گذر سکیں گے، یہ تو مستقبل کی بات

ہے، فی الحال نہر سوئز کے دوبارہ افتتاح کے وقت (جس کی جلد ہی امید ہے) اس کی حالت بالکل ویسی ہی ہوگی جو اسرائیلی جارحیت سے قبل تھی، یعنی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار ٹن والے مال بردار جہاز اس میں چل سکیں گے، یا اگر بار کم ہوا تو ایک لاکھ ٹن تک کا جہاز اور خالی جہاز ڈیڑھ لاکھ ٹن تک گذر سکے گا،

نہر سوئز سے اسکندریہ تک بچھائی جانے والی مجوزہ پٹرول پائپ لائن کے منصوبہ سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں تیل بحر احمر کے خطہ سے اسکندریہ میں واقع تیل صاف کرنے کے کارخانے تک منتقل کرنے میں بے حد مدد ملے گی، کیونکہ جب تک نہر سوئز کی توسیع و تعمیق کا عالیہ منصوبہ مکمل نہیں ہو جاتا، زیادہ وزنی تیل بردار جہاز اس میں سے گذر نہیں سکتے، اور اس انقلابی پلان کی تکمیل کے بعد بھی پٹرول کی اس پائپ لائن سے مصر کو بہت سے اقتصادی فائدے حاصل ہوں گے،

نہر سوئز کے دوبارہ کھلنے پر جو ٹیکس حاصل ہوں گے، اس کا یقینی تخمینہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا ہے، مصر اور غیر ملکی ماہرین فن مشترکہ طور پر اس کے مطالعہ اور غور و خوض میں برابر مصروف ہیں، تاکہ کسی ایسے فارمولے پر اتفاق رائے ہو جائے جس سے نہر سوئز مشرق و مغرب کے درمیان عالمی تجارت کے لئے ارزاں ترین آبی گذرگاہ بن سکے،

عربوں کی جہاز رانی

مولانا سید سلیمان ندوی نے عربوں کی جہاز رانی کے موضوع پر بمبئی میں چند لکچر دئے تھے، یہ انھی لکچروں کا مجموعہ ہے، یہ سید صاحب کی بہترین تاریخی کتابوں میں ہے، جس میں انھوں نے اس موضوع سے متعلق تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے،

۲۳۹ صفحے قیمت :- سے (۶-۰) "منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

Saviour of Islamic Spirit vol II

مترجمہ جناب محی الدین احمد صاحب، لکھنؤ۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذاتِ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے جو حسنِ قبول عطا کیا ہے وہی اُن کی تصانیف کو حاصل ہے، اس وقت وہ نہ صرف اس برصغیر بلکہ اسلامی ممالک کے بھی بہت ہی ممتاز اور قابلِ احترام مصنف تسلیم کئے جاتے ہیں، اُن کے مشاغل گوناگوں ہیں کبھی عربی مدارس کی تعلیم کے مسائل کی گتھیاں حل کرتے ہیں کبھی مذہبی جلسوں میں شریک ہوکر اپنی دلپذیر تقریروں سے سامعین کے قلب و دماغ کو ایمان کے نور سے منور کرتے ہیں کبھی سیاسی جلسوں میں شریک ہوکر ہندوستانی مسلمانوں کے گرتے ہوئے حوصلوں کو بلند کرتے ہیں کبھی اسلامی ممالک کا دور دراز سفر کرکے وہاں کی علمی اور ثقافتی انجمنوں کو اپنی مخلصانہ رائے سے دور کرتے ہیں، ان گوناگوں مشغولیتوں کے ساتھ تصنیف و تالیف کا وقت بھی نکال لے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے گوشۂ دل میں علم کا ایک جہانِ اضطراب چھپا ہوا ہے جو ان کے سینے سے بے تاب ہوکر خود بخود سفینہ میں منتقل ہوتا رہتا ہے،

وہ اب تک بہت سی قابلِ قدر کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، وہ اردو اور عربی دونوں زبان کے بڑے ماہر ادیب اور انشا پرداز ہیں، اُن کی تحریروں میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے، کہ اُن کی کوئی کتاب اگر عربی میں نکلتی ہے، تو فوراً اردو میں منتقل ہو جاتی ہے

اور اگر اردو میں شائع ہوتی ہے تو انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہو جاتی ہے، اس طرح اسکے افادہ کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے،

اُن کی تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" کو بڑی مقبولیت حاصل ہے، یہ تین جلدوں میں ہے، اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، انگریزی میں اس کے کچھ ابواب کا ترجمہ کرنے کی سعادت جناب محی الدین صاحب کو ہوئی ہے، جو کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں بلکہ لکھنؤ کے سکریٹریٹ میں ایک اچھے عہدہ پر ہیں، مگر انگریزی زبان کے لکھنے میں اُن کو وہی قدرت ہے، جو یونیورسٹی کے کسی لائق پروفیسر کو ہو سکتی ہے، اس کا مطالعہ کرنے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا، کہ کسی مترجم کا ترجمہ نظر سے گذر رہا ہے، اس میں تین بزرگان دعوت و عزیمت شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء، مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے سوانح اور تعلیمات کی مرقع آرائی بہت ہی باوقار اور دل آویز انداز میں کی گئی ہے، فاضل مصنف کا علمی انداز اور مذہبی مسلک وہی ہے جو دارالمصنفین کا ہے، اسلئے ان بزرگان دین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے اختلاف کا سوال ہی نہیں ہوتا، نظر کے سامنے صرف مترجم کے فاضلانہ ترجمہ کا تعارف کرانا مقصود ہے، یہ ترجمہ جس ذوق و شوق سے کیا گیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسی ذوق و شوق سے یہ کتاب پڑھی جائے، لائق مترجم کو انگریزی زبان پر اتنی قدرت ہے کہ فارسی اشعار کا ترجمہ بھی انگریزی اشعار میں کر دیا ہے، اگر فارسی اشعار بھی نقل کر دیئے جاتے، تو دونوں کو پڑھنے میں لذت محسوس ہوتی یہ انگریزی داں طبقہ کے لئے ہے، اس لئے ہجری سنہ کے ساتھ عیسوی سنہ بھی لکھ دیا جاتا تو بہتر ہوتا، مترجم کے ادب شناس قلم سے توقع تھی، کہ مناظر احسن گیلانی کے بجائے، اگر مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے تو ان کا احترام باقی رہتا،

کتاب کی لکھائی چھپائی بہت عمدہ اور دیدہ زیب ہے، البتہ اس میں کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں (نفحات الانس ص ۱۵۰) آثر الکرام ص ۱۵۲، و ۱۵۲) سجزی (ص ۱۵۳) ابوالفضل (ص ۱۵۴) قطب الدین (ص ۱۵۴) کیلوکھری (ص ۱۵۵) غزنی گیٹ (ص ۱۵۹) قصور (ص ۱۵۹) غزنوی (ص ۱۶۳) نقد (ص ۱۶۹) کاغذی (ص ۱۸۱) کیقباد (ص ۱۸۳) سیرفی (ص ۱۸۹) منیری (ص ۲۵۷ حاشیہ) حمویہ (ص ۲۶۳) سمرقندی (ص ۲۶۵) وغیرہ جیسے انگریزی الفاظ میں طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، امید ہے کہ لائق مترجم دوسرے اڈیشن میں اُن کو درست کر دیں گے، طباعت کی ان فروگذاشتوں سے کتاب کے متن میں کوئی فرق نہیں آتا، لائق مترجم کی یہ قلمی کاوش ہر طرح مبارکباد اور ستائش کی مستحق ہے، اللہ کرے اُن کا یہ زورِ قلم برابر قائم رہے، اس سے پہلے ان کے قلم سے اس کی پہلی جلد بھی نکل چکی ہے، یہ دوسری جلد ہے، امید ہے کہ انگریزی داں حلقہ میں اس کتاب سے ان بندگانِ دین کی دعوت و عزیمت کے سمجھنے میں پوری مدد ملے گی، کتاب کی ضخامت ۳۰۲ صفحے ہے، قیمت ۳۵ روپئے ہے۔

ملنے کا پتہ :- اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز پوسٹ آفس بکس نمبر ۱۱۹، ٹیگور مارگ، ندوہ، لکھنؤ،

ذکرِ خیر

مولانا سید عبدالحئی ناظم ندوۃ العلماء کی اہلیہ محترمہ کے موثر اور سبق آموز حالات و واقعاتِ زندگی جس کی آغوشِ شفقت اور سایۂ تربیت میں اُن کے صاحبزادے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے اردو و عربی کے نامور مصنف پروان چڑھے، اور علم و ادب میں کمال پیدا کیا، قیمت ۳ روپئے، مکتبہ فردوس۔ مکارم نگر، لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

خطبات آزاد مرتبہ۔ جناب مالک رام صاحب تقطیع متوسط کاغذ طباعت عمدہ کتابت قدرے اچھی صفحات ۶۳۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۰ روپیہ پتہ ساہتیہ اکیڈمی راجندر بھون نئی دہلی

ساہتیہ اکاڈمی نے اپنے پروگرام کے مطابق اب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یہ چوتھی کتاب شائع کی ہے، جو ان کی پندرہ تقریروں کا مجموعہ ہے، اس میں زیادہ حصہ آل انڈیا مجلس خلافت، جمیعۃ علمائے ہند، انڈین نیشنل کانگریس اور جمیعۃ اہلحدیث کے جلسوں کی صدارتی تقریروں کا ہے۔ اتحاد اسلامی، عربی مدرسوں کی اصلاح نصاب سے متعلق اور تقسیم کے بعد کی جامعہ مسجد دلی کی معرکۃ الآراء تقریریں بھی دی گئی ہیں ان میں ملک و ملت کی صحیح رہنمائی مسلمانوں کو ایمان و عمل صالح کی ولولہ انگیز دعوت اور صحیح اسلامی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے یہ اب بھی مسلمانوں کے لیے فکر و عمل کا پیام ہیں، ساہتیہ اکاڈمی سے شائع ہونے والی پہلی تین کتابوں کی طرح اس کی ترتیب و تحشیہ کا کام بھی مولانا کی تحریر و تقریر کے ادا شناس جناب مالک رام صاحب نے بڑی محنت و تحقیق سے انجام دیا ہے، حاشیے میں آیات و احادیث اور اشعار کی تخریج اور اسماء و اعلام کے متعلق مختصر نوٹ دئے گئے ہیں آخر میں پانچ مفصل فہرستیں ہیں، ان میں بالترتیب آیتوں، حدیثوں، اشخاص، مقامات اور کتب و رسائل کا انڈکس ہے، یہ مجموعہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۸ء تک کی تقریروں پر مشتمل ہے، اگر اس میں مولانا کی آخری زندگی ۱۹۵۸ء تک کی تقریریں بھی جن کی تعداد غالباً زیادہ نہیں ہے، درج کردی گئی ہوتیں تو زیادہ بہتر ہوتا

تقسیم کے بعد لکھنؤ مسلم کنونشن کی معرکۃ الآرا تقریر کا شامل نہ کیا جانا بھی تعجب انگیز ہے، جا بجا کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، بعض حاشیوں میں متن کے نمبر اور صفحے کے ہندسے غلط لکھے گئے ہیں بعض جگہ حاشیے کے نمبر ہیں مگر حاشیہ موجود نہیں، بعض شعروں کی تخریج اور ناموں پر نوٹ بھی نہیں دیے گئے ہیں مثلاً متن ص ۱۳۴ و ص ۱۰۲ کے شعروں اور ص ۱۱۲ و ۱۱۳ کے اشخاص اور اداروں پر کوئی حاشیہ تحریر نہیں کیا گیا ہے۔ ص ۳۵۴ کے حاشیہ ۱۱ میں ابو قبیس بن شارخ کا نام غلطی سے قبیس بن شارخ لکھا گیا ہے۔ بعض آیتوں کے ترجمے محل نظر ہیں جیسے (بل ھم فی شک یلعبون) میں شک کا ترجمہ دھوکہ کیا گیا ہے۔

پسِ دیوارِ زنداں، موت سے واپسی از جناب شورش کاشمیری صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۳۴ و ۳۰۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت عے، و عہ پتہ۔ مطبوعات چٹان، ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور۔ پاکستان

آغا شورش کاشمیری ان محبان وطن میں تھے جو برطانوی استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیے ہوئے تھے، اس لیے ان کی جوانی قید و بند کی صعوبتوں میں گذری، آزادی کے بعد پاکستانی حکمرانوں سے اختلاف کی بنا پر کہولت کا زمانہ بھی طوق و سلاسل کی بندشوں میں گذارنا پڑا، پہلی کتاب میں انھوں نے برطانوی دور میں اپنی دس سالہ اسیری کی روداد اور دوسری میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم صدر پاکستان کے دور میں اپنی گرفتاری کی روداد لکھی ہے، برطانوی دور میں وہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۶ء تک جیل میں رہے، اس وقت جیل واقعی معنوں میں جیل ہوتا تھا، شورش صاحب کو عموماً سی کلاس میں رکھا جاتا، اس لیے وہ بڑے شدائد و محن سے دوچار رہے۔ پہلی کتاب میں اس دور کے جیلوں کی پرمشقت زندگی، جیل کے حکام کے وحشیانہ سلوک، پولیس کی بربریت و شقاوت اور ابنائے وطن کی ذہنی پستی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو انگریزوں کا

کا، مگر اپنے ہی ملک کے مجاہدین حریت کو زد وکوب کرتے تھے۔ وہ مختلف قسم کے قیدیوں ے ساتھ رہے، ان سب کے خط و خال بھی واضح کیے گئے ہیں، مصنف آزادی کے جذبے میں ریزوں کی مخالفت میں نہایت سرگرم تھے۔ اس لیے ان کو قومی رہنماؤں سے بڑا ت رہا۔ مگر انھوں نے کانگریس کے بعض فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر کی مذمت ی کی ہے۔ دوسری کتاب میں ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک میں اپنی گرفتاری اور جیل میں ہ ساتھ کیے جانے والے نا روا برتاؤ کا مفصل حال لکھا ہے آخر میں اپنی بھوک ہڑتال اور ائی وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اس ابتلا و آزمایش میں موت کے منہ سے کسی طرح نکل آئے ہیں۔ لئے س کتاب کا نام "موت سے واپسی" رکھا ہے، مصنف نے جیلوں میں تشدد کے جو واقعات لکھے ہیں، ن کو پڑھکر تو اثر ضرور ہوتا ہے لیکن دوسری کتاب میں ان کے بیانات کی حیثیت یکطرفہ ہوگئی ہے س لئے دور کے مشاہدین کے لیے جو اصل حالات سے بے خبر ہیں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے، انھوں نے ود اپنے جذباتی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اور جوش و جذبہ میں ان کے گرم لب و لہجہ میں دعائی انداز پیدا ہوگیا ہے، تاہم ان دونوں کتابوں میں زبان و بیان کی جو دلکشی ہے اس سے اس دور کے سیاسی میلانات اور قومی سرگرمیوں سے متعلق مفید معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی

حسرت موہانی حیات اور کارنامے، مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری صاحب، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۹۴ مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۰ روپیے، (۱) ادبستان نظام پور، گورکھپور، (۲) دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ،

یہ کتاب لائق مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے، یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں حسرت کے عہد اور ماحول کا بطور پس منظر ذکر کیا گیا ہے، اس میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی قومی، ملی اور سیاسی جد و جہد اور مذہبی

اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں کا مختصر خاکہ بیان کرکے اس عہد کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، دوسرے باب میں حسرت کے حسب و نسب، تعلیم اور واقعات زندگی اور تیسرے میں ان کی سیرت و شخصیت اور اخلاق و اوصاف کا مفصل ذکر ہے، آخر کے پانچ ابواب میں حسرت کی علمی خدمات، شاعری، صحافت نگاری، تذکرہ نویسی، تنقید نگاری، اور ان کی دوسری تصنیفات پر بحث کی گئی ہے، لیکن جس طرح شاعری، تنقید اور تذکرہ نگاری میں حسرت کے مرتبہ کو واضح کرنے کے لئے ان کے پیشرووں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اسی طرح ان سے پہلے کی صحافت نگاری کا بھی مختصر جائزہ لینا چاہئے تھا، ص ۴۴ کے حاشیہ میں مولانا محمد علی کے نام کے ساتھ کانپوری لکھا گیا ہے، وہ کانپور کے ضرور رہتے تھے، لیکن مونگیر جاکر آباد ہوگئے، اس لئے ان کے نام کا جزء مونگیری ہوگیا، مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ان کی وفات کے بعد مولانا شبلی ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے، حالانکہ مولانا شبلی کبھی ندوہ کے ناظم نہیں بلکہ معتمد تعلیم رہے، اور ان کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی، جبکہ مولانا مونگیری کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، اسی طرح کے اور واقعات بھی محل نظر ہیں، تاہم اس کی ترتیب اور انداز بیان میں خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ہے، مولانا حسرت موہانی ادب و سیاست دونوں میں ممتاز اور بعض اوصاف و کمالات میں بے نظیر تھے، اس لئے فاضل مصنف نے ان کو اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع بنا کر ایک ادبی حق ادا کر دیا ہے، آخر میں مراجع و مصادر کی مکمل فہرست کے علاوہ دو ضمیمے بھی ہیں، پہلے میں ان شعرا کی فہرست دی گئی ہے جن کے تذکرے حسرت نے خود لکھے یا دوسروں سے لکھوائے تھے، اور دوسرے میں ان کی ان نظموں کو شامل کیا گیا ہے، جو کلیات میں درج نہیں ہیں،

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دارالمصنفین نے اور بھی بہت سی
شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو
ے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر
رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ٣ مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبدالعزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح برکت
رکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت
ہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ
ا مولانا عبدالسلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی
ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- ٦ روپیہ ٢٥

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریزی کی
ات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے
تھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۲ روپیے پچیس پیسے

مؤلفہ :- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"

ہماری نئی کتب

حیاتِ سلیمان

حیاتِ سلیمان جس کا شائقین اور قدر دانانِ دار المصنفین کو انتظار تھا، بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی
یہ محض جانشین شبلی مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ
اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع
جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک پھیلا تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی
و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات
جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے
کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، ا
سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، ا
پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں پھر مختلف
وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ، پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بھی
روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب
انشاء کے لحاظ سے بالکل حیاتِ شبلی کا مثنیٰ ہے۔ ویسی ہی دلکش دلچسپ اور لذیذ،

قیمت ۱۷ روپئے ۵۰

مؤلفہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

جون ۱۹۹۵ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ۔ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپئے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مجلس ادارت

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۳۔ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی لکھنؤ
۴۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(مرتبین)

سید صباح الدین عبدالرحمن ⁝ عبدالسلام قدوائی ندوی

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء، وفضلاء کی علمی وادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب وزبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء، وفضلاء، وشعراء کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد ومعلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۴ روپیے ۵۰ پیسے

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۵ ماہ جون ۱۹۷۵ء مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ عدد ۶

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۴۰۲-۴۰۴

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۴۰۵-۴۳۲
مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	۴۳۳-۴۴۰
قرآن حکیم اور ذوق کی تربیت	جناب محی الدین صاحب ایم اے، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	۴۴۱-۴۶۱
شعوبی تحریک اور اس کا انجام	ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۶۲-۴۶۸
اردو والوں کے تنقیدی اصول میں تنظیم و انضباط	جناب اشفاق احمد خاں صاحب ایڈووکیٹ شاہ جہاں پور،	۴۶۹-۴۷۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۷۷-۴۸۰

تصحیح

معارف مئی ۱۹۷۵ء کے ص ۳۶۹ پر مضمون نگار کا نام مسودہ میں نامصاف لکھے ہونے کے باعث جلال الدین غلط چھپ گیا ہے اصل نام عبدالرشید ہے، "اڈیٹر"

شذرات

اردو کی موجودہ نثر نگاری کی عمر کچھ زیادہ لمبی نہیں مشکل سے سو سوا سو برس کی ہوگی، یہ علماء کی مجلس کی بھی زینت بنی رہی، اور انگریزی دانوں کی بزم کی بھی رونق بڑھاتی رہی، دونوں کی علیحدہ علیحدہ کاوشوں سے اسکے علوم و فنون کی کمیت اور اسلوب کی کیفیت میں جو ترقی ہوئی وہ ایک دلچسپ موضوع ہے،

علماء نے مذہبی علوم کو اس زبان میں منتقل کرنے میں جس عجلت اور جانفشانی سے کام لیا ہے وہ اُن کا ایک بڑا کارنامہ ہے، کلام پاک کے دو ترجمے تو اتنے ہو چکے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت میں اس کے فارسی ترجمے کی جو کمی تھی، اُس کی پوری تلافی ہو گئی ہے، اسکی تفسیریں بھی بڑی محنت بلکہ جانکاہی سے لکھی گئیں، مولانا امیر علی نے تو مواہب الرحمٰن کے نام سے تیس ضخیم جلدیں لکھ کر ایک عظیم کام انجام دے دیا ہے، سر سید احمد خاں نے بھی چھ جلدوں میں ایک تفسیر لکھی، مولانا اشرف علی کی بیان القرآن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن پر تو بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے، امام رازی کی اہم تفسیر بھی اردو میں منتقل کی جا چکی ہے، احادیث میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ وغیرہ کے بھی ترجمے ہو چکے ہیں، فقہ میں ہدایہ، شرح وقایہ، قدوری، کنز، دُرِّ مختار، اور فتاوی عالمگیری کی پوری جلدوں کے ترجمے کرکے علماء نے اس زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے، سیرۃ النبی پر جتنا اچھا کام علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا کسی اور زبان میں شاید ہی ہوا ہو، تصوف میں کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیاء عوارف المعارف، مکتوبات حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، مکتوبات امام ربانی اور شاہ ولی اللہ کی تصانیف بھی اردو کا جامہ پہن چکی ہیں، امام غزالی، ابن خلدون اور ابن تیمیہ کے علاوہ اور دوسرے مشاہیر اسلام کے کارناموں سے اردو زبان روشناس ہو چکی ہے، اس قسم کے قیمتی علمی سرمایہ سے اس زبان کے وقار میں بڑا اضافہ ہوا،

اردو میں تاریخ نویسی کے فن کو فروغ دینے میں بھی علماء کا نمایاں حصہ ہے، ان ہی کی محنت سے ابن خلدون کے علاوہ طبری، اور ابن اثیر کی تاریخوں کے ترجمے ہوئے، مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہند کی ۱۵ جلدیں، مولانا محمد حسین آزاد نے

دربارِ اکبری، علامہ شبلیؒ نے المامون اور مضامین عالمگیر اور مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات لکھ کر اس فن میں تحقیق و تلاش کرنا سکھایا۔ سوانح نگاری میں مولانا حالی کی حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید، علامہ شبلی کی الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، مولانا سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی اور خیام، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی کی وقارِ حیات اور شاہ معین الدین احمد ندوی کی حیاتِ سلیمان سے بہتر سوانح عمریاں اب تک نہیں لکھی جا سکی ہیں، صحابۂ کرام، تابعین، محدثین، ائمۂ اسلام اور صوفیائے کرام کے مستند سوانح علماء ہی کی سرگرمیوں سے مرتب ہوئے ہیں، تنقید نگاری میں بھی انہی کو اولیت حاصل ہے، آبِ حیات، مقدمۂ شعر و شاعری، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر، گلِ رعنا، شعر الہند اور تاریخ ادبِ اردو ایسی زندۂ جاوید کتابیں ہیں جن سے ہر زمانہ میں استفادہ کیا جائیگا، لغت نویسی میں بھی انہی کو فضیلت ہے، نور اللغات، امیر اللغات، جامع اللغات، اور فرہنگِ آصفیہ کی تدوین و ترتیب انہی کی رہینِ منت ہے، علما کی ثقاہت اور ناول نگاری بظاہر متضاد چیزیں ہونے کے باوجود مولانا نذیر احمد، مولانا عبد الحلیم شرر، حکیم محمد علی ہردوئی اور مولانا راشد الخیری کے ناول برابر یاد رکھے جائیں گے، علماء کے ان تمام کارناموں سے اردو ایک جاندار اور شاندار زبان بنی،

اردو کی موجودہ نثر نگاری کے ابو الآبا سرسید ہیں، مگر ان کے علمی ورثہ پر دونوں گروہوں کا حق برابر ہے، اگرچہ وہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے سالارِ کارواں تھے تو روشن خیال علماء کے بھی سرخیل تھے، البتہ علی گڈھ اسکول اور اسکے ہم نواؤں سے امید تھی کہ وہ غیر مذہبی علوم پر کتابیں لکھ کر اس زبان کو متمول بنائیں گے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مقدمہ معاشیات، خواجہ غلام السیدین نے اصول تعلیم، پروفیسر محمد مجیب نے تاریخ فلسفۂ سیاسیات لکھ کر مفید علمی خدمت ضرور انجام دی، مگر اب تک یہ زبان سائنس، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، تعلیمات، نفسیات اور گہرے فلسفیانہ مباحث وغیرہ سے بہت زیادہ آشنا نہیں، اسکی تلافی غیر زبانوں سے ترجمے کر کے ہو سکتی تھی، سید علی بلگرامی، عنایت اللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے ترجمے کے فن کی بڑی آبیاری کی لیکن اس آغاز کو انجام تک پہنچانیکی ضرورت باقی رہی، عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں اس گروہ کا بہت کچھ حصہ ہے، مگر اسکی بعض مطبوعات میں ترجمہ کے فن کو معاوضہ پانیکی عجلت میں جس طرح قربان کیا گیا، وہ ایک علمی المیہ ہے، جو امید ہے کہ حکومتِ ہند کے موجودہ اردو بورڈ کے ترجموں کی طرف سے نہ دہرایا جائیگا،

اس وقت ناول نویسی اور افسانہ نگاری پر انگریزی دانوں ہی کا تسلط ہے، ناول نویسی کا فن آگے بڑھنے کے بجائے رکا ہوا ہے، مستقبل قریب میں کسی رتن ناتھ سرشار اور پریم چند کے پیدا ہونے کی امید نہیں، البتہ اردو افسانہ نگاری میں بڑی ترقی ہوئی، اس کے افسانوں کے بعض مجموعے دنیا کے بہترین مجموعوں کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، گو ابھی تک ان سے ہندوستانی تہذیب یا ماحول کا کوئی شاہکار کردار نہیں مل سکا ہے، صحافت نگاری پر زیادہ تر انگریزی تعلیم یافتہ گروہ ہی چھایا ہوا ہے، مگر اردو کی صحافت نگاری یہاں کی انگریزی جیسی غیر ملکی زبان کی صحافت نگاری کی طرح ایک موثر قوت نہیں بن سکی ہے، ماہانہ رسالے اور ڈائجسٹ نکالنے میں یہی گروہ آگے آگے ہے، جس سے زبان کی ترویج اور اشاعت تو ضرور ہو رہی ہے، مگر ان میں تحقیقی اور علمی مضامین کی کمی پائی جاتی ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض ارباب فن نے مزاح نویسی اور طنز نگاری کی سطح اونچی کر دی ہے مگر اب ایک سطح پر آکر رک گئی ہے، اسی طبقہ کے بعض حلقوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی آندھی کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ کے سہارے اٹھی، گو اب اس کا وہ زور باقی نہیں رہا، جدیدیت کے نام سے اب ایک نئی تحریک چل نکلی ہے،

یونیورسٹیوں کے بعض ذہین اساتذہ نے اپنی تنقید نگاری سے ادبی شعور میں بڑی رنگا رنگی پیدا کر دی ہے، جس سے شعر و ادب کے گیسو کو سنوارنے میں بڑی مدد مل رہی ہے، یورپ اور امریکہ کی تنقیدی نظر و فکر انہی کے ذریعہ سے روشناس ہو رہی ہے، مگر ان کا یہ تنقیدی لٹریچر زیادہ تر مقالات کی صورت میں شائع ہو رہا ہے، جن کے انبار کے نیچے ٹھوس تصانیف دب کر رہ گئی ہیں، مقالہ نگاری سے ایجاز و اختصار کے فن کو تو ضرور فروغ ہوا ہے، مگر ان کے مجموعوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے سہل انگاری اور ہلکی پھلکی ذہنی اور ادبی تفریح بازی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اردو زبان کی حقیقی ترقی اسی وقت ہوگی، جب پوری عرق ریزی اور تن دہی سے سنجیدہ علوم کا ڈھیر لگا دیا جائیگا، دیکھنا ہے کہ اس ڈھیر لگانے میں کون سبقت لے جاتا ہے،

اردو ادب کے اسلوب بیان پر انگریزی داں طبقہ کا بڑا اثر پڑا ہے، ان کے بعض ادیبوں کے طرز تحریر سے اردو نثر نگاری کا مس خام کندن بنتا جا رہا ہے، مگر ان میں ابھی تک حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی اور ابوالکلام آزاد کے ٹکر کا کوئی صاحب طرز ادیب پیدا نہیں ہو سکا ہے،

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۵)

سلطان فیروز شاہ تغلق اگر ہندوؤں کے مذہبی عقائد میں کوئی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا تو اس کو یہ حق خود اسلامی قوانین کے لحاظ سے نہ تھا، اس کی خواہش ضرور رہی کہ غیر مسلم زیادہ سے زیادہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، اس کے لئے اس نے تحریص و ترغیب بھی دلائی، لیکن جبر اختیار نہیں کیا، وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے اہل ذمہ کو دین کی رغبت دلائی اور اعلان کیا کہ ان میں سے جو کوئی توحید کا کلمہ پڑھے گا اور دین اسلام قبول کریگا، اس کا جزیہ معاف ہو جائے گا، اور اس کو بہت سے انعامات دیئے جائیں گے، اس اعلان کے بعد بکثرت ہندو مسلمان ہوئے، (فتوحات فیروز شاہی ص ۲۰، علی گڑھ اڈیشن)

فیروز شاہ تغلق پر مندر شکنی کا الزام

اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے بعض مندروں کو منہدم کیا، وہ اپنی فتوحات فیروز شاہی میں خود اعتراف کرتا ہے کہ اس نے تغلق پور، صالح پور اور قصبۂ گوہانہ کے نئے مندر منہدم کرا دیئے، (ص ۱۰-۱۱) اس

کے اسباب ایشوری ٹوپا کی زبانی سنئے،

ہندوؤں کے حقوق محفوظ تھے، لیکن اسلامی روایت کے مطابق کسی اسلامی حکومت کے اندر مسلمانوں کی آبادی میں ہندوؤں کو مندر بنانے کا حق نہ تھا، تغلق پور، صالح پور اور گوہانہ کو خود فیروز شاہ نے آباد کیا تھا، اس لئے جب وہاں ہندوؤں نے مندر بنائے تو ان کو ضرور منہدم کرا دیا، پھر اس کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مندر بد اخلاقی کے اڈے بن گئے تھے، ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی آتی تھیں، اس لئے یہ مندر عبادت گاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے، اس لئے فیروز شاہ نے اسلامی اور اخلاقی جذبہ کے ماتحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، (پالٹکس ان پری مغل ٹائمس، ص ۲۴۶ - ۲۴۷) یہ الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بد اخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ نے جو کچھ کیا تھا، اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا، بلکہ محض عوام کے اخلاق کو سنوارنے کیلئے ایسا کیا تھا، اگر اس میں مندروں کے انہدام کا جذبہ ہوتا، تو ہندوستان کے سارے مندروں کو مسمار کر دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ذمیوں کے حقوق کی بناء پر باقی اور تمام مندر محفوظ رہے، (ایضاً ص ۲۲)

ایشوری ٹوپا کے اس بیان کی تصدیق فتوحات فیروز شاہی سے بھی ہوتی ہے خود فیروز شاہ کا بیان ہے کہ ان مندروں کو منہدم کراتے وقت اس کی ہدایت تھی کہ عام ہندوؤں کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے،

"سائر ہنود را بہ تعزیبات مولم منع کردیم (ص ۱۲)

اگر غیر جانبدارانہ طور پر گہرا مطالعہ کیا جائے، تو ظاہر ہوگا کہ جب کسی زمانہ میں

کہیں مندر منہدم کرائے گئے تو اس کا سبب مذہبی تعصب یا جنون نہیں رہا، بلکہ یا تو ان کی دولت پر قبضہ کرنے یا ان کی سیاسی مرکزیت کو برباد کرنے یا ان کی بداخلاقی کو دور کرنے کے لئے کیا گیا، جنگ کے موقع پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہ کرتے، ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ ہندوؤں نے مسجدوں کو شہید کرکے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے، لیکن ان میں بھی یہ مذہبی جنون نہ تھا، بلکہ اس کے بجائے سیاسی اور جنگی اسباب ہوتے، اور فوجی غارتگری کی زد میں عبادت گاہیں بھی آتی رہیں،

ہندوؤں کے علوم سے دلچسپی فیروز شاہ نے اگرچہ کچھ مندر منہدم کرائے تو اسی کے حالات زندگی میں یہ بھی ہے کہ جب ۱۳۶۱ء میں وہ نگرکوٹ پہنچا تو یہاں … ں کے علوم سے متعلق جو کتابیں تھیں ان کی بابت معلومات حاصل کرکے خوش ہوا، پنڈتوں کو بلا کر ان کا ترجمہ کرنے کی فرمایش کی، ان میں سے ایک کتاب میں فلسفہ، نجوم اور الٰہیات سے متعلق مفید معلومات تھیں، فیروز شاہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کرانے کا حکم دیا، اس زمانہ کے مشہور شاعر عزالدین خالد خانی نے اس کا ترجمہ کیا، اور نام دلائل فیروز شاہی رکھا، (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۴۴ نولکشور پریس و منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۴۹) ان ہی کتابوں میں علم ہیئت پر سارا ولی اور علم نجوم ادشی تنتر کے بھی فارسی میں ترجمے کئے گئے، فیروز شاہ ہی کی فرمایش سے علم نجوم پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب برہم سمتا مولفہ وراہ مہر کا فارسی ترجمہ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف شمس سراج نے کیا، (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری جلد اول کالم ۱۱۱، ۱۱۲) پروفیسر کے ایم پنیکر کا بیان ہے کہ فیروز شاہ پر مذہبی تعصب کا

الزام رکھا جاتا ہے، لیکن وہ ایک ہندو شاعر، تن سیکھر کا بڑا احترام کرتا رہا (مسٹری آف انڈیا ص ۱۴۱) اس کا یہ احترام ہندو راجاؤں کے ساتھ بھی قائم تھا، ہر موقع پر انکی تعظیم و تکریم کرتا رہا، مولانا ضیاء الدین برنی ہندوؤں کو رسوا کرنے پر خوش ہوتے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ جب فیروز شاہ اپنے شاہی دورہ پر گورکھپور اور کھروسہ پہنچا، تو وہاں کے رایان اپنے مقدموں اور راناؤں کے ساتھ اس کے دربار میں آئے، فیروز شاہ نے ان کو شاہانہ نوازشوں سے نوازا، برنی کے الفاظ یہ ہیں

"رائے گورکھپور با خدمتیات خود تحریر گذرانیدند و از عواطف خسروا چتر و تاج و قبائے مکلل و مرصع و اسپان تنگ بست یافت چند مقدمات دیگر که در ولایت او بزرگ و دانا بودند باد جامہ پوشیدند و رائے کھروسہ نیز باندازہ ولایت خود خدمتیات گذرانید و با مقدمات ولایت خود جامہ یافت و کسوت مرحمت پوشید و رایان مذکور از سر اخلاص حلقہ بگوش کشیدند، و منقاد و مطیع درگاہ اعلیٰ شدند" (ص ۵۸۷ - ۵۸۸)

جزیہ | فیروز شاہ نے ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا، اس کو غیر اسلامی قانون تو نہیں کہا جا سکتا ہے، لیکن ہندوؤں کی نظر میں یہ رجعت پسندی سمجھی جاتی ہے، اور قابل مذمت بھی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں جزیہ کی نوعیت اور اصلیت کو اچھی طرح واضح نہیں کیا گیا، مولانا شبلی نے بیسویں صدی میں جزیہ کی حقیقت کو جس طرح سمجھایا ہے، اگر اس دور کے علماء بھی سمجھاتے رہتے، تو یہ ٹیکس اشتعال انگیز نہ سمجھا جاتا،

مولانا شبلی نے قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور فتوح البلدان کے حوالے سے

جزیہ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ بانیِ اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا، ان کو تحریر کے ذریعہ سے حسب ذیل حقوق دیئے (۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کریگا، تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائیگی (۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائیگا، (۳) جزیہ ان سے جاکر لیا جائیگا، اس کے لئے محصل کے پاس خود جانا نہیں پڑے گا (۴) ان کی جان محفوظ رہے گی (۵) ان کا مال محفوظ رہے گا (۶) ان کے قافلے اور کارواں (تجارت) محفوظ رہیں گے، (۷) ان کی زمین محفوظ رہے گی، (۸) تمام چیزیں جو ان کے قبضہ میں ہیں، بحال رہیں گی (۹) پادری، رہبان گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے، (۱۰) صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائیگا، (۱۱) ان سے عشر نہیں لیا جائیگا (۱۲) ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائیگی (۱۳) پہلے سے ان کا جو مذہب اور عقیدہ تھا، وہ بدلوایا نہیں جائیگا (۱۴) ان کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا، زائل نہیں کیا جائیگا، جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں یہ احکام ان کے لئے بھی شامل ہوں گے،

مولانا شبلی نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ان قوانین پر خلافت راشدہ کے زمانہ میں برابر عمل رہا، حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ ذمی ہوچکے (یعنی جن لوگوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا) ان کا خون ہمارا خون ہے، اور ان کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے، مولانا شبلی نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام نے جو انتظام قائم کیا اس کے رو سے ہر مسلمان خدمت کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے، لیکن غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں ان کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی ہے، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہیں ہے، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات

کے لئے راضی ہو سکتے ہیں، اس لئے مجبور ہے کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں
اسی معاوضہ کا نام جزیہ رکھا، اگر کسی موقع پر غیر قوم فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے
آمادہ ہونا گوارا کریں تو وہ جزیہ سے بری کر دیئے جائیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے، یحفظوا
و یمنعوا یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں، (مقالات
شبلی جلد اول مذہبی، ص ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۲۱، ۲۳۲)

جزیہ کی اس نوعیت کو سمجھنے کے بعد یہ ٹیکس قابلِ مذمت قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ تو
انسانی حقوق کا ضامن بن جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس وضاحت کے ساتھ جزیہ
کی اصلیت کو عام طور سے سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی، اسی لئے یہ شک و شبہہ کی نظر
سے دیکھا جاتا رہا، اس سلسلہ میں موجودہ دور کے ایک مورخ ایشوری ٹوپا کا حسب ذیل
تجزیہ بالکل صحیح ہے جس سے صحیح عقیدہ کا کوئی مسلمان بھی اختلاف نہیں کر سکتا ہے،

"جزیہ اس ٹیکس کو کہتے تھے، جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے اس خدمت
کے معاوضہ میں وصول کرتی کہ وہ ہندوؤں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی
حفاظت کرتی رہے، جزیہ لینے کے بعد ریاست ذمہ دار ہوتی ہے کہ کوئی ذمی کسی حیثیت
سے بھی نہ ستایا جائے، اور وہ بالکل محفوظ و مصئون زندگی بسر کرے، اس کو سرکاری
ملازمت حاصل کرنے کا پورا حق حاصل ہو، اور وہ مذہبی و معاشرتی مراسم کے ادا کرنے
میں بالکل آزاد ہو، جزیہ لینے کے بعد اسلامی ریاست ہر طرح سے ذمیوں کے جان
و مال کی نگرانی کرتی تھی، اور اسلامی فوج جنگ کے موقع پر اور دوسرے نازک موقعوں
میں ان کی پوری حفاظت کرتی تھی، اور ایسا کرنا اس کے مذہبی فریضہ میں داخل تھا،

ذمیوں سے جو جزیہ وصول کیا جاتا، وہ گویا اس خون کی قیمت ہوتی جو مسلمان ذمیوں کی مدافعت میں بہاتے تھے، اگر کوئی اسلامی ریاست ذمیوں کی حفاظت کرنے سے قاصر ہو جاتی تو اس کو جزیہ وصول کرنے کا بھی حق نہ رہتا، اسلامی تاریخوں میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب کوئی ریاست ذمیوں کی نگہبانی کرنے سے مجبور ہو گئی، تو جزیہ کی رقم ان کو واپس کر دی گئی، ذمیوں کو اپنی خواہش سے فوج میں داخل ہونے کا پورا حق حاصل تھا، لیکن جزیہ ادا کرنے کے بعد وہ جبری بھرتی سے مستثنیٰ کر دیئے جاتے تھے، لیکن اگر اپنی مرضی سے وہ فوج میں بھرتی ہو جاتے تو جزیہ معاف کر دیا جاتا، جزیہ ذمیوں کے بالغ مردوں سے لیا جاتا، جو جسمانی حیثیت سے تندرست اور دماغی اعتبار سے صحیح ہوتے، اور جزیہ کی رقم ادا کرنے کی استطاعت بھی رکھتے، جزیہ ادا کرنے اور لینے میں باہمی سمجھوتہ بھی ہو جاتا، پھر جزیہ متمول طبقہ سے ۴۸ درہم، متوسط لوگوں سے ۲۴ درہم اور غریبوں سے ۱۲ درہم لیا جاتا تھا، بوڑھے، عورتیں، فاترالعقل، فقیر، اندھے، اپاہج اور راہب جزیہ سے مستثنیٰ تھے، البتہ دولت مند اندھوں، اپاہجوں اور راہبوں سے لیا جاتا تھا، جزیہ نقد اور جنس دونوں میں ادا کیا جا سکتا تھا، مسلمان فقہاء سیاسی ضروریات کے مطابق جزیہ کے معانی و مطالب میں رد و بدل کرتے رہے، اور وہ جزیہ کی اصل غرض و غایت کو نظر انداز کر کے اس کو مسلم ریاست کے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرتے رہتے تاکہ غیر مسلم رعایا بالکل اختیار اور قابو میں رہے، اہل تحقیق کا خیال ہے کہ بعض فقہاء نے جزیہ کا لفظ استعمال کیا، قاسم الغازی نے کلام پاک سے ان مفسروں کی سخت نکتہ چینی کی ہے، جنھوں نے کلام پاک کی آیت ۹.۲۹ کی عجیب و غریب تفسیر کر کے فضول گوئی سے کام لیا ہے، اور ان آیات قرآنی کے متعصبانہ اور متشددانہ

معانی بتائے ہیں، قاسم الغازی کا خیال ہے کہ ان آیات قرآنی کا ہرگز یہ منشا نہیں، کہ ذمیوں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر ان کو گری ہوئی حالت میں رکھا جائے، اسلام کے کسی قانون نے اس تشدد کی اجازت نہیں دی ہے، اگر کسی نے یہ تشدد کیا ہے تو اس کی ذمہ داری فقہار پر ہے، ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ میں سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں اسی طرح داخل ہو سکتے تھے، جس طرح فیروز شاہ سے پہلے تو شاید ہندوؤں پر جزیہ لگایا بھی نہیں گیا، اس زمانہ کی تاریخی کتابوں میں جزیہ کا لفظ بہت کم استعمال ہوا ہے، اگر کہیں یہ عاید بھی کیا گیا تو اسلامی قانون کے مطابق اس پر عمل نہیں ہوا، کیونکہ خالص اسلامی طرز کی ریاست ہی قائم نہیں ہوئی (پائی ٹمکس ان ری موغل ٹائمس ص ۱۴۰- ۲۳۹)

فقہا کا اختلاف یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں جزیہ صرف چند حکمرانوں ہی کے زمانے میں مقرر رہا اور نہ اور مسلمان حکمرانوں نے خود طاق نسیاں پر رکھنا پسند کیا، جو ان کی رواداری کی دلیل ہے، پھر بھی یہ اشتعال انگیز بنا رہا، اس اشتعال انگیزی میں زیادہ تر فقہار کا ہاتھ رہا، اسلامی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علمار وفقہا بہت کم کسی مسئلہ پر متفق ہونا پسند کرتے ہیں، اسی لئے ان کی اپنی اپنی تاویلوں سے بہت سے مسائل کی نوعیت بدل کر رہ جاتی ہے، چونکہ وہ بہت کم کسی مسئلہ پر متفق ہوتے، اس لئے مختلف زمانے میں فقہی مسائل کی تعبیریں بھی مختلف ہوتی رہتیں، مثلاً ضیار الدین برنی کسی عالم یا کسی محدث کا قول نقل کر کے غیر مسلم رعایا کی زاری، لااعتباری اور بے مقداری کی تلقین کرتے رہے، (برنی ص ۲۹۰) سندھ کے فاتح محمد بن قاسم کو حجاج نے جو ہدایت دی تھی، اس میں تو غیر مسلموں کے سا

خواری اور رسوائی کی تعلیم نہ تھی، کچھ ایسے علماء بھی پیدا ہوتے رہے، جو بڑی جرأت کے ساتھ کسی قسم کے ناروا سلوک کے خلاف احتجاج کرتے رہے، مثلاً سکندر لودی کے زمانہ میں کنشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے، اور اشنان کرتے تھے، سکندر لودی نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کرکے اس اجتماع کو روک دے، اس زمانہ کے ایک عالم مولانا عبداللہ سے استفسار کیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کا روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں، سکندر کو یہ جواب پسند نہ آیا، وہ سمجھا کہ طرفداری کا فتویٰ ہے، اپنی برہمی کا اظہار کیا، لیکن انھوں نے بڑی جرأت اور صفائی سے فرمایا کہ میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کردیا، اگر شریعت کی پروا نہیں، تو پھر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اس جواب کے بعد سکندر لودی کو دبنا پڑا (واقعات مشتاقی ص ۱۹)

[دل آزاری سے پرہیز] ہندوؤں کے خلاف مولانا ضیاء الدین برنی کی مخرورانہ مزاجی اس لحاظ سے بھی تعجب خیز ہے، کہ وہ خانوادۂ چشتیہ سے منسلک ہوکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے، چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں اور تمام صوفیائے کرام نے یہاں کے باشندوں کے دلوں کے تسخیر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، پھر ان کی تعلیمات بھی ایسی رہیں کہ ان کے یہاں دل آزاری اور مردم بیزاری کی گنجایش ہی نہیں تھی، ہندوستان میں تصوف پر سب سے پہلی کتاب کشف المحجوب لکھی گئی، جو تصوف کی انجیل سمجھی جاتی ہے، اس میں ایک صوفی کی تعلیم و تلقین کے لئے یہ ہدایت لکھی گئی ہے، کہ جب ایک صوفی کو گدڑی پہنائی جائے، تو اس سے ایک سال خلق کی خدمت ضرور لی جائے، خلق کی خدمت یہ ہے کہ وہ سب کو بلا تمیز اپنے سے بہتر جانتا ہو، اور ان کی خدمت اپنے لئے واجب سمجھتا ہو، مگر اپنی خدمت کا گمان مطلق نہ کرتا

ہو، (بزم صوفیہ از خاکسار مقالہ نگار ص ۲۰) حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیم یہ تھی کہ کہ راہ سلوک میں جو گناہ کبیرہ ہیں، ان میں ایک مردم آزاری بھی ہے (بزم صوفیہ ص۲۱) حضرت فرید الدین گنج شکر عبادت و ریاضت کے بعد صرف خلق اللہ کی خدمت ہی کی فکر زیادہ رکھتے، کوئی سرکاری عہدہ دار ظلم کرتا تو اس کو ظلم سے منع کرتے، بے قصوروں کو سزا سے بچاتے، کوئی فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا، تو اس کو صحیح راستہ پر لگاتے، اس کے اخلاق کو درست کرنے کی کوشش کرتے (ایضاً ص ۱۷۰۔ ۱۶۹) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، (ایضاً ص ۱۸۰) وہ فرماتے کہ قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ نہ ہوگی جتنی دلداری، اور دل خوش کرنے کی (سیر الاولیاء ص ۴۲۸) ان کے مرشد خواجہ فرید الدین گنج شکر نے ان کو اپنے یہاں سے رخصت کر کے دہلی بھیجا، تو فرمایا تم ایک سایہ دار درخت ہو، جس کے چھاؤں میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، خواجگان چشت کی یہی کوشش رہی کہ وہ اپنے اخلاص کی گھنی چھاؤں میں اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کو پناہ دیتے رہیں، (سیر الاولیاء ص۴۶) حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تعلیم یہ تھی کہ بادشاہ کے لئے نفل نماز اور نفل روزے سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ بھوکوں کو پیٹ بھر کھلائے، طرح طرح کے کپڑے سلوائے ننگوں کو پہنائے، اجڑے دلوں کو آباد کرے، حاجتمندوں کی دستگیری کرے ان کا قول تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے، (مکتوبات سہ صدی ص ۴۸۹) حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کی تعلیم یہ تھی کہ رعیت پر ظلم کرنے سے جہانداری اور شہریاری کو نقصان پہنچتا ہے (لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۶۸۔ ۱۶۷) ان کی یہ بھی تلقین تھی کہ رعایا کی نگہبانی ہی میں

ملک کے مصالح اور دربار کی بہبود پنہاں رہتی ہے (ایضاً ص ۲۱۴) حضرت خواجہ سید محمد گیسودراز نے گلبرگہ کے سلطان احمد شاہ بہمنی کو یہ تعلیم دی کہ وہ فقیروں، کمزوروں، یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں اور بیواؤں کی پوری خبرگیری کرے، ان کو برباد ہونے سے بچالینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں (خاتمہ ص ۱۰۹-۱۸۷)

عدل نوازی ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کا سب سے نمایاں شیوہ یہ رہا تھا کہ وہ عدل و انصاف پر پورا زور دیتے رہے۔ وہ فاسق، فاجر اور شرابی ہونے کا الزام تو گوارا کر لیتے، لیکن ظالم، غیر عادل، اور غیر منصف ہونے کا الزام کسی طرح پسند نہ کرتے۔ فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک عدل پر حضرت عمرؓ کی تقلید کرتا تھا التمش نے اعلان کر رکھا تھا کہ جس کسی پر ظلم ہو، وہ اس کے محل کے عدل و انصاف کی لگی ہوئی زنجیر کو ہلائے تاکہ وہ اس کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی، (فوائد السالکین ص ۷۹) غیاث الدین بلبن کے بارے میں مورخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ داد و دہش اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں، اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا، اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لیتا، اس کے دل کو آرام نہ پہنچتا (برنی ص ۴۰) اس کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، تاریخ مبارک شاہی، اور ملا عبد القادر بدایونی دونوں میں ہے، کہ سلطان محمد تغلق نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، کہ جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم اس کے فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کی گردن پر ہوگا، اس لیے مقتولوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی۔ (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۰)

منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۳۲

ظاہر ہے کہ خلق اللہ کی خدمت، مردم آزاری، رعیت پر ظلم کرنے سے پرہیز بھوکوں ننگوں اور حاجتمندوں کی دست گیری کرنے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا دائرہ ہوتا، اور عدل و انصاف میں تو مذہب، ذات پات کی کوئی تفریق نہ کی جاتی، حضرت شرف الدین یحیٰ منیریؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس حدیث کی پوری تفصیل لکھ بھیجی، جس میں ابو جہل کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نصرانی کی حمایت کی، ابو جہل نے ایک نصرانی کا مال غصب کر لیا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس وقت فریاد کی جب آپ دوپہر کی سخت گرمی میں قیلولہ فرما رہے تھے، آپ اسی وقت نصرانی کے ساتھ ابوجہل کے مکان پر تشریف لے گئے، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس کو غصہ آیا، مگر آپ اس وقت تک اس کے دروازے سے نہیں ہٹے جب تک نصرانی کا سارا مال ابوجہل نے واپس نہیں کیا، نصرانی کو اس کا ایک تھیلا نہ ملا تو ابوجہل نے اس سے ایک بہتر تھیلا لا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصرانی سے پوچھا کہ یہ تھیلا بہتر ہے یا وہ بہتر تھا، تو اس نے کہا یہ بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہ کہتے کہ وہ بہتر تھا تو میں اس وقت تک واپس نہ جاتا، جب تک میں قیمت لیکر تمہارے حوالہ نہ کرتا (مکتوبات سہ صدی ص ۲۹۳-۲۹۴)

یہ حدیث اس بات کی کھلی تلقین ہے، کہ اسلام میں عدل و انصاف کرنے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق نہ ہو، مظلوم کسی مذہب یا فرقہ کا ہو، اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے، حضرت شرف الدین یحیٰ منیریؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیثیں بھی لکھ بھیجی تھیں، کہ جو کوئی کسی مظلوم کو دیکھتا ہے، اور وہ مظلوم

اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا، تو قبر کے اندر اسکو آگ کے ستر کوڑے مارے جائیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ خوش رہے کہ سلطان فیروز شاہ کی ذات مظلوموں اور درماندوں کی جائے پناہ ہے، (سہ صدی مکتوبات ص ۴۰۳ و ۴۰۴)

تسخیر قلوب | تمام صوفیائے کرام مسلمان فرماں رواؤں کو عدل و انصاف کی تلقین کرتے رہے، اور پھر وہ خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جس پاکیزہ اور بلند اخلاق سے پیش آتے رہے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی سے متاثر ہوکر یہاں کے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے، جس کی ایک علیحدہ داستان ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ جب سلاطین تخت و تاج کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، اور یہ تسخیر ان کے روادارانہ زہد، عبادت، تفکر، اخلاص اور محبت کے ذریعہ سے ہو رہی تھی، جس کو اس زمانہ کے اہلِ قلم پوری تفصیل سے قلم بند کر دیتے، تو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کچھ اور ہی نظر آتی، ہندوؤں میں جو ذات پات کی تفریق تھی اس سے ان کا ایک بڑا طبقہ کچھ ایسا نالاں تھا کہ جب ان صوفیائے کرام نے مساوات، رواداری، حقانیت اور انسانیت نوازی کی تعلیم دیکر اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے تو یہاں کے ان لوگوں کی نگاہوں میں جن کو یہاں کے سماجی نظام نے کچل رکھا تھا، اسلام کی معاشرتی مذہبی اور روحانی جاذبیت کی نشانیاں گذرنے لگیں، جس کی بعد وہ اسلام کی طرف خواہ مخواہ مائل ہونے لگے،

امیر خسرو کی رواداری | چشتیہ سلسلہ کے روادارانہ تعلیمات کی روشن مثالیں حضرت

امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کے یہاں ملتی ہیں، دونوں حضرات خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقہ بیعت میں داخل تھے، پہلے کہا گیا ہے، کہ تعجب تو یہ ہے، کہ مولانا ضیاء الدین برنی بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے، مگر انھوں نے اپنی محرود المزاجی کی وجہ سے جو تحریریں لکھیں، اس سے یقیناً اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نقصان پہنچا، لیکن ان کے زہر کا تریاق حضرت امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کی تحریروں میں ملتا ہے، جو برنی ہی کے زمانہ میں نیک نفسی، فراخ دلی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کا درس دے رہے تھے، امیر خسرو ہی کی روایت ہے کہ ایک مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ جارہا تھا کہ راستہ میں ایک برہمن ملا، جو سومنات جارہا تھا، یہ برہمن اپنے عقیدہ کی شدت میں زمین پر لیٹ لیٹ کر ناپتا جاتا، حاجی نے برہمن سے پوچھا دوست تم کہاں جارہے ہو، برہمن نے کہا میں تو کئی سال سے اسی طرح سفر کر رہا ہوں، حاجی نے کہا خدا نے تم کو دو پاؤں دیئے ہیں، تو چلنے کے بجائے اپنے سینہ کے بل کیوں رینگ رہے ہو، برہمن نے جواب دیا جب سے میں نے اپنی جان مورتی کے حوالے کر دی ہے، اسی طرح سینہ کے بل رینگ رہا ہوں (مثنوی مطلع الانوار ص ۸۸-۸۷) امیر خسرو لکھتے ہیں کہ ہندو بت پرستوں پر طنز کیا جاتا ہے، لیکن ان کے عقیدہ میں جو اخلاص ہے، اس سے سبق لیا جا سکتا ہے اسی کو اپنے ایک شعر میں اس طرح کہتے ہیں،

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری ہم زوے آموز پرستش گری

وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں لکھتے ہیں کہ ایک آتش پرست ہندو سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے، اور اس کے لئے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل

ہوتی ہے، امیر خسرو نے آگ کی پرستش کی تو نہیں لیکن اس آتش پرست کے جذبہ کی قدر کرنے کا مشورہ دیا ہے، (مثنوی دولرانی خضر خاں ص ۱۹۲-۱۹۵)

امیر خسرو کا اپنا مذہب تو اسلام تھا، اس لئے ہندومت کو اس پر کسی طرح ترجیح دینا پسند نہ کرتے، لیکن اپنے ہم وطن بھائیوں کی دلجوئی اور دلداری کی خاطر ان کے مذہب کو دنیا کے اور تمام مذاہب سے بہتر سمجھنے کے لئے تیار ہو گئے، ہندو مذہب کو اپنے دلائل سے ثنویہ، عیسائیت، قوم مجسم، ستارہ پرست، عنصریوں، قوم مشبہہ اور قوم پارسی سے بہتر قرار دیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندو پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، اس کی اطاعت کے منکر نہیں، ان چیزوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے آباء و اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں، امیر خسرو البیرونی کی طرح ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف رہے۔ لکھتے ہیں۔ کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی وحدت، اس کی ہستی، اور قدم کے قائل ہیں، اس کی قدرت ایجاد، اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل، مختار اور عالم جزو کل کے قائل ہیں، امیر خسرو نے یہ باتیں اپنی مثنوی نہ سپہر (ص ۱۶۴) میں اس طرح لکھی ہیں،

معترف وحدت و ہستی و قدم	قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم
رازق ہر یہ ہنر و بے ہنرے	عمر بر د جاں دہ ہر جانورے
خالق افعال بہ نیکی و بدی	حکمت و حکمش ازلی و ابدی
فاعل مختار و مجازی بہ عمل	عالم ہر کلی و جزوی ز ازل

ورہمہ وا گشت بہ تحقیق معتبر نے چو بسے طائفہ بر کذب مصر

ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی امیر خسرو متاثر ہوئے، کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے، لیکن یہ بڑی کارگذاری ہے، اگر ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہو تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کریں،

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں لیک چو بس کار بزرگ بہ ہیں

گر بہ شریعت بود ایں نوع روا جاں بدہند اہل سعادت سوا

امیر خسرو تو ہندوؤں کی ہر چیز کو محبوب رکھتے، لکھتے ہیں کہ دانش و معانی ہندوستان میں اندازہ سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے، لیکن ہندوستان اس میں بھی تہی مایہ نہیں، یہاں منطق بھی ہے، اور نجوم بھی، اور علم کلام بھی، البتہ ہندو فقہ سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ طبیعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں وغیرہ (مثنوی نہ سپہر ص ۱۶۱-۶۲) سنسکرت زبان کی تعریف تو بار بار کی ہے، لکھتے ہیں عربی کے علاوہ اس کو تمام زبانوں پر فوقیت حاصل ہے، (مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۴۳-۴۲)

پھر ہندوستان کی آب و ہوا، پھولوں، میووں، کپڑوں، جانوروں، پان، یہاں عورتوں کے حسن کی تعریف میں ان کا قلم بڑا رواں دواں رہا ہے، وہ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پجاری ہو سکتے ہیں، یہاں کے مغ بچوں کو دیکھ کر خسرو کہتے ہیں کہ وہ خود خراب اور سرمست

ہوگئے ہیں، (قران السعدین ص ۳۷ - ۱۳۶)

خورشید پرست شد مسلماں زیں ہندوگان شوخ و سادہ

کردند مرا خراب و سرمست ایں مغ بچگان تاک زادہ

مزید تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں"، مطالعہ کی جاسکتی ہے،

امیر خسرو کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیار (المتوفی ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء) تھے جن کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین نوح تھے، حضرت خواجہ ان کو بہت محبوب رکھتے تھے، ان کا انتقال عین شباب میں ہوگیا، حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک ان پر سکوت طاری رہی، اس سے امیر خسرو بھی مغموم رہتے تھے، وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، اس زمانہ میں ہندوؤں کا بسنت کا میلہ لگا، وہ دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے، اور مست ہوکر ترانے الاپ رہے تھے، امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہوگئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے، اور پگڑی کو کج کرکے مستانہ شان پیدا کی، جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر مسکرانے لگے، پھر تو امیر خسرو کا کام بن گیا، اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوال کو لیکر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لئے، اشعار پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے، وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے، ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے،

اشک ریز آمدست ابر بہار ساقیا گل بریز و بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے؛

عرب یار توری بسنت منائی

یہ پڑھا جاتا، تو بڑا اثر پیدا ہوتا، رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں پندرہ دن تک بسنت کا میلہ رہنے لگا، دوسری جگہوں پر بھی مسلمان بسنت منانے لگے، بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف اس طرح بھی منسوب ہے،

حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال

بائیس کھاجہ مل بن بن آیو تاس حضرت رسول صاحب جمال

حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال

عرب یار تیرو بسنت منایو سدا رکھیئے لال گلال

حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

خواجہ نظام الدین اور ان کی فراخدلی | امیر خسرو کو یہ رواداری اور فراخدلی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی تربیت اور صحبت ہی میں حاصل ہوئی جن کے یہاں خلق اللہ کی ایذا رسانی اور دل آزاری سب سے بڑا اخلاقی گناہ اور جرم تھا، حضرت خواجہ خود بھی ہندوؤں کی بعض باتوں کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے، ایک روز وہ اپنی خانقاہ سے باہر امیر خسرو کے ساتھ نکلے تو جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، ان کو دیکھ کر حضرت خواجہ نے فرمایا،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

(تزک جہانگیری ص ۸۲)

حضرت خواجہ برہمنوں کی بعض خوبیوں کے بھی معترف رہے، ان کے چہیتے خلیفہ امیر حسن دہلوی (المتوفی ۱۳۳۶ء) ان کے ملفوظات قلمبند کیا کرتے تھے، جو فوائد الفواد کے نام سے ابتک بہت مشہور اور مقبول ہے، وہ بھی امیر خسرو کی طرح شاہی دربار سے وابستہ رہے، وہ لکھتے ہیں، کہ ایک بار ان کو شاہی دربار سے کچھ دنوں تک تنخواہ نہیں ملی جس سے وہ پریشان تھے، حضرت خواجہ کو ان کی پریشانی معلوم ہوئی تو امیر حسن کو یہ شکایت سنائی، کہ ایک شہر میں ایک برہمن رہتا تھا، اس کے پاس بڑی دولت تھی، لیکن اس شہر کے حاکم نے اس پر جرمانہ کرکے اس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا، جس سے وہ تباہ و برباد ہوکر بہت ہی مفلس ہوگیا، ایک روز وہ کہیں جا رہا تھا کہ اس کا ایک دوست راستہ میں ملا، اس نے برہمن سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے، برہمن نے جواب دیا، اچھا ہے، اور خوش ہوں، دوست نے کہا کہ تمہاری چیزیں تو تم سے لے لی گئیں، اب تم خوش کیسے رہ سکتے ہو، برہمن نے جواب دیا میرا جنیو تو میرے پاس ہے،

زنار من با من است

حضرت خواجہ نے یہ حکایت سناکر امیر حسن سے کہا "تم نے سنا" امیر حسن نے جواب دیا "جی ہاں، اس حکایت سے مجھ کو بڑی باطنی تسکین اور تسلی ہوئی، (فوائد الفواد ص ۲۴۴)

حسن دہلوی کی رواداری امیر حسن دہلوی کے دیوان میں بہت سی ایسی منظوم حکایتیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو رواداری اور فراخدلی کی تعلیم دیتے رہے ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ ایک کشتی پر ایک غیر مسلم (گبر) اور ننانوے "مسلمان سوار تھے، یکایک کشتی دریا میں ڈوبنے لگی، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو خداوند تعالیٰ کے نور سے آشنا ہیں، لیکن کسی بیگانہ کی وجہ سے یہ کشتی ڈوب رہی ہے، اس لئے اس گبر کو دریا میں ڈال کر

کشتی کو محفوظ کر لینا چاہئے، گبر نے یہ سنا تو نا امید ہو کر ایک آہ کھینچی، اور بولا کہ ایک گبر کی بدبختی کی تاثیر سے بلا آ رہی ہے، اور کشتی ڈوب رہی ہے، تو پھر تا نوے مومنوں کی پاکی سے یہ محفوظ کیوں نہیں ہے، ان میں ایک دانا بزرگ بھی تھے، گبر کی یہ دردناک بات سن کر متاثر ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ کی رضا اور دستگیری پر بھروسہ کرنا چاہئے، اس کے بعد کشتی سلامت رہی، آخر میں امیر حسن لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ملک بے نیازی میں سرانداز ی ہی میں سرافرازی ہے اور دوسروں کے فسق پر نظر رکھنا درست نہیں، ہر حال میں خدا سے خیر اور ظلمت کے چراغ کی روشنی میں فضل الٰہی کی امید رکھنی چاہئے، امیر حسن دہلوی نے اس واقعہ کو اس طرح منظوم کیا ہے، (دیوان حسن سنجری ص ۸۲-۱۸۵)

شنیدم کشتیِ در موج گاہے ۔۔۔ ہمی شد غرقہ نے رود نہ راہے
در آں کشتی درا غلب اہلِ ایماں ۔۔۔ یکے گبر و نبود نہ تن مسلماں
مسلمانان بر آشفتند کایں کار ۔۔۔ ہم از ہم صحبتاں آمد پدیدار
چو نور آشنائی ہست بر ما ۔۔۔ بلا زیں مرد بیگانست بر ما
بدریا افگنیم ایں گبر را زود ۔۔۔ خلاصِ ما نخواہد جز چنیں بود
چو بشنید ایں سخن آں مرد گمراہ ۔۔۔ برآورد از دل نومید خود آہ
پس آنگہ با مسلماناں چنیں رفت ۔۔۔ کہ خار از راہ خود نے خود تواں رفت
گر از تاثیر شومی یکے گبر ۔۔۔ بلا خیزد چہ تدبیر است جز صبر
چرا صدق نود نہ مومن پاک ۔۔۔ اثر نہ دہد درین حالِ خطرناک
در آنجا پیر دانا بود مردے ۔۔۔ رسید اندر دلش زیں حرف دردے

بیا دل گفت بگذار دیں رائے — بیفشار ید در راہ رضا پائے
ببیں در جود دستِ ناکس و کس — دریں جا دست گیری خدا بس
دریں بودند کآوازے بر آمد — کہ اینک روز محنت ہا سر آمد
زغرقاب آمد ایں کشتی بپایاب — علامت را ہیا گشت اسباب
حسن چوں ملک بے نیاز بست — سر اندازی دریں رہ سرفرازیست
صلاح خود ببیں و فسق غیرے — بہر حال از خدا می خواہ خیرے
خداوندا بحالِ ما نظر کن — دریں ظلمت چراغ فضل بر کن
زما خود جز سیاہی نزاید — تو خود کن کز کریمی تو آید

حسن دہلوی نے ایک غیر مسلم کی قسمت و فیاضی کا حال بہت اچھوتے انداز میں لکھا ہے، یہ غیر مسلم ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنے میں بہت مشہور تھا، ایک مسکین اس کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ میدان جنگ میں زخمی ہو کر دم توڑ رہا تھا، مسکین نے اس کے پاس آکر اپنا حال بتایا تو اس نے کہا اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا، اس کے دانتوں میں سونے کی ڈوری نکال کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، یہ لکھ کر حسن دہلوی کہتے ہیں، (ایضاً ص ۵۸۳)

سخن در ہمت است و در افشانی — حساب کفر و ایماں را تو دانی
اگر فاسق سخاے ورزد لے دوست — حبیب اللہ طراز دولت اوست
دگر زاہد کند با بخل پیوند — خدایش دشمن و خلقش صد چند

شیخ احمد عبد الحق کی روادارانہ حکایت

مذہبی رواداری کی ایک اچھی مثال پنڈوہ (بنگال) کے ایک مسلمان حاکم کے یہاں بھی ملتی ہے، جس کو شیخ عبد القدوس گنگوہی نے شیخ

احمد عبد الحق کے ملفوظات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، شیخ احمد عبد الحق راہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے سلسلہ میں بنگال جاکر پنڈوہ میں مقیم ہوئے، تو اس زمانہ میں وہاں کا حاکم ایک رات بھیس بدل کر شہر میں نکلا، ایک جگہ قلندروں کی ایک جماعت کھانا کھا رہی تھی، حاکم ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پھٹکارا کہ تم ہمارے کھانے میں نظر لگا رہے ہو، اس نے اپنی عزت کا ذکر کیا تو وہ اور برہم ہوئے، اور جب تک اس کو اپنے سامنے سے ہٹا نہ لیا، خاموش نہیں ہوئے، حاکم وہاں سے ایک ایسی جگہ پہنچا، جہاں کچھ جوگی رہتے تھے، وہ لوگ بھی کھانا کھا رہے تھے، آپس میں برابر تقسیم کرنے لگے، تو ایک حصہ حاکم کو بھی دیا، حاکم نے کہا میں ایک بیگانہ آدمی ہوں، میرے لئے اس کا حصہ کیوں لگاتے ہو، جوگی بولے ہمارا طریقہ یہی ہے، اگر کتا موجود ہوتا ہے تو ہم اس کو بھی برابر کا حصہ دیتے ہیں، تم تو آدمی ہو، تم کو کیسے نہ دیں، حاکم یہ سن کر بہت متاثر ہوا، صبح کو اس نے حکم دیا کہ سارے قلندر اور درویش شہر بدر کردیئے جائیں، جوگی جیسے تھے ویسے رہنے دئے گئے، شہر میں ہنگامہ برپا ہوا، شیخ عبد الحق شہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، وہ حاکم کی ڈیوڑھی پر جاکر بیٹھ گئے، کسی نے ان کو وہاں سے نہیں ہٹایا، تو یہ کہہ کر اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے کہ یہ حاکم درویشوں کو نہیں بلکہ بے خبروں کو شہر بدر کر رہا ہے، (انوار العیون ص ۲۵-۲۴)

بہمنی خاندان کے بانی کی حکایت

رواداری کی ایک بہت اچھی مثال دکن کے بہمنی سلطنت کے بانی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی (المتوفی ۷۵۹ھ) کے یہاں بھی ملتی ہے، اس کی ابتدائی زندگی بہت ہی عسرت میں گذری، وہ دہلی میں محمد تغلق کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کے ایک منجم گنگو برہمن کا ملازم تھا، اپنی تنگ دستی سے پریشان

رہتا، ایک دن اس نے گنگو برہمن سے اپنی غربت کا ذکر کیا، تو گنگو برہمن نے ہمدردی میں نواحِ دہلی میں اس کو اپنی بنجر زمین کا ایک ٹکڑا دیا، ایک جوڑی بیل اور دو مزدوروں کا بھی انتظام کردیا، تاکہ وہ اس زمین پر کھیتی کرکے اپنا پیٹ پال سکے، ایک دن اسکے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ زمین کے اندر سے ایک برتن نکلا جسمیں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کی اشرفیاں تھیں، حسن اپنی ایمانداری کی وجہ سے یہ گوارا نہ کرسکا کہ آقا کی دی ہوئی زمین میں خیانت کرے، اس نے یہ ساری دولت گنگو برہمن کے سامنے لیجاکر رکھدی، گنگو نے حسن کی ایمانداری کا ذکر شہزادہ محمد تغلق سے کیا، اس نے اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کو اس کی خبر دی، سلطان غیاث الدین تغلق نے حسن کو اپنے حضور میں طلب کیا اور شاہی نوازشوں کے ساتھ اپنے امیروں کے زمرہ میں شامل کرلیا (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۷۴) ایک دن گنگو برہمن نے حسن سے کہا کہ مجھ کو تمہاری قسمت کے زائچہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑے اقبالمند ہوگے خدا کی مدد اور عنایت سے کسی بلند رتبہ پر پہنچ جاؤگے، اس بات کا عہد کرو کہ اگر خدا تم کو کسی بڑے مرتبہ پر پہنچادے، تو میرا نام بھی اپنے نام کا جزو بنا لینا تاکہ تمہارے اقبال کی بدولت میں بھی دنیا میں زندہ رہ سکوں، دوسرے یہ کہ اپنے خزانہ میں مجھ کو اور میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا، حسن نے اپنے محسن کی دونوں باتیں منظور کرلیں، اور کوئی بڑا عہدہ پانے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ گنگو لکھنے لگا، وہ دکن میں بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد بڑا کامیاب حکمراں اور فاتح ثابت ہوا، ایک بار کسی نے اس سے پوچھا آپ نے اتنی بڑی سلطنت کیسے حاصل کرلی اور کم مدت میں اتنی وسعت کیسے دی، اور دوسرے حکمرانوں اور رعایا کو اپنا مطیع کیسے بنایا، اس نے جواب دیا، کہ پہلے

تو میں نے مروت کو اپنا اصول بنایا، خواص و عوام سے ہمیشہ مروت سے پیش آتا رہا، دوسرے یہ کہ کبھی بخل سے کام نہیں لیا، سخاوت میں دوست اور دشمن کی تفریق نہیں کی، ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، ان ہی دو باتوں کی وجہ سے سب ہی میرے مخلص ہمدرد اور مطیع بنتے گئے" (تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۲۸۱)

علمی رواداری علمی رواداریاں تو ملک کے مختلف گوشوں میں برابر جاری رہیں، مثلاً بنگال میں بنگالی زبان ضرور بولی جاتی تھی، لیکن راماین اور مہابھارت جیسے کلاسیکل لٹریچر سے ان کی زبان بیگانہ تھی، مسلمانوں کی حکومت وہاں قائم ہوئی، تو انھوں نے نہ صرف بنگالی زبان سیکھی، بلکہ اس کو باوزن بنانے کی پوری کوشش کی، سلطان ناصر شاہ (۱۲۸۲ - ۱۳۲۵) بنگالی زبان کا بڑا مربی تھا، شاعر اعظم ودیاپتی نے اپنی ایک نظم اس کے نام معنون کرکے اس کی شہرت کو باقی رکھا ہے، اسی کے حکم سے مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ہوا، سلطان حسین شاہ نے مالادھر باسو کو بھاگوت پران کے بنگالی ترجمہ کے لئے مقرر کیا، حسین شاہ کے سپہ سالار پرگل کے حکم سے گوندرائے پرمیشور نے مہابھارت کا دوسرا ترجمہ شروع کیا، جسے سری کرن نندی نے آگے بڑھایا، (پروڈ ونشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ دی محمڈن سپرمیسی ازان، ان لاس ۱۱۸ - ۱۰۷) آگے چل کر تو بنگالی زبان مسلمانوں کی مادری زبان ہوگئی، اور انھوں نے اس میں بیشمار کتابیں لکھ

صوفیائے کرام نے بھی ہندوستان کی تسخیر قلوب کے لئے یہاں کی زبانیں سیکھیں اور ان میں دوہے کہے، حضرت فریدالدین گنج شکر (ف ۱۲۶۵ء) کے پنجابی اشعار ابو علی قلندر پانی پتی (ف ۱۳۲۳ء) حضرت شرف الدین یحییٰ منیری (ف ۱۳۸۰ء) حضرت عبدالحق ردولوی (ف ۱۴۳۳ء) اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی (ف ۱۵۳۷ء

شیخ برنادی (ف) کے ہندی دوہے اور اشعار آج کل کی ہندی زبان کے محققوں کے لئے لائق توجہ ہو گئے ہیں، دکن میں خواجہ گیسو دراز (ف ۸۲۴ھ) نے معراج العاشقین اور شاہ میران شمس العشاق (ف ۹۰۲ھ) نے خوش نامہ، خوش نغز اور شہادۃ الحقیقۃ وغیرہ دکنی زبان میں لکھ کر یہ صور پھونکا کہ مسلمان فارسی زبان چھوڑ کر یہاں کی ملکی زبان کو اپنائیں صوفیائے کرام نے یہاں کے باشندوں سے قریب تر ہونے کے لئے فارسی اور عربی زبانوں کو چھوڑ کر جس طرح ان کی زبان اختیار کی اور اس سے اردو کی جو نشو و نما ہوئی، وہ نہ صرف رواداری بلکہ ہندوستان کی مذہبی اور لسانی تاریخ کا مستقل باب بن گئی ہے،

سلطان زین العابدین کی رواداری

کشمیر میں سلطان زین العابدین (۸۲۰ھ - ۸۷۴ھ) کو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا، اس نے اپنی سیاسی رواداری کے ساتھ علمی بے تعصبی کی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں، اس کو سنسکرت کے فضلار میں جون راج اور سری ور پر بڑا اعتماد تھا، ان دونوں نے اسی کے ایماء سے سنسکرت میں کشمیر کی تاریخیں لکھیں، سلطان کا ایک اور درباری بودھ بھٹ ویدوں کا عالم تھا، اس نے کشمیری نظم میں ایک ڈراما جین پرکاش لکھا، جس میں اپنے آقا کے دور حکومت کی تفصیل لکھی ہے، ایک اور شاعر سوم پنڈت نے اپنی کشمیری نظم جین چرت میں سلطان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے، ایک اور مصنف بھٹ اوتار نے جین ولاس لکھی، جس میں سلطان کے مقولے ہیں، سلطان نے ایک دار الترجمہ بھی قائم کر رکھا تھا جس میں فارسی کی کتابیں سنسکرت میں اور سنسکرت کی فارسی میں ترجمہ ہوتی تھیں، اسی سلسلہ میں سری ور نے جامی کی تصنیف یوسف زلیخا کا ترجمہ سنسکرت میں کیا، اور

اس کا نام کتھا کوتک رکھا، ملا احمد سنسکرت اور فارسی کے عالم تھے، انھوں نے سلطان کے حکم سے مہابھارت اور کلہن کی تصنیف راج ترنگنی میں سلطان زین العابدین کے عہد تک کے حالات کا اضافہ کیا، اس کے بعد اس کے شاگرد سری ور نے اس میں مزید اضافہ کیا تھا، اور اس کا نام جین راج ترنگنی رکھا، جون راج اور سری ور دونوں سلطان زین العابدین کے دربار سے وابستہ تھے، سری سلطان کو والمیکی کی برہم درشن اور اس کے ساتھ سمتھا پڑھ کر سناتا، اور ان کی شرحیں بھی کرتا جاتا، اسی طرح پنڈت آکر سلطان کو شاستر بھی سنایا کرتے تھے (تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۴ و کشمیر سلاطین کے عہد میں از ڈاکٹر محب الحسن باب پنجم) فرشتہ نے اپنی تاریخ میں سلطان کی سیاسی رواداریوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، جس کو مختصر طریقہ پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ وہ خود علوم و فنون کا ماہر تھا، اس لئے اس کی مجلس مسلمان اور ہندو فضلاء سے معمور رہتی تھی وہ عمارتوں کی تعمیر، زراعت کی ترقی اور نہروں کے جاری کرنے میں مصروف رہتا، اس نے ایک عام حکم جاری کر رکھا تھا کہ اس کے ملک میں جس شخص کا مال چوری ہو جائے، اس کا تاوان قریات کے رئیس ادا کریں، اس طرح چوری اس کی سلطنت میں بالکل ختم ہو گئی تھی ہشیو دیو بھٹ کے زمانہ سے جو بری رسمیں ملک میں جاری تھیں ان کو بالکل ختم کر دیا، نرخ کا اندراج جیسا اس کے زمانہ میں ہوا پہلے کبھی نہیں ہوا، اس نے اپنے قواعد و ضوابط تانبے کی تختیوں پر لکھوا کر انھیں ہر شہر اور گاؤں میں نصب کرا دیا، جس سے ظلم کا خاتمہ ہو گیا، ان تختیوں پر یہ لکھا ہوتا کہ جو شخص ان قوانین پر عمل نہ کرے اس پر خدا کی لعنت ہو، سلطان کے یہاں ایک حاذق طبیب سری بھٹ نامی تھا، وہ اس پر بڑا اعتماد رکھتا تھا، اس کے کہنے پر سلطان نے ان برہمنوں کو جو سکندر شاہ

کے عہد حکومت میں سیہ بت (شودیو) کے مظالم کی وجہ سے جلاوطن ہو گئے، دور دراز مقامات سے بلایا، اور ان کی املاک واپس کر دیں، ہندوؤں کے مندروں میں پوجا کے اوقات مقرر کئے، جزیہ کا حکم منسوخ کر دیا، گاؤکشی ختم کر دی، برہمنوں اور ہندو قاضیوں کو طلب کر کے ان سے عہد لیا کہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولیں گے، اور جو کچھ ان کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس کے خلاف کچھ نہ کریں گے، سلطان نے پیشانی پر قشقہ لگانا، ستی ہونا وغیرہ جو سکندر شاہ کے عہد میں ختم ہو گئے تھے، از سر نو جاری کیا، مِیْن کُش، جرمانے اور دوسرے مصادرات کی رقمیں جو شقدار رعایا سے وصول کرتے تھے، بالکل بند کر دیئے، اس نے حکم دیا کہ جو سوداگر جو مال باہر ملکوں سے لائیں، ان کو اپنے گھروں میں چھپا کر نہ رکھیں اور جس قیمت پر خرید کر لائیں، اس پر تھوڑا منافع رکھ کر فروخت کریں، اور لین دین میں غبن نہ کریں...... اس کے آئین میں یہ بھی تھا کہ جو علاقہ فتح کیا جاتا اس کا خزانہ لشکریوں میں تقسیم کر دیا جاتا، اور جو خراج وہاں کی رعایا سے لیا جاتا وہی وصول کیا جاتا ہے، سلطان سرکشوں اور منکروں کی گوشمالی اچھی طرح کرتا رہتا، اور ان کو اعلیٰ مرتبہ سے ادنی درجہ تک پہنچا دیتا، وہ فقیروں اور ضعیفوں سے مہربانی سے پیش آتا، اور اس کی نگہداشت کرتا کہ امیر زیادہ امیر ہو کر باغی نہ ہو جائیں، اور نہ کوئی غریب ہو کر فقیر ہو جائے، سلطان کی پارسائی کا حال یہ تھا کہ وہ نامحرم عورتوں کو اپنی ماں اور بہن تصور کرتا، کسی نامحرم عورت پر بری نظر نہ ڈالتا، اور نہ دوسرے کے مال میں خیانت کرنے کا لالچ دل میں لاتا، وہ رعایا پر مہربان تھا، اس لئے مروجہ گز اور جریب میں اضافہ کیا...... اس کے عہد میں ہر شخص اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے مذہبی احکام بجا لاتا، کوئی شخص کسی سے تعصب کی بنا پر تعرض نہیں کر سکتا تھا......

(تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۴۴۳ - ۴۴۲)

اس عہد کے ایک ہندو مورخ شری ور کا بیان ہے کہ سلطان اپنے مذہبی فریضہ کا سختی سے پابند تھا، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا، رمضان کے مہینے میں روزے بھی رکھتا، امورِ حکومت میں شیخ الاسلام کے مشورے سے کام انجام دیتا، وہ صوفیائے کرام اور علماء کی بڑی عزت کرتا، لیکن اسی کے ساتھ برہمنوں اور پنڈتوں کا بھی احترام کرتا، اس نے مندروں کی مرمت اور تعمیر کی اجازت دی، اور کچھ کو اس نے خود مرمت اور تعمیر کرایا اس نے برہمنوں کی ایسی زمین دی، جس کا لگان معاف تھا، مندروں پر زمینیں وقف کیں، وادی کشمیر میں مختلف مقدس مقامات کی یاترا کے لئے آنے والے یاتریوں کو مفت کھانا دیا جاتا تھا، اس کے لئے جو جاگیر وقف تھی، اس کو سلطان نے اور آگے بڑھایا، اور ایک عمارت ان یاتریوں کے قیام کے لئے بنوائی، ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہوتا، شری جین مٹھ کے بھکشو برتنوں کی پوجا کا جشن مناتے، تو اس میں وہ شریک ہوتا، بھکشوؤں کو کھانا کھلاتا، ناگ یاترا کے دن اور گن چکر کے تہوار کے زمانے میں پانچ دن تک پجاریوں کو چاول، گوشت اور پھل وہ خود دیتا، چاندی کی برتنوں میں کو انہیں لحاف اور دوسری چیزوں کے تحفے دیکر رخصت کرتا، ہندوؤں کو اچھے اچھے عہدے دینے میں فراخدلی سے کام لیتا، شیو بھٹ برہمن اور بودھ مذہب کے پیرو تلک اچاریہ اس کے بڑے معتمد سیاسی مشیر تھے، شری بھٹ اس کی عدالت انصاف کا منصرم تھا، جب اس کا انتقال ہوا، تو سلطان کو بڑا دکھ ہوا، اس نے اس کے لئے بہت بڑی رقم خیرات کی، کرپور بھٹ برہمن اس کا خاص طبیب تھا، (بحوالہ کشمیر سلاطین کے عہد میں از ڈاکٹر محب الحسن اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ ص ۱۲۵ - ۱۱۵)

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

از

جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

"علمائے سلف کے حالات کتابوں میں بہت پڑھے ہیں لیکن ایسے چند ہی بزرگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کے اندر علم و عمل کا کمال نظر آیا، مولانا حیدر حسن رحمۃ اللہ علیہ انہی صاحب کمال بزرگوں میں تھے، جن کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور کئی برس تک خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں اُن کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی جس قدر اُن کے حالات سے واقفیت ہوئی اسی قدر عقیدت میں اضافہ ہوا، اُن کا علمی تبحر، اُن کا زہد و تقویٰ، ان کا ذوقِ عبادت، ان کا شوقِ خدمت، اُن کا حُسنِ اخلاق، ان کا انکسار، اُن کی بے نفسی، اُن کی مہمان نوازی، اُن کی انسان دوستی، ان کا بزرگوں کا ادب، ان کی دوستوں پر نوازش، اُن کی خوردوں پر شفقت ان کی عالی ظرفی، ان کی بلند ہمتی، ان کی فیاضی، ان کا حسن سلوک، اُن کی بے خوفی، اُن کی حق گوئی، اُن کا استغنا، ان کا توکل، ان کا امیروں سے احتراز، اُن کا غریبوں کا خیال، محتاجوں کی حاجت روائی، تنگ دستوں کی دست گیری کس کس بات کو یاد کیا جائے، اُن کا خیال کرتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے؛ :-

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

عرصہ سے احباب کا تقاضا تھا کہ مولانا مرحوم کے متعلق اپنی یادداشتوں کو قلمبند کروں، ذیل کی سطور اُن کی فرمایش کی تعمیل میں لکھی جارہی ہیں، امید ہے کہ اہلِ علم کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھی جائیں گی، ممکن ہے مولانا کے واقعاتِ زندگی کسی کو متاثر کریں، اور اُن کے اخلاقِ عالیہ کو معیارِ عمل بنانے کی رغبت ہو، فقط

عبدالسلام قدوائی

خاندانی حالات مولانا حیدر حسن خاں نسلاً افغانی تھے، اور اپنے پٹھان ہونے پر فخر کرتے تھے اُن کے آباو اجداد یاغستان میں عرصہ تک مقیم رہے، پھر وہاں سے اُن کے بزرگ نجیب آباد (ضلع بجنور) آئے، یہ ہندوستان میں بڑی ہلچل کا زمانہ تھا، ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی جنگ نے مرہٹوں کا زور توڑ دیا تھا، اور توقع تھی کہ مغلوں کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہوجائے گا، احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان سے جاتے وقت دہلی کا تخت شاہ عالم کو سونپ دیا تھا، اور نجیب الدولہ، شجاع الدولہ اور دوسرے سرکردہ امیروں کو اُن کی امداد پر مامور کیا تھا لیکن امرار کی خودغرضی، بادشاہ کی نااہلی اور سرداروں کی باہمی چپقلش نے سارا منصوبہ خاک میں ملادیا، اور تین ہی سال کے اندر حالت ایسی ہوگئی کہ ۱۷۶۴ء میں مٹھی بھر انگریزوں نے شاہ عالم اور اُن کے ساتھیوں کو شکست دی، اور بنگال سے دہلی تک سارے شمالی ہند کے ٹھیکہ دار بن گئے،

مولانا کے پردادا غالباً ابدالی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے، پھر نجیب الدولہ کے ساتھ نجیب آباد چلے گئے، لیکن جب روہیلوں کا اقتدار ختم ہوگیا، تو نجیب آباد کا تیام نہیں معلوم ہوا، اتفاق سے اسی زمانہ میں نواب امیر خاں نے ٹونک میں اپنی ریاست

قائم کی، امیر خاں بھی یاغستانی تھے، اور بنیر کے رہنے والے تھے، بنیر مولانا کا بھی آبائی وطن تھا، اس تعلق کی بنا پر مولانا کے دادا غلام حسین خاں نجیب آباد سے ٹونک آ گئے، اور نواب امیر خاں کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنے لگے، غلام حسین خاں کے صاحبزادہ احمد حسن تھے، انھوں نے سپاہیانہ زندگی کے مقابلہ میں علمی زندگی کو ترجیح دی، یہی مولانا احمد حسن خاں ہمارے مولانا کے والد تھے،

پیدایش سنہ ۱۲۸۱ھ (سنہ ۱۸۶۴ء) میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونک میں پیدا ہوئے، اُن سے پہلے اُن کے دو بھائی مولانا محمد حسن اور مولانا محمود حسن پیدا ہو چکے تھے، دونوں بھائی عمر میں مولانا سے کافی بڑے تھے، مولانا کے بعد دو بھائی مولانا مظہر حسن خاں اور حکیم مسعود حسن خاں اور ہوئے، یہ سب بھائی علم و فضل میں ممتاز تھے، مولانا محمد حسن کو فقہ میں بڑا کمال تھا، وہ ریاست ٹونک کے مفتی مقرر ہوئے، مولانا محمود حسن غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، انھوں نے معجم المصنفین کے نام سے بڑی عظیم الشان کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام کے ابتدائی دور سے اپنے زمانہ تک کے مسلمان مصنفین کے حالات قلم بند کئے ہیں، اس کی چھ جلدیں دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کی ہیں، پوری کتاب چالیس جلدوں میں تمام ہو گی، یہ کتاب کیا ہے مصنفین اسلام کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، ان کا ایک پُر مغز رسالہ اصول توارث بھی ہے جس میں تعامل کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے، مجھے ان کی ملاقات کا شرف اور اُن کی باتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے، مولانا مظہر حسن خاں کو زبانوں کی تحقیق سے بڑی دلچسپی تھی، میسور کے کسی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے ایک بڑی معرکہ کی کتاب لکھی ہے، جس میں عربی کو ام الالسنۃ ثابت کیا ہے، مسعود حسن خاں صاحب کو طب سے بڑی مناسبت تھی، اور بڑے حاذق طبیب تھے، وہ دہلی میں باڑہ ہندو راؤ کے قریب رہتے تھے، مولانا

حیدر حسن خاں صاحب جب دہلی تشریف لاتے، تو انہی کے مکان میں قیام کرتے، راقم الحروف کو اُن کی ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا ہے، بڑے خلیق اور مہمان نواز تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت مولانا نے ایک دیندار اور صاحب علم گھرانے میں آنکھیں کھولیں، اور اسی فضا میں پروان چڑھے، اس لئے علم کا شوق اور دین کا احترام خمیر میں داخل ہو گیا، بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوئی تو تعلیم شروع ہوئی، شروع میں بڑے بھائی مفتی محمد حسن خاں اور منجھلے بھائی مولانا محمود حسن خاں سے پڑھنے لگے، عمر ذرا آگے بڑھی، تو ٹونک ہی کے ایک اور عالم محمد حسن اور مولانا عبدالکریم سے درسی کتابیں پڑھنے لگے لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے بڑے بھائیوں کی طرح اُن کی رفتار تعلیم زیادہ تیز نہیں تھی، اُن کے والد اپنے لڑکوں کے بارہ میں بڑے اونچے خیالات رکھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد علم کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں، اس لئے وہ اُن کی موجودہ رفتار تعلیم سے مطمئن نہیں تھے، مولانا فرماتے تھے کہ ایک دن میں گھر میں کھانا کھا رہا تھا، اتنے میں والد صاحب آگئے، اور والدہ کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ مجھے حیدر حسن کے رنگ اچھے نظر نہیں آتے، پھر انہوں نے شہر کے بعض جاہل اور ناکارہ لڑکوں کا ذکر کیا، اور کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ انھیں کی طرح نہ ہو جائے، اور اپنے پڑھے لکھے بھائیوں کے درمیان جہالت کی زندگی گزارے، اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ لڑکے باپ سے رعب اور فرط ادب کی بنا پر گفتگو نہیں کرتے تھے، عموماً ایسے مواقع پر ماں کی وساطت سے بات ہوتی تھی، والد تو اتنا کہہ کر چلے گئے، لیکن مولانا کے لئے ان کے الفاظ تیر و نشتر بن گئے، کہتے تھے کہ کھانا دشوار ہو گیا، فرط غم سے نوالے حلق میں پھنسنے لگے، دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو علمی کمالات حاصل کرکے دم لوں گا،

لاہور کا سفر اس زمانہ میں ٹونک میں لاہور کے مدرسہ نعمانیہ اور اس کے صدر مدرس

مولانا غلام احمد کی بڑی شہرت تھی، مولانا نے دل میں اُن سے اکتسابِ فیض کا پکا ارادہ کر لیا[1] ماں سے زادِ راہ اور سفر خرچ کے لئے کچھ روپئے لے کر لاہور روانہ ہو گئے، اور یہ عہد کر لیا کہ جب تک خاطر خواہ تعلیم مکمل نہ کر لیں گے، گھر واپس نہ آئیں گے، مولانا غلام احمد درس و تدریس کے امام تھے، اُن کی وجہ سے مدرسہ نعمانیہ طالبینِ علم کا مرکز بن گیا تھا، شائقینِ علم

---

[1] مولانا غلام احمد اپنے زمانہ کے بڑے نامور استاذ تھے، کوٹ بھٹی ضلع گجرانوالہ میں سنہ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، اور سنہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں لاہور میں وفات پائی، معقولات اور فقہ و اصول میں نادرۂ روزگار تھے، ریاضی میں بھی اعلیٰ استعداد تھی، مولانا شاہ دین لدھیانوی مولانا عبداللہ ہوشیار پوری اور مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے، مولانا شاہ دین استاذ العلماء مولانا لطف اللہ کے اور مولانا غلام قادر مفتی صدر الدین خاں دہلوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے شاگرد تھے، اس طرح مولانا غلام احمد کی ذات میں اس زمانہ کے تمام مشہور تدریسی سلسلے جمع ہو گئے تھے، تذکرہ نویسوں نے اُن کے کمالات کا بڑے شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے، صاحبِ نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ میں نے لاہور میں کئی بار اُن سے ملاقات کی ہے، وہ بڑے فاضل اور اعلیٰ درجہ کے فقیہ تھے، بڑے عبادت گزار حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے، خاموشی پسند تھے، مگر اس کے ساتھ اخلاقِ عالیہ کے مالک تھے، مولانا سید علی زینبی استاذِ اعلیٰ مدرسہ فرقانیہ اور نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اُن کی قابلیت کے واقعات سُنایا کرتے تھے کہتے تھے کہ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب مذاہبِ فقہار کے بیان، عقلی، نقلی دلائل، اور وجوہ ترجیح کے اعتبار سے بڑی دقیق سمجھی جاتی ہے، اب تو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حواشی کی وجہ سے اس کا پڑھانا نسبتہً آسان ہو گیا ہے لیکن سادہ طور پر عبارت کا مطلب سمجھانے کے علاوہ فنی بصیرت اور علمی مہارت کے ساتھ اس کا درس دینا اب بھی بہت دشوار ہے، مگر مولانا عبدالحیٔ کے حواشی سے پہلے تو ہدایہ کا پڑھانا لوہے کے چنے

دور دور سے کھینچ کھینچ کر وہاں پہونچتے تھے، وہ ایک واسطہ سے مفتی صدرالدینؒ دہلوی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۷) چبانے سے بھی زیادہ مشکل سمجھا جاتا تھا، لیکن مولانا غلام احمد کو اس کے مشکل مباحث نوک زبان تھے، اور مشکل مقامات کو اس خوبی سے حل کر دیتے تھے، کہ لوگ عش عش کرنے لگتے تھے، یہی حال اُن کی قابلیت اور قادرالکلامی کا منطق، فلسفہ اور ریاضی کے درس میں تھا، اس علمی قابلیت کے ساتھ سادگی، انکسار، حسن اخلاق، اور شفقت و محبت کا پیکر تھے، بہت ہی سادہ لباس پہنتے، سادہ غذا کھاتے، اور نشست و برخاست میں کسی امتیاز کو گوارا نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی لاہور سے گھر جاتے، ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی، سواری کیلئے ٹٹو لے لیا، مولانا حمید حسن خاں ہمراہ تھے، مولانا غلام احمد کی طبیعت زیادہ اچھی نہ تھی، مگر اُن کی مساوات پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ تنہا ٹٹو پر سوار رہیں، تھوڑی دور چلنے کے بعد اتر پڑے اور کہا کہ مولوی جی اب تم سوار ہو جاؤ، مولانا حمید حسن خاں نے عرض کیا میں آپ کا کمترین شاگرد و ادنیٰ خادم ہوں، میری یہ مجال نہیں کہ آپ پیادہ پا ہوں اور میں سواری پر بیٹھوں، لیکن مولانا غلام احمد نے فرمایا نہیں مولوی جی تم کو بیٹھنا ہوگا، مولوی صاحب نے بہتیری منت سماجت کی، مگر مولانا غلام احمد نے اُن کی ایک نہ سنی، اور جب تک اُن کو سواری پر بٹھا نہ لیا چین نہ آیا، اسی طرح باری باری اُترتے چڑھتے اپنے وطن کوٹ پہونچے، مولانا حمید حسن خاں نے اس واقعہ کو زندگی بھر یاد رکھا، واقعی تھا بھی یاد رکھنے کے لائق، حضرت عمرؓ کے سفر بیت المقدس کا منظر نگاہ کے سامنے آجاتا ہے،

مولوی صاحب اُن کی سادگی کا ذکر کرتے تھے، کہتے تھے کہ میرا کرتا اُن سے لانبا ہوتا تھا، اور بعض اوقات لوگوں کو دھوکا ہوتا تھا، ایک مرتبہ پیر مہر علی شاہ سے ملنے گئے، انھوں نے مولانا غلام احمد کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، سادہ لباس اور چھوٹے کرنے سے انھیں دھوکا

اور مولانا لطف اللہ[1] علی گڑھی کے شاگرد تھے، حدیث براہ راست میاں نذیر حسین سے پڑھی تھی، مولانا لاہور کے زمانۂ قیام میں آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے بیمار پڑے اور چھ مہینے تک بیمار

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸) ہوا، اور استاد سے زیادہ شاگرد کی طرف ملتفت ہوئے مولوی صاحب نے تعارف کرایا تو پیر صاحب کو اندازہ ہوا، اسی سفر کی بات ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ پیر صاحب نے مولانا کو کھانا کھلایا، اور خاطر مدارات کی، مولانا غلام احمد کی خودداری اور عزت نفس کو گوارا نہ ہوا، کہ مفت کا کھانا کھائیں، رخصت ہوتے ہوئے کچھ روپئے پیر صاحب کو نذر کئے، مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کا یہ حال تھا، کہ کسی وقت امتیاز کا خیال نہ آتا عام آدمیوں کی طرح سے چلتے پھرتے، عام آدمیوں کی طرح سے رہتے سہتے، بازار جاتے کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتے، تو خریدتے بھی کبھی جی چاہتا تو راستہ میں کچھ کھا بھی لیتے کبھی گنا چوستے، مولوی صاحب کہتے بھی کہ آپ ایک ممتاز عالم اور شہر کے معزز فرد ہیں، اس طرح سرراہ لوگ کھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، پرانے فقہا نے بازار میں کھانے پینے کو معیوب قرار دیا ہے، ایسے شخص کی شہادت معتبر نہیں سمجھتے مولانا غلام احمد مسکرا کر فرماتے، مولوی جی ہمیں کہاں گواہی دینی ہے، ہم ان تکلفات میں اپنے کو تکلیف کیوں پہنچائیں، راستہ میں کہیں مجمع ہوتا، یا کوئی چیز قابل دید ہوتی، تو رک جاتے اور مولوی صاحب سے کہتے کہ دیکھ لو مولوی صاحب عذر کرتے، مگر فرماتے مولوی جی دیکھ بھی لو دیہات میں یہ تماشے کہاں دیکھنے کو ملیں گے، طلبہ کے ساتھ ان کی نہایت شفقت اور دلداری تھی، ورنہ ان کے زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت اور متانت و سنجیدگی کی شہادت تذکرہ نویسوں کی زبان سے سن چکے ہو،

[1] (حاشیہ ص ۴۳۸) مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلی کے نامور مفتی، عالم، ادیب اور رئیس تھے، غدر سے پہلے ہی ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، آخر مغل بادشاہ

نے پیچھا نہیں چھوڑا، فرماتے تھے کہ تم لوگ ہوتے تو اس بخار کو دق سمجھتے اور چارپائی پر پڑجاتے مگر میں نے اس بیماری کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور برابر اپنے کام میں لگا رہا، اور دعا کرتا رہا کہ گھر سے جو عہد کرکے آیا ہوں، اللہ اُسے پورا فرمائے، اور میں کامیاب ہوکر سرخروئی کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۹) بہادر شاہ اُن کے بڑے قدردان تھے، تدریس و افتا کے ساتھ شعروادب کا بھی بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، آزردہ تخلص تھا، تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول وغیرہ علوم دینیہ میں شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے بھی اکتساب فیض کیا تھا، منطق و فلسفہ وغیرہ علوم معقولات میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے، اپنی دینداری وجاہت اور علمی کمال کی وجہ سے مرجع خلائق تھے، اور اُن سے تلمذ کی نسبت قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی، قلعہ کی آمد و رفت اور بہادر شاہ سے تعلق کی وجہ سے غدر میں فتویٰ بغاوت کا الزام لگا، جائداد ضبط ہوئی، اور چند ماہ قید میں بھی رہے، لیکن پھر تحقیقات کے بعد بری ہوئے، جائداد واگذار ہوئی اور انگریزی حکومت میں صدرالصدور کا منصب ملا، ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، "چراغِ دو جہاں بود" سے اُن کی تاریخ نکلتی ہے۔

(تذکرہ علمائے ہند رحمٰن علی)

حاشیہ نمبر ۲ متعلق ص ۴۲۹)

سے مولانا لطف اللہ اپنے زمانہ کے نامور مدرس بلکہ استاذ الاساتذہ تھے، ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں ملیحہ ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے، اور نوے سال کی عمر میں ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں وفات پائی، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، اور تمام درسی علوم انھیں سے حاصل کئے، حدیث کی سند قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے لی، جو شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے، اور ساری زندگی تدریس میں گذار دی،

وطن جاؤں،

مولانا پٹھان تھے، اور پٹھانی آن اُن میں ہمیشہ رہی، چاہے جان چلی جائے مگر آن میں فرق نہ آئے، یہ کبھی اُن کے ذہن سے فراموش نہیں ہوا، کوئی انہیں کمزور سمجھے یہ کبھی گوارا نہ تھا، بڑھاپے میں بھی اُن کی ہمت کے سامنے جوانوں کے چھکے چھوٹ جاتے، لاہور میں تو نوعمر تھے پھر بھلا شدائد کے سامنے کس طرح سپر انگندہ ہوتے، پنجاب کی سردی مشہور ہے، جاڑوں میں اچھے اچھوں کے دانت بجنے لگتے ہیں لیکن مولانا دسمبر جنوری کی شدید سردی میں بھی ایک سوتی چادر پر اکتفا کرتے، کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی تھی کہ جوان ہو کر سردی مناؤں، اگر روئی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۰) ابتدا میں کچھ عرصہ کانپور کے مدرسۂ فیض عام میں مدرس تھے، پھر علی گڑھ چلے آئے، اور تا دمِ مرگ وہیں درس دیتے رہے، ان کی شہرت ہندوستان سے باہر تک پہونچی، اور افغانستان و خراسان تک سے طالبینِ علم استفادہ کے لئے پہونچنے لگے، اُن کے شاگردوں میں درس و تدریس کا ایسا شوق پیدا ہو جاتا تھا کہ سیکڑوں مدرسے قائم کر دیئے، ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۴ء میں ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم نواب وقار الامراء نے حیدرآباد بلا کر دار العلوم کی صدارت تفویض کی، پھر افتاء کی خدمت بھی سپرد کی لیکن آخر میں جب آنکھوں سے معذور ہو گئے تو پنشن لے کر علی گڑھ واپس آ گئے، اور باقی زندگی وہیں بسر کی، اس علم و فضل اور اثر و رسوخ کے باوجود طبیعت میں بڑا انکسار تھا، تکلف سے دور، اور فقراء و مساکین کے ہمدرد و غمگسار تھے، غریبوں کے پاس بیٹھ جاتے، اور جہاں تک ہو سکتا، اُن کی مدد کرتے، شریعت کے بہت پابند تھے، علماء سے محبت اور مشائخ کی عزت کرتے، مزاج میں بشاشت تھی، ہر ایک سے حسنِ اخلاق سے پیش آتے کسی کی برائی نہ کرتے، عیب جوئی سے نفرت تھی، مخالفوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے، ندوہ سے بڑا تعلق تھا، ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء میں کانپور میں پہلے اجلاس کی پھر ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء)

کی رضائی اون کا کمبل اوڑھوں تو لوگ کیا کہیں گے، کہ جوانی میں اون اور روئی کا محتاج ہے۔ یہ شان اُن کی بڑھاپے تک قائم رہی، شدید سردی میں بھی ایک ٹسلو کے سے زیادہ نہیں پہنتے تھے، اور اُس کے بھی بٹن کھلے رہتے تھے، آخر عمر میں جب سن زیادہ ہوگیا تھا۔ تو ہم لوگ بٹن بند کرنے لگتے، تو فرماتے، میاں کبھی ایسا نہیں کیا، جب ہم لوگ اس کے باوجود نہ مانتے اور لگا ہی دیتے تو پھر خاموش ہو جاتے، میں جب کبھی جاڑوں میں اُن کا مہمان ہوتا، تو کہتے اس کو جاڑا بہت لگتا ہے، اس پر دو لحاف ڈال دو،

مولانا کچھ عرصہ سرحدی علاقہ میں بھی رہے تھے، جہاں جاڑوں میں پانی جم جاتا ہے، کہتے تھے کہ بارہا ایسا ہوا کہ پچھلے پہر تہجد کے وقت ندی میں برف توڑ توڑ کر غسل کرنا پڑا، شاید اسی وجہ سے وہ سردی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، کسی کو بہت اوڑھے پہنے دیکھتے تو بہت تعجب کرتے تھے، نواب علی حسن خان ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں آمد ورفت رہتی تھی، اُن کے والد نواب صدیق حسن خاں بھی شیخ حسین کے شاگرد تھے، بھوپال کے قیام

بقیہ حاشیہ ص ۴۴۱) میں بریلی میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی، ندوہ کی تاسیس زیادہ تر ان کے شاگردوں اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے مریدوں کی رہین منت ہے، ندوہ کے ناظم اول مولانا محمد علی مونگیری اُن کے شاگرد خاص تھے، حکیم سید عبدالحیٔ صاحب مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، اور مولانا ظہور الاسلام فتحپوری سب اُسی درس گاہ کے تعلیم یافتہ تھے، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے دل میں اُن کی بڑی وقعت تھی آنے جانے والوں سے حال پوچھتے رہتے، اور خدمت کی تاکید کرتے۔

(ماخوذ از نزہۃ الخواطر داستان العلماء)

کے زمانہ میں نواب صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ نواب صاحب کے علمی انہماک اور دینداری کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اگرچہ نواب صاحب اہل حدیث تھے، اور مولانا شدید حنفی، مگر باایں ہمہ نواب صاحب کی قدر کرتے تھے، اور ان کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کرتے تھے، کہتے تھے کہ نواب صاحب روزانہ ایک جزو تصنیف کر لیتے تھے، کبھی کسی کے یہاں کسی تقریب یا دعوت میں جاتے اور کھانے میں دیر ہوتی تو وہیں تصنیفی کام شروع کر دیتے، علماء اور طلباء کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے، اور ان کی خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ ہر جمعرات کو ان کے یہاں علماء اور طلبہ کی دعوت ہوتی تھی اس موقع پر نواب صاحب بنفس نفیس خود سب کے ہاتھ دھلاتے، اور یہ پانی برکت کے لیے گھر کے کونوں میں ڈلواتے۔ نواب صاحب سے محبت اور تعلق خاطر کی بنا پر مولانا ان کی اولاد اور اہل خاندان سے ربط ضبط رکھتے تھے، چنانچہ جب مولانا لکھنؤ آئے، تو نواب علی حسن خاں اور ان کے دوسرے، عزہ سے ملنے بھوپال ہاؤس جایا کرتے تھے، اس مجلس میں نواب علی حسن خاں صاحب کے برادر نسبتی نواب رشید الدین عرف اچھے صاحب بھی ہوتے تھے، وہ جاڑوں میں سردی سے حفاظت کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مولانا کہتے تھے کہ ایک رات گیا تو وہ اتنا اوڑھے پہنے تھے کہ میں نے کہا ساری سردی انہیں پر پھٹ پڑی ہے، اس وقت میں حسب عادت صرف شلوکا پہنے ہوئے تھا، اچھے صاحب بار بار مجھے تعجب سے دیکھتے تھے، اور کہتے صرف ایک شلوکا پہنے ہیں، آپ کو جاڑا نہیں لگتا، ابھی تو آپ کو ندوہ تک جانا ہے، کھلے میدان میں کیا ہوگا، سردی غضب کی ہے، ان کے سوالات اور تعجب انگیز نظروں کو دیکھ کر میں نے اپنے جی میں کہا آج یہ نظر لگا کر رہے گا، مولانا نظر کے اثر اور مکان کی نحوست کے بڑے قائل تھے، اس سلسلہ میں دو حدیثوں سے استدلال کرتے تھے محدثین نے ان کے دوسرے

معانی بیان کئے ہیں، اسی طرح سواری، اور عورت کے بارہ میں بھی شرارت اور بدمزاجی وغیرہ معانی بتائے ہیں، لیکن مولانا کو اتفاق سے کچھ ایسے تجربے ہوئے تھے، کہ وہ ان توجیہات کے بجائے نحوست ہی مراد لیتے تھے،

مولانا غلام محمد کے یہاں کئی برس قیام کیا، اور جب سارے مروجہ علوم حاصل کر لئے تو سند فراغ حاصل کی، واپسی میں استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ کے حلقۂ درس میں بھی کچھ عرصہ شریک رہے، اُن کے وفورِ علم، قوتِ بیان، حسنِ کلام، اور انہماک و ولولہ کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے، حدیث شریف کی متداول کتابیں اگرچہ لاہور میں پڑھ لی تھیں لیکن کسی صاحبِ نظر محدث کے درس میں بیٹھنے کی فکر تھی، اس زمانہ میں دہلی میں میاں سید نذیر حسین کے درسِ حدیث کی بڑی شہرت تھی، مولانا وہاں پہونچے اور کچھ عرصہ تک اُن کے حلقۂ درس میں شریک رہے لیکن مولانا فقہ حنفی سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے، اور میاں صاحب پر اس

لے میاں سید نذیر حسین ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں سورج گڑھ بہار میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں دہلی میں وفات پائی، ۱۲۳۰ھ میں حضرت سید احمد شہید مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی شہید کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، یہ اُن کی بالکل نوعمری کا زمانہ تھا، مگر طبیعت نے اس کا غیر معمولی اثر لیا اور اسی کا نتیجہ توحید کا غلبہ اور اتباعِ سنت کا وہ جوش تھا، جو انھیں ساری زندگی رہا، ابتدائی درسی کتابیں الہ آباد میں پڑھیں، پھر دہلی گئے، اور سید عبدالخالق دہلوی، شیر محمد قندھاری، جلال الدین ہروی، شیخ عبدالقادر رامپوری وغیرہ فاضل اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی، پھر شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، اور حدیث شریف کی مکمل تعلیم ان سے حاصل کی، پہلے فقہ حنفی سے بڑا لگاؤ تھا، اور کئی برس تک فقہ و اصول کی تعلیم سے شغف رہا لیکن بعد کو قرآن و حدیث کا غلبہ ہوا، اور ساری زندگی اس میں گذار دی، تقلید کے بجائے تحقیق کا

...ہ میں عدم تقلید کا غلبہ تھا، اس لئے مولانا کا وہاں جی نہ لگا، ایک دن میاں صاحب سے کہنے لگے
...ب کی تقریر سے تو برابر یہ ثابت ہوتا رہتا ہے کہ احناف کے دلائل کمزور اور ان کی مستند حدیثیں ضعیف
...، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کیا حنفی ضعیف روایتوں ہی پر عمل کرتے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے، مولوی
...حب ابھی طالب علم تھے، حدیث و رجال پر اُن کی زیادہ نظر نہیں تھی، میاں صاحب کے سامنے
...ل کیا پیش کرتے، اپنے مسلک کی محبت میں جذباتی انداز میں یہ بات کہی، میاں صاحب کو یہ
...ز پسند نہیں آیا، اور فرمایا پٹھان بڑے جاہل ہوتے ہیں، اب خفت کے ساتھ پٹھانیت بھی زور میں
...نا بولے میں تو عالم پٹھان ہوں، اس گفتگو کے بعد طبیعت اور اچاٹ ہو گئی،

اس زمانہ میں دہلی کے علاوہ بھوپال بھی حدیث شریف کا بڑا مرکز تھا، وہاں شیخ حسینؒ
...محسن انصاری یمانی درس دیتے تھے، ان کی حدیث دانی کی سارے ملک میں شہرت تھی، اور گوشہ

...یہ حاشیہ ص ۴۴۴) شوق غالب تھا، اس سلسلہ میں کئی بار مبتلائے مصائب بھی ہوئے، مگر
...ی روش پر جمے رہے، مولانا امیر علی ملیح آبادی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، نواب صدیق حسن خاں
...، مولانا عبد اللہ غزنوی وغیرہ اُن کے خاص شاگرد ہیں، شاہ سلیمان پھلواروی نے
...اُن سے حدیث پڑھی تھی، اور سند حاصل کی تھی، اسی کا اثر تھا، کہ شروع میں عرصہ تک وہ تقلید
...ں کرتے تھے، (نزہۃ الخواطر جلد ۸)

...شیخ حسین بن محسن انصاری یمن کے رہنے والے تھے، شیخ صفی الدین احمد بن قاضی محمد بن علی الشوکانی
...شاگرد تھے، ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں حدیدہ میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں بھوپال
...وفات پائی، یمن ہی میں صرف و نحو اور فقہ و اصول کی تعلیم پائی، پھر علامہ شیخ حسن بن عبد الباری
...اہدل سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، مفتی زید سلیمان بن محمد بن عبد الرحمن الاہدل سے بھی حدیث
کی تعلیم حاصل کی، پھر حسن اتفاق سے علامہ شوکانی صاحب نیل [illegible] شیخ

گوشہ سے طالبین حدیث اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، انکی حدیث دانی کی سارے ملک میں شہرت تھی، شیخ صاحب بھی حنفی نہ تھے، وہ امام شافعی کے پیرو تھے، مگر مزاج میں بہت اعتدال تھا، انداز بحث عالمانہ ہوتا تھا، مختلف ائمہ کے مذاہب بیان کرتے تھے، ہر ایک کے دلائل بھی دیتے تھے لیکن طرز گفتگو ایسا ہوتا تھا کہ کسی کو ناگوار نہیں ہوتا تھا، حنفی شافعی مالکی حنبلی، اہل حدیث وغیرہ سب ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے، تحقیق وتدقیق اور اخذ وترک میں مختار ہوتے، ہر طرح کی کتابیں موجود ہوتیں، اور طلبہ براہ راست ماخذ سے استفادہ کر سکتے تھے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب کو شیخ صاحب کا یہ انداز تدریس بہت پسند آیا، اور ان کے ایسے گرویدہ ہوئے، کہ پھر کہیں اور کا رخ نہیں کیا اور شیخ کا دامن مستقل طور پر تھام لیا، اگرچہ حنفیت پر مستقل طور پر جمے رہے مگر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۵) صفی الدین احمد صنعاء سے حدیدہ آگئے، شیخ حسین نے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھایا اور حدیث کی تمام کتابیں ان کے سامنے پڑھ کر سند حاصل کی، شیخ شوکانی بڑے محقق اور صاحب نظر تھے، ان کا سلسلہ حدیث بھی بہت عالی ہے اور بہت کم واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جاتا ہے، صرف ۲۰ آدمی درمیان میں پڑتے ہیں، مکہ معظمہ کے محدث حافظ محمد بن ناصر حازمی سے بھی حدیث کی اجازت لی، تعلیم کے بعد کئی برس تک حدیدہ کے قریب لحیۂ نامی قصبہ میں قاضی بھی رہے، لیکن پھر بعض مسائل میں ترکی افسر احمد پاشا سے موتیوں کے ٹیکس کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا، احمد پاشا کو اتنا تاؤ آیا کہ شیخ کو توپ سے اڑا دینے کی دھمکی دی، تین دن دھوپ میں بے آب و دانہ بٹھائے رکھا، ان حالات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا سکندر بیگم کے زمانہ میں بھوپال تشریف لائے یہاں اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا، دو سال کے بعد وطن کی کشش غالب ہوئی، وہاں کے حالات بھی موافق ہو گئے تھے، اس لیے واپس گئے پھر پانچ سال بعد شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں دوبارہ بھوپال آئے اس مرتبہ چند سال قیام رہا پھر وطن چلے گئے اور پانچ سال بعد شاہجہاں بیگم ہی

ہیشہ دلائل پر نظر رہی اور تاویل و توجیہ کے بجائے محدثین کے طرز پر حدیث و اسماء الرجال کی کتابوں سے کام لیتے تھے، اور اسی انداز میں روایات پر بحث اور جرح و تعدیل کرتے تھے، وہ شیخ صاحب کا والہانہ ذکر کیا کرتے تھے، کہتے تھے، ان کو بخاری کی شروح ازبر تھیں، علامہ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری تو ہر وقت زبان پر رہتی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۳) کے عہد حکومت میں پھر بھوپال واپس آئے، یہ نواب صدیق حسن خاں کا زمانہ تھا، ان کی علم دوستی اور قدردانی کی وجہ سے پھر کہیں نہیں گئے۔ اور مستقل طور پر بھوپال ہی میں قیام کر لیا، اُن سے ہندوستان میں علم حدیث کو بہت فروغ ہوا، اور بکثرت لوگوں نے فیض حاصل کیا، اُن کے تلامذہ میں نواب صدیق حسن خان، مولانا محمد بشیر سہسوانی مولانا عبداللہ غازی پوری، شیخ محمد طیب مکی، مولانا وحید الزمان حیدر آبادی مولانا محمود حسن ٹونکی، مولانا حیدر حسن خان اور مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلماء خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی بھی شیخ کی بڑی قدر کرتے تھے، شیخ بھی اُن کو سلام کہلا بھیجتے اور دعا کی درخواست کرتے مرادآباد مولانا کی خدمت میں جانا بھی ہوا، مولانا نے ان سے ملاقات کا بڑا اہتمام کیا، اور بڑی عزت و تکریم کی مولانا شاہ اسحٰق کے شاگرد تھے، اور حدیث شریف سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے، اور آخر وقت تک درس دیتے رہے، شیخ سے محبت اور ان کی عزت و تکریم ذات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عشق اور حدیث شریف سے غیر معمولی لگاؤ کی بنا پر تھی، شیخ حسین کی وفات بھی بالکل عجیب طرح ہوئی، بالکل اچھے تھے، انتقال سے تقریباً دس گھنٹے پہلے احباب کی ملاقات کیلئے گئے، حسب معمول باتیں کیں اور چلتے

شیخ حسین کے یہاں جی لگا کر حدیث پڑھی، شیخ بھی اُن کی محنت و سعی ذوق و شوق، فہم و ذکا، تلاش و تحقیق مطالبہ و مذاکرہ فکر و نظر سلامت طبع، پرہیزگاری، و نیک عملی اور طاعت فرمانبرداری سے بہت خوش رہتے تھے، فراغت کے بعد انھیں درس حدیث کی اجازت دی، اور خود اپنے قلم سے سند لکھ کر دی، اور فلاح دارین کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، علوم متداولہ اور فنون مروجہ کی تحصیل وہ لاہور میں پہلے ہی کر چکے تھے، حدیث کی تکمیل کے بعد انھیں یک گونہ اطمینان ہوا، ٹونک واپس آئے۔

ملازمت | ٹونک اُس زمانہ میں علم کا مرکز تھا، شاہی خاندان اپنی دینداری اور اہل علم کی قدردانی میں مشہور تھا، نواب وزیرالدولہ حضرت سید احمد شہید کے مرید تھے، اور بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کے بعد اُن کے اہل خاندان اور مریدین و متوسلین کو ٹونک میں آباد کیا، اور مصارف کے لئے جاگیریں دیں، مجاہدین کی مناسبت سے اس محلہ کا نام ہی قافلہ پڑ گیا، نواب وزیرالدولہ کی سید صاحب سے عقیدت کا یہ حال تھا، کہ ان کے اعزہ و اقربا کو اپنے اہل خاندان پر ترجیح دیتے تھے، مولوی صاحب بیان کرتے تھے، کہ ایک مرتبہ نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ سید صاحب کا ارادہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو بلا کر کہا کہ دوسری بیوی آئیگی تو صاحبزادی کو تکلیف ہوگی لیکن اگر آپ شادی سے باز نہیں رہ سکتے تو کسی اور عورت کے بجائے میری لڑکی سے عقد کر لیجئے، وہ صاحبزادی کی سوکن نہیں بلکہ خادمہ بنکر رہیگی،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۷) وقت خاتمہ بالخیر کے لئے دعا کی درخواست کی، پھر اپنے لڑکوں کے گھروں میں گئے، کے صاحبزادہ عبداللہ کے گھر آئے کسی نے یا استفسار کیا تھا کہ کیا حضرت خدیجہ کے جاہلیت کے زمانہ میں ہوا تھا، اور اس کا نام عبدالعزیٰ رکھا گیا تھا، اس سلسلہ میں ضروری کتابیں منگوائیں، پھر اس سوال کا جواب لکھایا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، صاحبزادہ وضو کرنے گئے، اور شیخ تکیہ پر ٹیک لگا کر لیٹ گئے، وہ واپس آئے، تو محسوس ہوا کہ شاید آنکھ لگ گئی ہو، لیکن دفعۃً سر ایک طرف ڈھلک گیا سنبھالنا چاہا، معلوم ہوا کہ روح پرواز کر گئی ہے۔   (ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد ۸)   (۱)

قرآن حکیم اور ذوق کی تربیت

از

جناب مولوی بدرالدین صاحب ایم اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ذوق کے معنی | المحیط میں ذوق کے معنی چکھنا کسی چیز کے مزے سے باخبر ہونا اور بار بار لطف اندوز ہونا ہیں، ابن خلدون نے اس لفظ کے معنی اپنے مقدمہ میں زبان میں ملکۂ بلاغت کا حاصل کرنا لکھے ہیں، لسان العرب نے بڑی تفصیل سے ذوق کے معانی و مفہوم کی بحث کی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ذوق کے معنی چکھنا، مزہ حاصل کرنا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ

ذقت فلاناً و ذقت عندہ ای خبرتہ، — میں نے اس کو پرکھ لیا، چکھ کر دیکھ لیا، اس کے پاس جو کچھ تھا اُسے بھی جانچ لیا،

اسی ذیل میں لسان العرب نے حدیث میں ذوق کے معنی کے لئے یہ روایت بیان کی

ان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات، — یعنی اللہ تعالیٰ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو نکاح اور طلاق میں عجلت اور زیادتی کو پسند کرتے ہوں،

یہاں بھی مفہوم وہی ہے کہ ایک کا مزہ چکھا چھوڑ دیا، دوسرے کو جانچا علاحدہ کردیا

اور بار بار مزہ تبدیل کرتے رہے،

عرب کے محاورہ میں بھی ذوق کے معنی جانچنا اور پرکھنا ہی مراد لئے جاتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے استذقتُ فلاناً، (میں نے فلاں کو چکھنا پرکھنا چاہا)

قرآن کریم میں ذوق کے لفظ سے عذاب چکھانے کے معنی بھی مراد لئے گئے ہیں، مثلاً

فاذاقها الله لباس الجوع والخوف،	پس اللہ تعالیٰ نے اس کو بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا،
لَا یَذُوقُونَ فیها الموتَ الا الموتة الاُولیٰ،	جنتی لوگ جنت میں موت کا مزہ کبھی نہیں چکھیں گے، سوائے اس موت کے جو پہلے طاری ہو چکی ہوگی،

ان تمام مطالب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ذوق سے مراد سب سے پہلے کسی چیز کو چھونا تاکہ ان کا مزہ حاصل ہو اس کے بعد ذوق کے تجرد کی طرف رہنمائی حاصل کرنا، یعنی فیصلہ کرنا کہ شیریں ہے یا تلخ ہے، پھر اس چیز سے نفرت یا محبت کا فیصلہ کرنا. لہذا تین درجے ہوئے، مقدمہ، فیصلہ اور اس پر عمل. اسی طرح جب ذوق کو عام اشیاء میں استعمال کیا جاتا ہے، تو وہاں بھی اس کے معنی یہی مراد لئے جاتے ہیں، یعنی ذوق کے ذریعہ کسی چیز کے حسن و قبح اور اس کے اچھے برے خواص کو معلوم کرنا،

اس کے علاوہ جب کلمۂ ذوق دائرۂ فنون میں داخل ہوتا ہے. تو وہاں بھی اس کا مطلب یہی لیا جاتا ہے یعنی ذوق کے ذریعہ فنی آثار کے حُسن و قبح کو پرکھنا، دوسرے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں، کہ ذوق وہ قوت یا فطری استعداد ہے جس سے کسی شے کے حسن و قبح کا اندازہ کرکے اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے، اور

حسبِ استطاعت اسے اپنے اقوال و اعمال میں منتقل کیا جا سکے،

یہی ذوق جب ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے، تو اُس کے اصطلاحی معنی لغوی معنی سے میل کھاتے ہوئے مراد لئے جاتے ہیں یعنی ادب شناسی کا خاص ملکہ پیدا کرنا، اور اس سے ہمکنار ہوتے ہوئے جب ہم ادب نگاروں کی دنیا کی سیر کرتے ہیں، تو وہاں ہمیں تقریر و تحریر کا سارا کھیل ذوق اور جذبہ ہی کا مرہونِ منت نظر آتا ہے،

بغیر ذوق کے علمی دنیا میں ایک انچ بڑھنا بھی ممکن نہیں، اور ذوق ہو تو پھر میدان عمل کے تیار ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں،

ذوق کی روانی کے لئے تو باقاعدہ تعلیم بھی درکار نہیں، اور حد تو یہ ہے کہ ذوق کی فراوانی میں آنکھوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں، ورنہ کیا چیز ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم کی نابینا آنکھوں نے اپنی تحریروں سے دنیا کی نگاہوں کو خیرہ اور حیرت زدہ کر دیا، ابن القریتہ امی ہونے کے باوجود اموی دور میں اپنی فصاحت کا لوہا منوا لیا، ع

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ذوق کی اسی لاثانی قوت کو احمد الشائب اصول النقد الادبی میں ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں:۔

والذوق ینفع فی انشاء الادب	اور ذوق انشاءِ ادب میں نفع دیتا ہے،
ایضاً فان ما ینشئہ الکاتب	نیز ہر کاتب اور شاعر جو کسی کلام کو
او الشاعر ثمرۃ ذوقہ الادبی	وجود میں لاتا ہے، وہ اس کے ادبی
وصورۃ الدقیقۃ، کذالک	ذوق اور نکتہ سنجی کا ثمرہ ہوتا ہے،
اختیار النصوص الادبیۃ	اسی طرح اعلیٰ درجہ کا مستند کلام

متأثر بالذوق خاضع لہ، و ذوق الجمیل یختار الادب الجمیل،

جس کی گہرائی سے واقفیت حاصل کی جائے، یہ ذوق ہی کا مرہونِ منّت ہوتا ہے، پھر یہ کہ ذوقِ جمیل ہی ادب جمیل کو اختیار اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے"

مگر غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ذوق جس کے ذریعہ انسان ایک اعلیٰ ادبی شہ پارے کو وجود میں لانے کی صلاحیت پاتا ہے جو انسانی نفوس میں خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے، قلوب کو گرماتا ہے، مزاج کو آمادہ کرتا ہے، طبیعت میں عمل کی چنگاری فروزاں کرتا ہے، آخر وہ خود کیسے اتنی عظیم صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے، بغیر کسی عامل کے اس صلاحیت کا وجود میں آجانا ناقابلِ فہم ہے،

دوسرا سوال یہ کہ خود ذوق کی تخلیق کا مبدا اور منبع کیا ہے۔

اس سلسلہ میں احمد الشائب کہتے ہیں، ذوق کوئی سادہ یا بسیط ملکہ نہیں ہے جیسا کہ عام خیال ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے عاطفہ، عقل اور احساس کا۔ اور بسا اوقات عاطفہ ان میں اہم عنصر ہوتا ہے،

اور جہاں تک ذوق پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں، ذوق کوئی منجمد یا بسیط شے نہیں، بلکہ اس پر حالات کا پورا اثر پڑتا ہے اور ذوق کی تخلیق اُس کے نشو و نما اور تبدیلی پر جو عناصر اثر انداز ہوتے ہیں، اُن میں ادیب کے گرد و پیش کا ماحول، زمانہ، نسلی خصوصیات، خاندانی تعلیم و تربیت اور انفرادی مزاج کو بڑا دخل ہے، مگر ذوق کا اصل منبع کیا ہے، یہ کس طرح وجود پذیر ہوتا ہے، اس کو

اجمالاً تین لفظوں میں واضح کیا گیا ہے، کہ یہ حافظہ، عقل اور احساس کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے،

اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ حافظہ، عقل اور احساس جس ماخذ سے اپنا عملی مواد حاصل کرتے ہیں، وہی ذوق کا بھی اصلی سرچشمہ ہوا، وہی منبع اور ماخذ قرار پایا، اب اس اصلی سرچشمہ کی طرف منائی کچھ مشکل نہیں، کیونکہ اس کی وضاحت ہمیں نصیر احمد ناصر کی کتاب "جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں" کے مقدمہ سے ملتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قلب انسان کی ایسی موضوعی قوتوں کا سرچشمہ ہے جو اپنی نوعیت میں فعلی اور انفعالی ہیں، فعلی قوتوں کے ماخذ کا نام دماغ ہے اور انفعالی قوتوں کے مبداء کو دل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، دماغ بہت سی قوتوں کا سرچشمہ ہے، جن میں سے تصور، تخیل، تعقل، تفکر اور تذکر جمالیات کی رو سے بہت اہم ہے، اسی طرح دل بھی متعدد انفعالی قوتوں کا منبع ہے، جن میں سے وجدان اور حس جمال کی قوتیں اہم امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، یہ دونوں قوتیں ہمارے احساسات و انفعالات، تاثرات وجذبات اور عواطف و امیال کے سرچشمے ہیں"

انسانی اعضاء میں دل و دماغ کے ان وظائف اور اعمال کی وضاحت کے بعد اب اس کا سمجھنا ہمارے لئے بہت آسان ہو جاتا ہے، کہ کسی بھی ادیب، شاعر اور نثر نگار کے ذہن کی تخلیق اس کے ذوق کی مرہون منت ہوتی ہے، اور ذوق قلب و دماغ، عقل و حواس کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، انہی کے سہارے ذوق کا شاہکار ادبی فن پارے کی شکل میں اپنے مفہوم و معانی سے ضیا پاشی کے قابل بنتا ہے، مگر اس رہنمائی کے حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گتھی اور ہمارے سامنے آتی ہے، کہ قلب سے کیا مراد ہے، قلب کب اس قابل ہوتا ہے، کہ ذوق سلیم کی تعمیر کر سکے، کیا قلب بھی مختلف کیفیات کا اثر قبول کرتا ہے، کیا ذوق سلیم اور ذوق ردی کی طرح قلب بھی سلیم اور ردی صفات

کا حامل ہو سکتا ہے، ان سوالات کو حل کرنے کے لئے ہمیں قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

قلب اور دماغ | قرآن حکیم میں مختلف آیات میں قلب کی اصطلاح کو جس معنی میں استعمال کیا ہے، اس سے پوری طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ قلب وجود انسانی کی تمام شاہداتی قوتوں کا مبدا ہے، وظائف کے اعتبار سے قلب کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں،

ایک دماغ جس کا خاصہ تعقل اور شعور و احساس ہے، دوسرا قلب جو مشاہدات و حوادثِ زندگی سے اثر آفرینی اور اثر پذیری کے لئے وقف ہے، چنانچہ دل و دماغ کی ان قوتوں کی وحدت یا کلی مجموعے کو اصطلاحِ قرآنی میں فواد یا قلب کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے،

مثلاً :- واللہ اخرجکم من بطون اُمّھاتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السّمع والابصار والافئدۃ لعلّکم تشکرون،

اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا، اور تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، اور تمہارے سننے اور دیکھنے کی (قوتیں) نیز (شعور کی قوت) قلب کو بنا دیا تاکہ تم شکر گذار بن جاؤ،

قلب کو ہم شاہداتی قوتوں کا مبدا اس لئے کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بسا اوقات بغیر قلب کی اعانت کے قوتِ باصرہ اور سامعہ اپنا وظیفۂ عمل مکمل نہیں کر سکتی، مشاہدہ شاہد ہے کہ آدمی کسی سمت غور سے دیکھتا ہے مگر اتفاق سے اس کا قلب کہیں اور دھیان جمائے ہوتا ہے، تو باوجود غور سے دیکھنے کے اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا، کہ کیا دیکھا، یہی حال

سماعت کا ہے،

بہت سے لوگوں کی آنکھیں سوتے میں کھلی رہتی ہیں، مگر وہ کچھ نہیں دیکھتے، کان بدستور ہر حال میں کھلے رہتے ہیں، مگر جب تک حضور قلبی نہ ہو آدمی اُن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ قلب کے اشتراک عمل کے بغیر کوئی قوت حاسہ صحیح طور پر کام نہیں کرسکتی، مگر اس کے برعکس یہی حال قلب کا ہے، یہ بھی بغیر باصرہ کی مدد کے نہیں دیکھ سکتا، نہ سامعہ کی مدد کے بغیر سُن سکتا ہے،

اس اشتراک عمل کو قرآن حکیم نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے،

افلم یسیروا فی الارض فتکون	کیا وہ زمین میں سیر و سیاحت نہیں
لھم قلوب یعقلون بھا او	کرتے کہ اُن کے دل و دماغ اُن
اٰذان یسمعون بھا فانھا	کے واسطے ایسے ہو جاتے کہ وہ اس سے
لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی	سمجھتے یا کان ایسے ہو جاتے کہ ان
القلوب التی فی الصدور	سے سنتے، یہ نہیں ہے کہ ان کی آنکھیں
(۲۲-۴۶)	اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ اُن کے سینے
	میں جو قلوب ہیں، وہ اندھے ہو جاتے ہیں

اس آیت میں ایک تو باصرہ اور قلب کے وظائف پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے دونوں کے باہمی عمل کا تعلق معلوم ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ باصرہ کے مشاہدہ پر قلب کے عمل کو تقویت اور فوقیت حاصل ہے،

اگر قلب کا عمل نہ ہو تو قوت باصرہ اپنے فرض کی انجام دہی سے قاصر ہے، اس کے علاوہ جو اہم بات اس آیت میں سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ کون سے قلب کا عمل اہم ہے، ؟ معلوم ہوا

کہ صرف اس قلب کے مدرکات اور محسوسات سچّے ہوں گے، جو اندھے پن کی بیماری سے پاک ہوگا، اگر قلب صحت مند نہیں ہے، تو وہ قوتِ باصرہ کو مشاہدہ پر یقین کی مہر نہیں لگا سکتا،

اس سے معلوم ہوا کہ قلب بھی اپنے عوارض کے لحاظ سے مختلف کیفیات کا حامل ہوسکتا ہے، اور اس پر بھی سلیم اور ردی حالتیں گذرتی ہیں،

قلب سلیم کے عمل کی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے، قرآن کریم سورۂ والنجم میں جہاں آنحضرت صلعم کے معراج میں تشریف لیجانے کا واقعہ بیان کیا ہے، وہاں ان تمام کیفیات کو بیان کرنے کے بعد جو آنحضرتؐ کو پیش آئیں، کہا،

"ماکذب الفواد مارای" یعنی رسول کی نظر نے جو کچھ دیکھا، قلب نے اس کی تکذیب نہیں کی،

کیوں نہیں کی؟ قلب نے اس لئے نظر کے مشاہدہ کو نہیں جھٹلایا، کیونکہ وہ خود تمام آلائشوں سے پاک تھا، ایک حسین مصفیٰ شکل میں تھا، اور پھر مشاہدہ بھی تمام تر حقیقت پر مبنی تھا، لہذا قلب سلیم نے اسکی تصدیق کردی،

اس سے معلوم ہوا کہ قلب کا صحیح مشاہدہ کرنے اور مشاہدہ کی صحت و حسن و خوبی کا اندازہ لگانے کے لئے خود مصفّٰے و مجلّٰے ہونا لازمی ہے،

اس کے بعد قرآنِ کریم کی دوسری آیات اور گمراہ قوموں کے حالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قلب حقیقۃً اپنی اصل کے اعتبار سے نہایت حسین اور مصفیٰ ہے، مگر مختلف عوارض سے جن کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل سے ہے، قلب کو مختلف بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں، اور وہ صحیح مشاہدہ کے قابل نہیں رہتا۔ صحیح مشاہدہ اور احساس وادراک نہیں ہوتا، تو مشاہدہ کے غلط تأثرات سے آگے چل کر جو عقلی اور فکری نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بھی صحت مند نہیں ہوتے،

اس بات کو "اقبال اور جمالیات" کے مصنف نصیر احمد ناصر نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تائید کے ساتھ اس طرح تعبیر کیا ہے "قرآن حکیم کی رو سے قلب فطری طور پر معصوم ہے، مصفا اور پاکیزہ ہوتا ہے، اور یہ سب حسن کی صفات ہیں، جو انسان کے ذوقِ لطیف، پاکیزگی طبع، اور رفعتِ خیال پر دلالت کرتی ہیں، قلب کی ان صفاتِ ذاتی میں جب کوئی نقص پڑ جاتا ہے، تو اس کا اثر جمالیاتی حس پر بھی پڑتا ہے، جس کا نتیجہ کور ذوقی اور پست خیالی کی صورت میں نکلتا ہے"

فسادِ رنگ و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف"

(اقبال)

لیکن صحت مند قلب کیوں بیمار ہو جاتا ہے، اس کی ایک وجہ قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ جب انسان کے فکر و عمل میں اعتدال نہیں رہتا، تو اس کے قلب کی حالت بدل جاتی ہے، اور وہ حسن قلب کی نورانیوں سے محروم ہو کر اپنی سرکشی کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

ونقلب افئدتھم وابصارھم | اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں
کما لم یؤمنوا بہ اول مرۃ | کو پھیر رہے ہیں جس طرح کہ وہ
ونذرھم فی طغیانھم یعمھون | پہلے اس (قرآن) پر ایمان نہیں
(۶ - ۱۱۰) | لائے تھے، اور ہم انھیں چھوڑے
| دیتے ہیں، کہ وہ اپنی سرکشی کی تاریکیوں
| میں بھٹکتے رہیں،

اس کے علاوہ قلب جن عوارض کا شکار ہوتا ہے۔ ان کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قوموں کے حالات کے لحاظ سے ان ناموں سے تعبیر کیا ہے۔

۱۔ بیماری، ۲۔ کجی ۳۔ حجاب ۴۔ اندھاپن، ۵۔ طبع ۶۔ قساوت، ۷۔ زنگ آلودگی،

۸۔ غفلت وجہالت، ۹۔ تعقل، ۱۰۔ ختم،

ان عوارض کی تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں مگر ذیل کی آیات میں اُن کی طرف نشاندہی ضرور ہو سکتی ہے،

بیماری: فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون، (۲ - ۱۰)

اُن کے قلوب میں بیماری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (قانونِ فطرت کے مطابق) اُن کے مرض کو اور بڑھا دیا ہے، اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے، اس لئے کہ وہ حق کو جھٹلاتے ہیں،

کجی: واذ قال موسیٰ لقومہ یٰقوم لم تؤذوننی وقد تعلمون انی رسول اللہ الیکم فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم واللہ لا یھدی القوم الفٰسقین (صف)

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم والو تم کیوں مجھے تکلیف دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، چنانچہ جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے اُن کے دل ٹیڑھے کر دیئے، اور اللہ تعالیٰ (اپنے قانون) کی وجہ سے حدِّ اعتدال سے تجاوز کرنے والے لوگوں کو منزلِ مقصود

حجاب: ومن اظلم ممن ذکر بآیات
ربہ فاعرض عنھا ونسی
ما قدمت یداہ انا جعلنا
علی قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ
وفی آذانھم وقرا، وان
تدعھم الی الھدی فلن
یھتدوا اذا ابدا،
(۱۸ - ۵۷)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا
ہے، جسے اس کے پروردگار کی آیتیں
یاد دلائی جاتی ہیں، تو وہ منہ موڑ
لیتا ہے، اور اپنی گذشتہ سیہ کاریوں
کو بھول جاتا ہے، بلاشبہ ہم نے اُن
کے دل ودماغ پر پردے ڈال دیئے
ہیں، کہ وہ کوئی بات سمجھ نہیں سکتے اور
اُن کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے
اور تم کتنا ہی ہدایت کی طرف بلاؤ وہ
کبھی ہدایت پانے والے نہیں،

اندھاپن: افلم یسیروا فی الارض فتکون
لھم قلوب یعقلون بھا او
آذان یسمعون بھا، فانھا
لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب
التی فی الصدور (۲۲ - ۴۶)

کیا یہ لوگ زمین میں سیر وسیاحت
نہیں کرتے. کہ اُن کے دل ودماغ
سمجھنے اور کان سننے کے قابل ہو جاتے
آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ قلوب
اندھے ہو جاتے ہیں، جو سینوں میں ہیں

طبع: اولم یھد للذین یرثون الارض
من بعد اھلھا ان لو نشاء
اصبنھم بذنوبھم ونطبع
علی قلوبھم فھم لا یسمعون
(۷ - ۱۰۰)

کیا ان لوگوں کے لئے جو پہلی جماعتوں
کے بعد ملک کے وارث ہوئے ہیں، یہ
بات موجب ہدایت نہیں ہوتی کہ اگر
ہم چاہیں تو انھیں بھی پہلوں کی

کی طرح) گناہوں کے سبب مصائب
میں مبتلا کر دیں، اور اُن کے دلوں
پر حجاب لگا دیں، کہ وہ سن ہی نہ سکیں،

قساوت: كذالك يحيى الله الموتى
ويريكم آياته لعلكم تعقلون
ثم قست قلوبكم من بعد
ذالك فهي كالحجارة
او اشد قسوة۔
(۲-۷۴)

اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے
اور اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم
سمجھو، مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد
بھی تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں
کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ اُن سے
بھی بڑھے ہوئے،

زنگ آلودگی: اذا تتلى عليه آياتنا
قال اساطير الاولين، كلا
بل ران على قلوبهم ما كانوا
يكسبون (۸۳-۱۴)

ایسے شخص پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں
تو کہتا ہے یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں
ہیں، ہرگز ایسا نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر
ان کی سیہ کاریوں کے سبب زنگ لگ گیا ہے،

غفلت وجہالت: ولدينا كتب ينطق
بالحق وهم لا يظلمون ۵
بل قلوبهم في غمرة من هذا
ولهم اعمال من دون
ذالك هم لها عملون ۲۳-۶۲-۶۳،

اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق کے ساتھ
بولتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا بلکہ
ان کے دل و دماغ اس سے غفلت و جہالت
میں ہیں، اور اس کے علاوہ اُن کے اور
بھی اعمال ہیں، جو وہ کرتے ہیں،

تعقل: افلا يتدبرون القرآن ام

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں

علیٰ قلوب اقفالھا، (۴۷-۲۴)

ختم: افرئیت من اتخذ الٰھہ
ھوٰہُ واضلّہُ اللہ علیٰ علم
وختم علیٰ سمعہ وقلبہ و
جعل علیٰ بصرہٖ غشاوۃ (۴۵-۲۳)

کرتے، یا اُن کے دل ودماغ پر قفل چڑھے ہیں۔
تو کیا تو نے اس کا مشاہدہ کیا، کہ جس شخص
نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے، اور
اللہ نے اپنے قانونِ قدرت کے مطابق اسے
علم کی دنیا میں گمراہ کر دیا ہے اور اُس کے
کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اُسکی

مندرجۂ بالا بحث اور قلب کے عوارض کی نشاندھی کے بعد اب یہ بات پوری سمجھ میں آسکتی ہے، کہ ادب کی تخلیق مرہونِ منت ہے ذوق کی، اور ذوق دل ودماغ عقل وحواس کے مجموعی عمل کا نام ہے، دل ودماغ کی جب مختلف عوارض سے حالتیں بدلتی رہتی ہیں، تو اس کا لازمی سبب ہوگا کہ اس سے وجود پزیر ہونے والا ذوق بھی صحت مند نہ ہوگا، چنانچہ ضرورت اس امر کی ہوئی کہ اصل علاج دل ودماغ کا ہو، اگر اُن کے مرض کی صحیح تشخیص اور علاج ہو جائے تو ذوق خود بخود صحت مند ہوگا، جب ذوق صحت مند ہوگا تو جتنے افکار وخیالات ادبی فن پارے، مذہبی تخیلات اس سے وجود پا ئیں گے سب صالح اور حسین وجمیل، مصفّیٰ ومجلّی ہوں گے،

ان حقائق کی روشنی میں اب ہم یہ دعویٰ کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہیں کہ قرآن کریم نے اپنے بلیغ انداز اور رنگیں اسلوب نگارش سے قلوب انسانی کی ان دکھتی رگوں پر انگلی رکھی ہے جو صحیح خیالات کی تخلیق میں رکاوٹ ہوتے ہیں، اور پھر ایمان ویقین، اعمالِ صالحہ اور عبادات سے ان امراض کا صحیح علاج بھی تجویز کیا، بس یہی وہ بنیادی کام ہے، جو ذوقِ سلیم کی تربیت میں اساس کی اور اصل کی حیثیت رکھتا ہے، جسے قرآن حکیم نے بحسن وخوبی بدرجۂ اتم انجام دیا ہے،

(باقی)

شعوبی تحریک اور اس کا انجام

از ڈاکٹر محمد اقبال انصاری مدرشعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

انسان آزادی پسند ہے، کوئی قوم یہ پسند نہیں کرتی کہ کسی دوسری قوم کی غلامی تسلیم کرے، غلامی تو بڑی بات ہے ذہنی برتری بھی مستقل طور پر تسلیم کرنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا، اسلام نے اسی انسانی جذبہ کا لحاظ کرکے خاندانی حکومت اور سرداری کو پسند نہیں کیا، بلکہ خاندان کے بجائے صفات کو اہمیت کی بنیاد قرار دیا، قرآن مجید نے صاف طور سے کہا کہ

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[1]	اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تمہیں جماعتوں اور قبیلوں کی شکل میں اس لئے کیا تاکہ باہم تعارف ہوسکے ورنہ حقیقت تو یہ ہے، کہ تم میں شریف وہ ہے جو اللہ

اس آیت نے نسلی غرور کا خاتمہ کردیا، اور تمام انسانوں کو ایک مرد و عورت کی اولاد قرار دیکر خاندانی افتخار کی جڑ کاٹ دی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت اس طرح کی:

الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا	خوب سمجھ لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور

---

[1] قرآن مجید ۹، ۱۳/۴۹

لا فضل لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی الاحمر الا بالتقویٰ۔[1]

(کسی عربی کو کسی عجمی پر) اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت۔

اسلام کی اس تعلیم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں عمل ہوتا رہا، ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے اپنے غلام کو سخت الفاظ میں کوئی نامناسب بات کہدی تھی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تنبیہ فرمائی تھی اور کہا تھا "ابو ذر تم میں ابھی تک جاہلیت کی خو باقی ہے"[2] آپ تاکید فرماتے تھے کہ غلاموں کو غلام نہیں بلکہ مولیٰ کہا جائے، اور انھیں وہی کھلایا اور پہنایا جائے جو آقا کھائے اور پہنے، آپؐ نے غلاموں کو اتنا بلند مرتبہ دیا تھا کہ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو سیدنا کہتے تھے[3] غیر عربوں کا اعزاز اس حد تک بڑھایا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں فرمایا، اگر ایمان ثریا کے پاس ہوتا تو بھی یہ لوگ اسے حاصل کر لیتے[4] حضرت صہیب رومیؓ، اور حضرت بلالؓ حبشی غلام تھے، لیکن ان کو وہ عزت عطا کی کہ بڑے بڑے قریشی اور انصاری ان کی نیازمندی پر فخر کرتے تھے، حضرت زیدؓ عرب نہیں تھے عجمی نژاد تھے، اور غلام کی حیثیت سے خدمت کرتے تھے، مگر آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کی شادی کر دی، ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کو بڑے بڑے مہاجرین و انصار کے سرداروں کا امیر مقرر کیا، یہی طرز عمل خلفائے راشدین کا رہا، انھوں نے کبھی کسی شخص کو محض خاندانی بنیاد پر کسی فوج کی سرداری یا کسی علاقہ کی حکمرانی کا اہل نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ اس کی ذاتی صلاحیت، خدا ترسی، نیک عملی اور کاردانی کی کیا حالت ہے، لیکن خلفائے راشدینؓ

---

[1] سیرۃ النبی ج ۲ ص ۵۰۰، بحوالہ مسند احمد [2] بخاری کتب الایمان [3] مشکوٰۃ جامع المناقب بحوالہ بخاری
[4] ایضاً بحوالہ ترمذی شمائل، حیات محمد محمد حسین ہیکل، سیرت کی دوسری کتابوں میں بھی یہ حالات مذکور ہیں،

کے بعد جب بنو امیہ کا دور دورہ ہوا تو وہ محاسن اور فضائل کے اعتبار سے اپنے مخالفین کے ہمسر نہیں تھے، اس لئے انھوں نے قبائلی عصبیت کو ہوا دی اور اس عصبیت کے سہارے اپنی خاندانی حکومت کو مستحکم کرتے رہے، ان کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی نسل پرستی پھر ابھر آئی، ان کے زمانہ میں غیر عربوں کے لئے یہی راستہ رہ گیا کہ وہ خفیہ سازشیں کریں، اور کسی ایسی حکومت کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کریں، جس کے ماتحت وہ عزت کی زندگی بسر کرسکیں، چنانچہ اس عہد کی بغاوتوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے اندر ان ہی جذبات کی کارفرمائی نظر آئے گی، بالآخر ان ہی عناصر نے عباسیوں کی سربراہی میں اموی حکومت کا تختہ الٹ دیا،

عباسی کہنے کو عرب تھے، لیکن ان کے دست و بازو درحقیقت عجمی تھے، ابومسلم خراسانی ہو یا برامکہ یہ سب ایرانی انقلاب پسندوں کے ترجمان تھے، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ بات نمایاں ہو گئی کہ اس انقلاب کی تہ میں کیا چیز کارفرما ہے، منصور ہوں یا ہارون یا مامون ہوں یا معتصم سب ایرانیوں کے اقتدار سے گھبرانے لگے، اور ایرانی سپہ سالاروں اور وزیروں کو قتل کرا کر اپنی خاندانی خلافت کو بچانے کی کوشش کرنے لگے،

عرب اقتدار ہٹانے کے لئے عربوں کی بالادستی کا تصور ختم ہونا ضروری تھا، اس لئے ذہنی تبدیلی کے لئے ایک تحریک اٹھی، جو تاریخ میں "شعوبیت" کے نام سے مشہور ہے، یہ لفظ شعب سے ماخوذ ہے، شروع میں ان لوگوں کی طرف سے اس کا یہ مطلب ظاہر کیا جاتا تھا کہ اسلامی تصور کے مطابق عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف یہ احتجاج ہے، لیکن رفتہ رفتہ عربوں کی تحقیر کرنے والے شعوبی کہلانے لگے[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو لسان العرب طبع بیروت ۱۹۵۶ء ج ۱ ص ۵۰۰ اور صحاح طبع مصر ۱۲۸۲ھ ص ۱۶۷،

آگے بڑھ کر یہ تحریک عرب دشمنی کی حد تک ہی نہیں پہنچ گئی، بلکہ خود اسلام بھی معرض بحث میں آگیا، کچھ لوگ تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کے خیالات کفر و الحاد تک پہنچ گئے، بڑے بڑے ادیب و شاعر اس خیال کی وکالت کرنے لگے، ان کے جواب میں عربوں کی طرف سے بھی نثر و نظم میں بہت کچھ لکھا جانے لگا، یہ لوگ سمجھاتے تھے کہ عربوں ہی کی بدولت لوگوں کو یہ عزت و حکومت اور دولت و ثروت حاصل ہوئی، اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی بدولت زوال پذیر عجمی نئی قوت و توانائی حاصل کر سکے، لیکن شعوبی اپنی قدیم تاریخ اور قدیم تہذیب و تمدن اور علوم و فنون پر فخر کرتے تھے، بعض ان لوگوں نے خوارج کو بھی شعوبیہ کی ایک قسم قرار دیا ہے، لیکن درحقیقت ان کا اختلاف سیاسی اور ایک حد تک مذہبی تھا، عرب بیزاری ان میں شعوبیوں کی طرح نہ تھی[1]،

اموی دور میں عرب بیزاری جو سطح کے نیچے دبی ہوئی تھی، وہ عباسی عہد میں ابھر آئی، ایک طرف ایرانی تہذیب کے پھولنے پھلنے کے مواقع پیدا ہو گئے، اور دوسری طرف عربوں کے خلاف لکھنے کی نسبتاً زیادہ جرأت ہو گئی، بالآخر ایرانی عناصر نے ایسی قوت پیدا کر لی کہ معمولی تدابیر ان کو زیر کرنے کیلئے کافی نہ ہو سکیں، اور آگے چل کر عباسی خلفاء نے ان کا زور توڑنے کے لئے ترکوں کا سہارا لیا، لیکن یہ ترک بھی آگے چل کر اپنے اقتدار کے خواہاں ہوئے، چنانچہ آئندہ ان ترکوں کے ہاتھوں عباسی خلفاء کٹھ پتلیوں کے درجہ کو پہونچ گئے، جس کو چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جس کو چاہتے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے،

شعوبی تحریک اگر صرف عربوں کی بالادستی کے خلاف رہتی، اور اسلامی روایات کی مدد سے عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف آواز بلند کرتی تو اس کا اثر مستحکم ہوتا، لیکن

---

[1] گولڈزیہر اور احمد امین ضحی الاسلام ج ۱ ص ۶۰-۶۱،

انتہا پسند اشخاص نے اسلامی عقائد پر بھی ضرب لگانی شروع کی اس کی وجہ سے یہ تحریک نسل پرستی کے خلاف احتجاج کے بجائے الحاد زندقہ کی علامت بن گئی، عجمی سارے کے سارے منافق نہیں تھے، بلکہ ان کی بھاری اکثریت دل سے مسلمان تھی، اور اپنے اسلام پر فخر کرتی تھی، تفسیر و حدیث اور فقہ و سیر کے بڑے بڑے ائمہ سچے مسلمان تھے، امام ابو حنیفہ امام بخاری، امام مسلم، امام داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، حسن بصری، طاؤس اور ان جیسے بے شمار علماء، مصنفین اور اعیانِ اسلام سچے مسلمان تھے، وہ کسی حال میں اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتے تھے، اس لئے اسلام، اکابر اسلام اور روایاتِ اسلام کے خلاف اظہار خیال کرنے والوں کو انھوں نے سخت ناپسند کیا، اور ان کے اس طرز عمل کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا، اس کی بنا پر ایسے لوگوں کا زیادہ اثر نہیں ہونے پایا، بلکہ اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ان کا قلع قمع ہوگیا، ان کی تحریک تاریخ کے اوراق میں دب کر رہ گئی، اور ان کی یاد برائی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں رہ گئی، فراعنہ اور اکاسرہ پر فخر کرنے والے مٹ گئے، عرب انشاپردازوں ہی نے نہیں، بلکہ عجمی اہل قلم نے بھی ان شعوبیوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیئے، اسی طرح عربی زبان کے خلاف اظہار خیال بھی شعوبیوں کی ناکامی کا باعث ہوا، عربی قرآن و حدیث کی زبان تھی کوئی مسلمان اس کی تحقیر گوارا نہیں کر سکتا تھا، اسلئے عربوں ہی نے نہیں بلکہ غیر عرب لغویوں، ادیبوں اور شاعروں نے عربی زبان کے تفوق کا اقرار اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اسی طرح علمائے انساب نے بھی شعوبی نسابوں کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا، اور نبطیوں، قبطیوں، رومیوں، ایرانیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی ان سازشوں کو ناکام بنا دیا، جو وہ عرب دشمنی کے

پردہ میں اسلام کے خلاف کر رہے تھے، جار اللہ زمخشری جیسے ایرانی نژاد کو ان خیالات سے برأت ظاہر کرنی پڑی، اور کتاب المفصل کے دیباچہ میں لکھنا پڑا کہ

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لئے عصبیت پیدا کر دی اور شعوبیت کی طرف میلان سے انھیں محفوظ رکھا[۱] گولڈزیر وغیرہ متعصب مستشرق خواہ کتنے ہی زور سے کہیں کہ عباسی خلفاء کے دربار میں موالی کے مقابلہ میں عربوں کے لئے بار یابی دشوار ہوتی تھی، اور حاتم طائی اور احنف و ایاس کا دربار میں مضحکہ اڑایا جاتا تھا، لیکن صاحبان نظر پر ان بیانات کی کمزوری عیاں ہے، مامون کی اسلامیت شک شبہہ سے بالاتر ہے، اس نے ایرانی تراجم اسلام دشمنی میں نہیں کرائے تھے، بلکہ علمی سرپرستی مقصود تھی، اسی طرح دوسرے مذاہب کے اہل علم کی قدر دانی اس کی رواداری اور علم دوستی کا مظہر ہے، عربوں پر زیادتیوں کے جن واقعات کو ان مستشرقین نے اسکی ایران نوازی قرار دیا ہے، ان کے اسباب سیاسی ہیں، تاج و تخت کے لئے تو بادشاہوں نے باپ، چچا، بھائی کو تہ تیغ کرنے سے دریغ نہیں کیا، اور عزیزوں کو قیدوبند میں مبتلا کیا ہے، ان واقعات کو قومی تحقیر سے کیا تعلق، عرب ہوں یا عجم جس سے اقتدار خطرہ میں ہوا اسے بزن کر دیا گیا،

ان تاریخی واقعات و نتائج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرف نسلی عصبیت اور خاندانی تفوق کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائیگی اسے عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکتی ہے، ممکن ہو کہ کچھ عرصہ تک تلوار کے زور اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس خاندانی سیادت کو قائم رکھا جاسکے، لیکن عوام الناس کے دل کبھی اسے پسند نہیں کر سکتے ہیں اور نہ وہ ایسی

---

[۱] ضحی الاسلام جلد ۲ از احمد امین ص ۷۰، گولڈزیر ص ۱۴۸،

نسلی اور قومی حکومت کے حقیقی وفادار ہو سکتے ہیں، انھیں جب بھی موقع ملے گا، ایسی حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں گے، کیونکہ غیروں کی غلامی کوئی بھی خوشی سے قبول نہیں کرسکتا ہے، عربوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان کا سبب یہی تھا، اور پھر عثمانی ترکوں کے خلاف خود عربوں نے جو بغاوت کی اس کی وجہ بھی یہی تھی، ان کے خلاف عربوں کی نفرت اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ انگریزوں اور دوسری عیسائی قوموں سے ساز باز کرنے میں بھی انھیں تکلف نہیں ہوا، ایک ہاشمی کو ناموس دین مصطفیٰ کے بیچنے میں کوئی باک نہیں ہوا، نہ خاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنانے میں تکلف ہوا، باہر کے لوگ چاہے جو کچھ سمجھتے رہے ہوں، مگر عرب ہر قیمت پر ترکی سیادت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنا چاہتے تھے، اسے نہ جمال پاشا کا تشدد روک سکا، نہ سلطان عبد الحمید کا استبداد، نہ مدحت پاشا کی سیاست اور نہ انور پاشا کی دستور پسندی اور جمہوریت نوازی، نسلی برتری اور قومی تفوق کے تصور پر کسی حکومت کی بنیاد برات عاشقاں بر شاخ آہو کی طرح ناقابلِ اعتبار ہے، اسی طرح اس تفوق کے خلاف جد و جہد کرنے والوں کو بھی اس تحریر سے یہ سبق ملتا ہے کہ بنیادی عقاید و خیالات پر ضرب لگائی جائیگی تو انقلاب کی دعوت پا در ہوا ثابت ہوگی،

اردو ادب کے تنقیدی اصول

میں

تنظیم و انضباط

از جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہجہانپور

(۲)

نقید کے تین حصے | تنقید کم سے کم تین سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے، کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیا ہونا چاہئے؟ پہلے سوال کے جواب میں نقاد شاعر و ادیب کا پیرو ہے، اور اس کے ترجمان کے فرائض ادا کرتا ہے، جواب شاعر و ادیب کا ہوتا ہے اور زبان نقاد کی، دونوں میں اجمال و تفصیل یا متن و شرح کی نسبت ہوتی ہے، اس سوال کے جواب میں نقاد کو شاعر و ادیب سے صرف وہ خیالات منسوب کرنا چاہئیں جو اس کے الفاظ کے قدرتی مفہوم ہوں، وہ خیالات نہیں جو نقاد کے اپنے رجحانات کا پرتو ہوں، اور جن کو شاعر و ادیب سے منسوب کرنے کے لئے شاعر و ادیب کے استعمال کردہ الفاظ سے انحراف کرنا پڑے، اس سوال کے جواب میں نقاد جس قدر اپنی ذات اور خیالات سے الگ اور شاعر و ادیب کی ذات اور خیالات سے وابستہ رہے گا، تنقید کا یہ حصہ اسی قدر مکمل اور صحیح ہوگا، دوسرے اور تیسرے سوال کا جواب نقاد کا اپنا حصہ ہے، اور اس میں وہ شاعر و ادیب کا پیرو نہیں بلکہ اس کا رہنما اور آپ اپنے

خیالات کا ترجمان ہے،

توضیح معیار | مگر اس سلسلہ میں اس کا یہ فرض ہے کہ خوب و ناخوب کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ان ضوابط کی بھی وضاحت کر دے جو اس توضیح کے لئے اس نے بطور معیار اختیار کئے ہیں، نیز اگر وہ ضوابط عام ضابطوں سے کسی وجہ سے مختلف ہیں، تو ان کی وجہ اختلاف اور وجہ ترجیح پیش کر دے، اس ضابطۂ نقد کی جس قدر پابندی کی جائے گی، اسی قدر تنقید کا یہ حصہ مکمل اور صحیح ہوگا، اس حصۂ نقد کی صحت پہلے جواب کی صحت پر بھی منحصر ہے،

موجودہ اردو تنقید کا رجحان | ہماری موجودہ اردو تنقید کا رجحان فن نقد اور زیر نقد شاعر و ادیب سے بہت کچھ بے تعلق ہوتا جا رہا ہے، پہلے سوال کا جواب اس لئے بے تعلق ہوتا ہے کہ بالعموم ہمارے نقاد ان خیالات کو شاعر و ادیب سے منسوب کرتے ہیں جو شاعر و ادیب کے اپنے الفاظ کا قدرتی نتیجہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ خیالات ہوتے ہیں، جن کو نقاد کسی وجہ سے شاعر و ادیب سے منسوب کرنا چاہتے ہیں، دوسرے سوال کا جواب اس لئے بے تعلق ہوتا ہے کہ اولاً وہ جواب فی نفسہٖ شاعر و ادیب کا حصہ نہیں، پھر پہلے سوال کا جواب غلط ہو تو دوسرے کا صحیح ہو ہی نہیں سکتا، اس پر مستزاد یہ کہ اس سوال کا جواب مقتضی ہے کہ اس سے پہلے نقاد کے ذہن میں تنقید کے عام یا اس کے اپنے خاص اصول واضح اور متعین ہوں، اور ہمارے بہت سے نقاد اس تقاضے کو مانتے ہی نہیں، تیسرا سوال اس لئے بے تعلق ہے کہ اس کا جواب بھی فی نفسہٖ شاعر و ادیب کا حصہ نہیں، پھر بالعموم ہمارے نقاد اس کا جواب دیتے ہی نہیں، اس طریقۂ نقد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تنقید کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جس میں ہمارے

نقادوں نے اپنے خیال میں شاعروں اور ادیبوں پر تنقید کی ہے، مگر پڑھنے والوں کے خیال میں وہ نقادوں کے اپنے ذاتی خیالات کی تنقید ہے، ایسے نقاد "حدیث دیگراں" کے پردہ میں اپنا "سرِ دلبری" پیش کرتے ہیں، جو پختہ کار اس منزل کے ادب شناس اور اصطلاحات کے سنگ و میل سے واقف ہیں، ان کو بے راہ رووں کے اس گروہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے،

شعری کیفیات و خصوصیات کی اصطلاح سازی

اردو تنقید میں ایک اور بہت بڑی کمی ہے، مگر وہ ہمارے نقادوں کی نہیں بلکہ ہماری تنقید کی ہے، وہ کمی یہ ہے کہ شعری کوائف و خصوصیات میں جو عام اور مشترک کوائف و خصوصیات ہیں، وہ اب تک باقاعدہ متعین نہیں کی گئی ہیں، اور جو متعین کی گئی ہیں وہ بہت کم ہیں، نیز ان میں سے اکثر پر ابھی اس حد تک اتفاق نہیں کیا گیا ہے، کہ ان کے لئے فنی اصطلاحات اور ان کی صحیح تعریف کے حاصل ہو سکے، مثلاً جوش، سادگی، رنگینی، اثر، سوز و گداز، درد، تڑپ، روانی، انسجام، بندشِ الفاظ، ترکیبِ الفاظ، ترتیبِ الفاظ، شوخی، فصاحت، بلاغت، سنجیدگی، متانت، زور، شوکتِ الفاظ، ندرت، جدت، ندرتِ معنی، جدتِ معنی، ندرت و جدتِ ادا، رنگینیِ خیال، رنگینیِ ادا، رنگینیِ الفاظ، شیرینیِ الفاظ، اندازِ بیان، لہجہ، انفرادیت، داخلیت، خارجیت، حسنِ ترکیب، صفائیِ کلام، متانتِ ترکیب، نازک خیالی، خیال بندی، نشستِ الفاظ، کلام کا بانکپن، شوخیِ مضمون، شوخیِ بیان، رنگین خیالی، رنگین بیانی، شستگی، گرمیِ کلام، برجستگی، بلندیِ مضامین وغیرہ، ان میں سے بعض الفاظ باہم مرادف ہیں، اور بعض مختلف المعانی، اس طرح کے بیسیوں الفاظ ہمارے نقاد کی زبانِ قلم پر ہیں، مگر ان کے محلِ استعمال کے لئے

وہ کسی ضابطہ کے پابند نہیں جس میں ایسی یکسانی ہو کہ جو لفظ ایک کے یہاں جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اسی مفہوم میں دوسرے کے ہاں استعمال ہو یا جس خصوصیت و کیفیت کے لئے ایک لفظ ایک نقاد استعمال کرتا ہو، اسی خصوصیت و کیفیت کے لئے دوسرا نقاد استعمال کرتا ہو، بلکہ ہر نقاد ان الفاظ کو اپنے مزعومہ مطالب میں استعمال کرتا ہے، جو اس نے اپنی ذاتی کثرت مطالعہ سے ان الفاظ سے وابستہ کر لئے ہیں، گویا ان لفظوں کا استعمال اور خصوصیات شعری کی تعبیر ایک سماعی عمل ہے، اور ہر شخص کا سماع اس بارہ میں ذاتی اور دوسرے سے جداگانہ ہے، جو کہیں اتفاق سے دوسروں کے استعمال سے مطابق ہو جاتا ہے اور کہیں مختلف، کہیں ایک ہی لفظ کئی مختلف کیفیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور کہیں ایک ہی کیفیت کے لئے کئی مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ایک نقاد ایک کیفیت کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، دوسرا اس کیفیت کے لئے کوئی اور لفظ استعمال کرتا ہے، اس فرق استعمال کی بناء پر اسکا بہت امکان رہتا ہے کہ دو نقاد اپنے مختلف لفظوں سے ایک ہی کیفیت شعری کی توضیح کر رہے ہوں، مگر پڑھنے والا انھیں اختلاف الفاظ کی وجہ سے مختلف کیفیتیں سمجھے یا وہ دو مختلف کیفیتیں بیان کرنا چاہتے ہوں، مگر پڑھنے والا انھیں ایک سمجھے،

اس کمی کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف شاعروں کے یہاں اس قسم کی خصوصیات کی کمی و بیشی کا فرق واضح نہیں ہو پاتا، جو ان کے امتیاز کے لئے ضروری ہے، بلکہ ہر شاعر کی خصوصیات ایک سی معلوم ہوتی ہیں، مثلاً سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں مختلف شاعروں کی تنقید اُن کے ناموں سے الگ کرکے پڑھئے، تو سب ایک ہی شاعر کے متعلق معلوم ہونگی، ایک سکسینہ کیا سب ہی کے ہاں کم و بیش یہی صورت ملے گی،

یہ صحیح ہے، اس خلط بحث کا سبب ان نقادوں کی وہ غلطی بھی ہے، جو ان سے شعراء کی خصوصیات کے مطالعہ اور سمجھنے میں سرزد ہوتی ہے، مگر اس کا ایک بڑا سبب ہماری تنقید کی یہ کمی بھی ہے،

۲۔ لفاظی اور ابہام | اس سے بھی زیادہ بڑی دشواری بلکہ عیب اردو تنقید میں یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کسی ایک کیفیت شعری کی شرح و توضیح اور ابہام و تفہیم کے لئے نقاد بلا وجہ جملہ کے جملہ استعمال کرتے ہیں جو خود بے معنی ہوتے ہیں، یا کم سے کم اس کیفیت سے بے تعلق ہوتے ہیں، نیز کو اعنیت شعری کو زندگی اور کائنات کے دوسرے شعبوں اور مثال دیگر ان تشبیہ و استعارہ کرکے اپنا ما فی الضمیر ان کیفیتوں کی نسبت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ تمثیل و تشریح وغیرہ خود محتاجِ تشریح ہوتی ہے اور اس لئے کیفیت شعری بدستور تشنۂ تشریح رہ جاتی ہے، تنقید کے اس اسلوب کا خاکہ محمد حسین آزاد نے تیار کیا تھا، مگر ان کا ایسا کرنا بجا تھا، کیونکہ پہلے کہ وہ ابتدائی نقش تھا، اور پھر اس لئے کہ دنیا بھر کی باتیں کر گئے، وہ کتاب کو دلچسپ بنانا چاہتے تھے، پھر وہ مجبور تھے کہ ان کا عام طرز تحریر یہی تھا، جس کے بغیر وہ دو قدم نہیں چل سکتے تھے، مثلاً

"بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منھ میں آتی تھیں، انھیں گھلایا (ص ۱۲۰)

مرزا (سودا) کی زبان نظم میں کبھی دودھ ہے، کبھی شربت مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے، فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں (ص ۱۰۷)

بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس درو بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں، گویا ولایتی طمنچہ کی چابیں چڑھی ہوتی ہیں (ص ۱۰۸)

ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہیں (ص ۱۶۳)

میر درد گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے (ص ۱۸۵) ان کی انشا پردازی کا حسن و تکلف اور صنائع معنوی سے بالکل پاک ہے، اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سرسبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے (ص ۱۹۵)

ان کے اشعار غزل کے اصولوں میں گلاب کے پھول ہیں (ص ۲۰۴)

پنڈت دیا شنکر نسیم نے ہر مضمون کو تشبیہ اور استعارہ میں ادا کیا، اور وہ ادا معشوقانہ خوش ادائی نظر آئی، اس کے پیچ وہی بانکپن کی مروڑ ہیں جو پریزادیں بانکا دوپٹہ اوڑھ کر دکھاتی ہیں (ص ۲۰۶)

کلام کا بندوبست ارگن باجہ کی کساوٹ رکھتا ہے (ص ۲۷۲) شعر کی ترتیب اور کلام کی تاثیر (ص ۳۰۷) (گویا ترتیب اور تاثیر شعر کی دو مختلف خصوصیتیں ہیں)

قدرتِ کلام ان کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شکستہ کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا ہے (ص ۴۰۴) (آب حیات سے مقتبس)

تمثیل و تشبیہ ایک اضافی کی حیثیت سے استعمال کی جا سکتی ہے، وہ بھی کہیں کہیں، اور بہت اعتدال کے ساتھ، مگر اس کے ساتھ تمثیل و تشبیہ بھی وہ ہونی چاہئے جو شعری کیفیت کے حسب حال ہو، یعنی اس میں اور شعری کیفیت میں کوئی وجہ شبہہ ہو، اور جس حاسہ (ظاہری یا باطنی) سے شعری کیفیت محسوس ہوتی ہو، اسی سے

مشبہ بہ محسوس ہو، یہاں آزاد کے اقتباسات کی طرف اشارہ پر اس لئے اکتفا کیا گیا ہے کہ اولاً اس عہد میں وہ معذور تھے، دوسرے موجودہ عہد کے کسی ایک یا چند نقادوں کے یہاں اس کمی کی نشاندہی کرنا جو ہمارے نقادوں کی نہیں بلکہ ہماری تنقید کی ہے، ایک غیر ضروری فعل ہے ورنہ اس کی مثالیں آج بھی کثرت سے ملیں گی، اس اسلوب نے اردو تنقید میں لفاظی اور ابہام پیدا کر دیا ہے، جس کا ہم تجزیہ و تحلیل کریں تو صرف چند خوشنما لفظ ملیں گے، جن کا تعلق نہ شعر کی خصوصیات سے ہوگا نہ فن سے'

اس کی تلافی کا کام اہم ہے اور یہ مستقل تصانیف چاہتا ہے، ضرورت ہے کہ اہل علم اس پر قلم اٹھائیں، اس کی انجام دہی کے لئے انھیں مندرجۂ ذیل امور مد نظر رکھنے چاہئیں

(۱) عربی و فارسی کے علم معانی و بیان، بدیع، لغت، صرف و نحو اور شاعری کے دوسرے علوم اس کام میں بہت مد ہیں،

(۲) عربی و فارسی کے مستند نقادوں کی تنقیدی تحریروں میں دیکھیں کہ وہ کوائف شعری کے اظہار و ادا کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں،

(۳) ان علوم کے ہندی مرادفات بھی نظر میں رکھیں،

(۴) یوروپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں Diction Appreciations اور Technique وغیرہ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے، اسے کسی طرح نظرانداز نہ کریں،

(۵) ان سب کے مجموعی مطالعہ کی روشنی میں قیاس کو اعتدال کے ساتھ استعمال کریں، اور اردو کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے ان مآخذ میں جہاں جہاں ضرورت سمجھیں مناسب ترمیم و تنسیخ اور تہذیب و تجدید سے کام لیں اور رخذ ما

صنائع و بدائع کو ماخذ بنا کر اپنا دستور العمل قرار دیں، عربی کے معانی و بیان اور بدیع کی ترمیم و تجدید اس کام کے لئے خاص طور پر ضروری ہے،

عروض ہماری تنقید شعر کی ایک اور ضروری خصوصیت سے پہلو تہی کرتی ہے، اور وہ شعر کا نغمہ ہے، اس خصوصیت کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے، جسے عروض کہتے ہیں، ہمارے اکثر نقاد اپنی تنقیدوں میں عروض کی بھول بھلیاں کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کی سیر کی جائے، اور اس سے بالا بالا ہی گذر جاتے ہیں، مگر فن کی پیچیدگی اس کے قابل ترک ہونے کی دلیل نہیں، عروض عملاً شعر کی اساس اولین ہے، جو نقاد شعر کی تنقید کے سلسلہ میں عروض سے تعرض نہیں کرتے، حق یہ ہے کہ وہ شعر کی تنقید کا حق صحیح معنوں میں ادا نہیں کرتے،　　　"باقی"

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف و ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اسکی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مستشرقین کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دارالمصنفین کے نقاد و محققین نے انکے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:- ۱۹۳۰، ۳۵، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۱، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۶۹، ۱۹۷۳، ان کو خرید کر اپنے کتبخانہ کی رونق بڑھائیں،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تاریخ محمدی ۔ تصحیح و تحشیہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی تقطیع کلاں کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۴۲۲ مجلد۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

گیارہویں صدی ہجری میں مرزا محمد بن رستم کی شخصیت باکمال سمجھی جاتی تھی، ان کے والد بھی نامور فاضل اور چچا دیوانگن عہد عالمگیری کے امرا میں تھے، ان کی تصنیفات میں "تاریخ محمدی" اہم اور مفید کتاب ہے، اس میں سلاطین امرا اور دوسرے طبقہ کے مشاہیر و اعیان کے سنین وفات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ دو جلدوں میں ہے زیر نظر کتاب دوسری جلد کا چھٹا حصہ ہے، اس میں ۱۱۰۱ھ سے ۱۱۶۱ھ تک کے امراء اور اصحاب کمال کے وفیات اور بعض کے مختصر حالات و کمالات درج ہیں، تاریخ محمدی ابھی تک غیر مطبوعہ تھی، اس لئے ملک کے مشہور اہل علم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے رضا لائبریری رامپور کے مخطوطہ کو لندن کے ایک اور نسخہ سے مقابلہ کرکے محققانہ حواشی اور اشاریات کے ساتھ شائع کیا ہے، متن میں ہر ترجمہ کے بعد ان حوالوں اور کتابوں کا نام بھی دیا گیا ہے جن سے مصنف نے مدد لی تھی، لائق محشی نے حاشیے میں تحقیق و محنت سے بعض اشخاص کے مزید حالات اور متعدد دوسرے ماخذوں کی نشاندہی کی ہے، تذکرہ، تراجم اور ہندوستان کی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی، اس کی پہلی جلد میں جو زیر طبع ہے، مصنف کے حالات و سوانح تحریر کیے گئے ہیں۔

مجاہد کی اذان ۔ مترجمہ۔ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب اصلاحی تقطیع خورد،

کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۴، قیمت عہ، پتہ مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی

یہ مصر کی مشہور اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البنا شہیدؒ کے بعض رسالوں کا اردو ترجمہ ہے، اس میں تحریک کے اصول و مقاصد اور طریقۂ دعوت و تبلیغ کے علاوہ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے متعلق ضروری معلومات فراہم کئے گیے ہیں اور ان مشکلوں اور آزمائشوں کا بھی ذکر ہے، جو اس کاروان حق کو جہاد و اشاعت دین کی راہ میں پیش آتی ہیں، شیخ نے اخوان کو ایک ایسی خدائی و آفاقی تحریک بنایا ہے، جس کو رنگ و نسل قوم و وطن اور علاقائیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ضمن میں فقہی و فروعی مسائل کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نیز عالم عرب، مسلم اور غیر مسلم ممالک کے بارے میں اخوان کے رویے اور طرز عمل کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے ان پر بغاوت اور غداری کے ان الزامات کی مکمل تردید ہو جاتی ہے جن کے نتیجہ میں اخوان کو قید، جلاوطنی اور پھانسی کی سزائیں دی گئی تھیں، اس کتاب سے اخوان کے اصلاحی و مجاہدانہ کارناموں کے علاوہ ایک دینی تحریک کے خط و خال اور اسلام کے دعوتی و تبلیغی مشن کا خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبید اللہ رحمانی اور خود مترجم نے شیخ کے دعوتی کارنامے اور اسلام کی سربلندی کے لئے اخوان کی جد و جہد کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مجموعی حیثیت سے بہتر ہے، لیکن کہیں کہیں عربی اسلوب کی طرح اردو میں بھی ضرورت سے زیادہ مترادف الفاظ اور جملوں کی کثرت ہے۔

سلک گلک۔ مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر شرف عالم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰، قیمت لکھی نہیں، پتہ۔ ڈاکٹر شرف عالم لکچرر شعبہ فارسی، بی۔ ان کالج پٹنہ

پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کا اصلی مشغلہ درس و تدریس تھا،

زیادہ وقت اس میں اور اس سے متعلق کاموں میں گذرا ہے لیکن ان کو تحریر و تصنیف
اعمرہ ذوق ہے، اس لیے وہ وقتاً فوقتاً ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں، فارسی
ن او ادب انکا خاص موضوع ہے، اس سے متعلق ہند و ایران کے رسالوں میں شائع ہونے
لے مندرجہ ذیل آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد شرف عالم لکچرر فارسی
بٹنہ کالج پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ (۱) کچھ مطہر کے بارے میں (۲) حافظ کا معشوق (۳)
سی کی ایک قدیم فرہنگ (۴) ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع (۵)
ہ ان جدید کا ایک عوامی شاعر (۶) جگر کا فارسی کلام (۷) قدیم ترین مقدمہ فارسی بر سفر
صر خسرو (۸) کتابخانہ خدا بخش

آخر الذکر دونوں مضامین فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے میں سفرنامۂ ناصر خسرو کے
س اڈیشن کا ذکر ہے جو ۱۸۸۲ء میں مولانا حالی کے مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع ہوا تھا،
میکن دانشوران ایران کو اسکی خبر نہیں تھی، پروفیسر سید حسن نے ان کی واقفیت کے لیے حالی کے
مختصر حالات اور ان کے مقدمہ کی اہمیت و خصوصیت تحریر کی ہے، دوسرے میں خدا بخش خاں
لائبریری کا تعارف اور اس کے بعض نوادر کا ذکر ہے۔ پہلا مضمون زیادہ اہم اور محققانہ ہے
اس میں فاضل مقالہ نگار نے محنت و دیدہ ریزی سے اپنے بعض پیشرو محققین کے برخلاف مطہر
کو ایرانی الاصل ثابت کیا ہے، تیسرا مضمون بھی تحقیقی حیثیت سے اہم ہے اس میں ایک قدیم
فرہنگ زفان گویا کا مبسوط تعارف ہے جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، دوسرے
چوتھے اور پانچویں مضمون سے قدیم اور جدید فارسی شعر و ادب سے مقالہ نگار کی گہری واقفیت
اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب مضامین ادبی و تنقیدی حیثیت سے بہت ہی مفید اور پراز
معلومات ہیں۔ شروع میں ان کے خود نوشت دلچسپ حالات درج ہیں، ان میں ان کے خاندان

کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۴۴ قیمت

یہ مصر کی مشہور اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البنا کے بعض رسا کا اردو ترجمہ ہے، اس میں تحریک کے اصول و مقاصد اور طریقۂ دعوت و تبلیغ کے علاوہ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے متعلق ضروری معلومات فراہم کئے گیے ہیں اور ان مشکلوں اور آزمائشوں کا بھی ذکر ہے، جو اس کاروان حق کو جہاد و اشاعت دین کی راہ میں پیش آتی ہیں، شیخ نے اخوان کو ایک ایسی خدائی و آفاقی تحریک بنایا ہے، جس کو رنگ و نسل قوم و وطن اور علاقائیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ضمن میں فقہی و فروعی مسائل کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نیز عالم عرب، مسلم اور غیر مسلم ممالک کے بارے میں اخوان کے رویے اور طرز عمل کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے ان پر بغاوت اور غداری کے ان الزامات کی مکمل تردید ہو جاتی ہے جن کے نتیجہ میں اخوان کو قید، جلاوطنی اور پھانسی کی سزائیں دی گئی تھیں، اس کتاب سے اخوان کے اصلاحی و مجاہدانہ کارناموں کے علاوہ ایک دینی تحریک کے خط و خال اور اسلام کے دعوتی و تبلیغی مشن کا خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبید اللہ رحمانی اور خود مترجم نے شیخ کے دعوتی کارنامے اور اسلام کی سربلندی کے لئے اخوان کی جد و جہد کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مجموعی حیثیت سے بہتر ہے، لیکن کہیں کہیں عربی اسلوب کی طرح اردو میں بھی ضرورت سے زیادہ مترادف الفاظ اور جملوں کی کثرت ہے۔

سلک گلک ۔ مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر شرف عالم صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۴ قیمت لکھ پتہ۔ ڈاکٹر شرف عالم لکچرر شعبہ فارسی، بی۔ ان کالج پٹنہ

پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کا اصلی مشغلہ درس و تدریس تھا،

ب انکا خاص موضوع ہے۔ اس سے متعلق ہند و ایران کے رسالوں میں شائع ہونے
جو ذیل آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد شرف عالم لکچرر فارسی
لج پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ (۱) کچھ مظہر کے بارے میں (۲) حافظ کا معشوق (۳)
یک قدیم فرہنگ (۴) ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع (۵)
ید کا ایک عوامی شاعر (۶) جگر کا فارسی کلام (۷) قدیم ترین مقدمہ فارسی بر سفر
(۸) کتابخانہ خدا بخش

خر الذکر دونوں مضامین فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے میں سفرنامۂ ناصر خسرو کے
یشن کا ذکر ہے جو ۱۸۸۲ء میں مولانا حالی کے مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع ہوا تھا
انشوران ایران کو اسکی خبر نہیں تھی، پروفیسر سید حسن نے ان کی واقفیت کے لیے حالی کے
حالات اور ان کے مقدمہ کی اہمیت و خصوصیت تحریر کی ہے، دوسرے میں خدا بخش
ی کا تعارف اور اس کے بعض نوادر کا ذکر ہے۔ پہلا مضمون زیادہ اہم اور محققا
میں فاضل مقالہ نگار نے محنت و دیدہ ریزی سے اپنے بعض پیشرو محققین کے برخلاف
یرانی الاصل ثابت کیا ہے، تیسرا مضمون بھی تحقیقی حیثیت سے اہم ہے اس میں ایک
ہنگ زفان گویا کا مبسوط تعارف ہے جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، دو
تھے اور پانچویں مضمون سے قدیم اور جدید فارسی شعر و ادب سے مقالہ نگار کی گہری و
دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب مضامین ادبی و تنقیدی حیثیت سے بہت ہی مفید او
معلومات ہیں۔ شروع میں ان کے خودنوشت دلچسپ حالات درج ہیں، ان میں ا

کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۰۴ قیمت عـہ پتہ مکتبہ الحسنات رام پور۔ یو پی

یہ مصر کی مشہور اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البناؒ کے بعض رسالوں کا اردو ترجمہ ہے، اس میں تحریک کے اصول و مقاصد اور طریقۂ دعوت و تبلیغ کے علاوہ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے متعلق ضروری معلومات فراہم کئے گیے ہیں اور ان مشکلوں اور آزمائشوں کا بھی ذکر ہے، جو اس کاروان حق کو جہاد و اشاعت دین کی راہ میں پیش آتی ہیں، شیخ نے اخوان کو ایک ایسی خدائی و آفاقی تحریک بنایا ہے، جس کو رنگ و نسل قوم و وطن اور علاقائیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ضمن میں فقہی و فروعی مسائل کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نیز عالم عرب، مسلم اور غیر مسلم ممالک کے بارے میں اخوان کے رویے اور طرز عمل کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے ان پر بغاوت اور غداری کے ان الزامات کی مکمل تردید ہو جاتی ہے جن کے نتیجہ میں اخوان کو قید، جلا وطنی اور پھانسی کی سزائیں دی گئی تھیں، اس کتاب سے اخوان کے اصلاحی و مجاہدانہ کارناموں کے علاوہ ایک دینی تحریک کے خط و خال اور اسلام کے دعوتی و تبلیغی مشن کا خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبید اللہ رحمانی اور خود مترجم نے شیخ کے دعوتی کارنامے اور اسلام کی سربلندی کے لئے اخوان کی جد و جہد کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مجموعی حیثیت سے بہتر ہے، لیکن کہیں کہیں عربی اسلوب کی طرح اردو میں بھی ضرورت سے زیادہ مترادف الفاظ اور جملوں کی کثرت ہے۔

سلک گلک۔ مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر شرف عالم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۴ قیمت لکھر پتہ۔ ڈاکٹر شرف عالم لکچرر شعبہ فارسی، بی۔ ان کالج پٹنہ

پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کا اصلی مشغلہ درس و تدریس تھا،

کا زیادہ وقت اس میں اور اس سے متعلق کاموں میں گزرا ہے لیکن ان کو تحریر و تصنیف کا بھی عمدہ ذوق ہے، اس لیے وہ وقتاً فوقتاً ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں، فارسی زبان و ادب انکا خاص موضوع ہے، اس سے متعلق ہند و ایران کے رسالوں میں شائع ہونے والے مندرجہ ذیل آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد شرف عالم لکچرار فارسی پٹنہ کالج پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ (۱) کچھ مظہر کے بارے میں (۲) حافظ کا معشوق (۳) فارسی کی ایک قدیم فرہنگ (۴) ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع (۵) ایران جدید کا ایک عوامی شاعر (۶) جگر کا فارسی کلام (۷) قدیم ترین مقدمہ فارسی سفر ناصر خسرو (۸) کتابخانہ خدا بخش

آخر الذکر دونوں مضامین فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے میں سفرنامۂ ناصر خسرو کے اس اڈیشن کا ذکر ہے جو ۱۸۸۲ء میں مولانا حالی کے مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع ہوا تھا، لیکن دانشوران ایران کو اسکی خبر نہیں تھی، پروفیسر سید حسن نے ان کی واقفیت کے لیے حالی کے مختصر حالات اور ان کے مقدمہ کی اہمیت و خصوصیت تحریر کی ہے، دوسرے میں خدا بخش خان لائبریری کا تعارف اور اس کے بعض نوادر کا ذکر ہے۔ پہلا مضمون زیادہ اہم اور محققانہ ہے اس میں فاضل مقالہ نگار نے محنت و دیدہ ریزی سے اپنے بعض پیشرو محققین کے برخلاف مظہر کو ایرانی الاصل ثابت کیا ہے، تیسرا مضمون بھی تحقیقی حیثیت سے اہم ہے اس میں ایک قدیم فرہنگ زفان گویا کا مبسوط تعارف ہے جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، دوسرے چوتھے اور پانچویں مضمون سے قدیم اور جدید فارسی شعر و ادب سے مقالہ نگار کی گہری واقفیت اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب مضامین ادبی و تنقیدی حیثیت سے بہت ہی مفید اور پراز معلومات ہیں۔ شروع میں ان کے خودنوشت دلچسپ حالات درج ہیں، ان میں انکے خاندان

وعلمی، تعلیمی، ریاضت، درسی مشغولیتوں، سفر ایران، علم و مطالعہ میں انہماک، ادبی و تحریری سرگرمیوں، گذشتہ نصف صدی کے بعض اہم واقعات اور اساتذہ و طلبہ اور معاصرین و احباب کے علاوہ بہار کی کئی مشہور و ممتاز شخصیتوں کا ذکر ہے، جو اس بے ساختگی و بے تکلفی سے لکھے ہیں کہ ان میں خودستائی کا کوئی رنگ نہیں آنے پایا ہے، امید کہ یہ خود اشت ادب ادبی حلقہ میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

فلسفی غالب ۔ مرتبہ ۔ جناب احمد رضا صاحب رنائز، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۲، مجلد قیمت ۳ئے، پتہ مصنف شیش محل لکھنؤ

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، یہ نئی کتاب بھی نو ابواب پر مشتمل ہے، اس میں غالب کے اشعار کی تشریح کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک بڑے فلسفی، مفکر اور مصلح تھے اور ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار اسی مقصد سے کہے گئے ہیں، جابجا مصنف نے غالب کے کلام میں تضاد کی نفی اور مولانا حالی مرحوم اور دوسرے شارحین غالب کے بیان کردہ مفہوم کو غلط قرار دیا ہے، حالانکہ کہیں کہیں تو ان کے اور شارحین کے مفہوم میں صرف تعبیر کا فرق ہے اور کہیں کہیں انکا مفہوم عجلت پسندی اور غور و فکر کی کمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، جابجا اس قسم کا نامناسب اور مدعیانہ انداز بھی کھٹکتا ہے کہ "ابتک کسی کو بھی غالب کی شخصیت کی عظمت کا قرار واقعی اندازہ نہیں ہوا، اور نہ کسی سے ان کے سخن سمجھنے کی صلاحیت کا اظہار ہوا ہے۔" ص ۴۴ پر اکبر الہ آبادی اور ص ۴۴ و ۱۶۵ پر اقبال کے اشعار پر اعتراضات سے انکی "سخن فہمی" کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔

" ض "

فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر صحابہ، و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی
کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دین رحمت

بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو
مذہب لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر
فضل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ... از شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیز کا دور خلفائے راشدین کی طرح رحمت
و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت
سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ
اُن کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے جس میں اُن کے حالات زندگی
کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آ گئے ہیں، قیمت:- ۶ روپیہ ۲۵

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی
ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے
ساتھ بیان کیا گیا ہے. قیمت:- ۱۶ روپے پچیس پیسے،

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"